خدا بخش لائبریری جرنل

۱

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

۱۹۷۷ء

مجلس ادارت

پہلا شمارہ: ۱۹۷۷ء

اس سہ ماہی مجلّے میں انگریزی، اُردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے، جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلّق رکھتے ہوں۔

قیمت: پندرہ رُپے

محبوب حسین نے اُردو حصّہ لیبل لیتھو پریس رمنہ روڈ، پٹنہ ۴، اور انگریزی حصہ تارا پریس ترپولیہ، پٹنہ میں چھپوا کر خدابخش لائبریری سے شائع کیا

فہرست

۵۵

ہمارے مقالہ نگار

○ مرحوم صلاح الدین خدا بخش ایم۔اے؛ بی۔سی۔ایل (آکسن) بار۔ایٹ۔لا، (م ۱۹۳۱ء)

— بانی کتبخانہ کے بیٹے۔ انگریزی میں اسلامی تہذیب و تاریخ پر متعدد کتابوں کے مؤلف و مترجم، مثلاً: ثقافت اسلامیہ کی تاریخ؛ تاریخ مسلمانان عالم؛ اقوال و انعکاسات؛ اسلام میں سیاست؛ خلفا کے ماتحت ممالک مشرقیہ؛ اسلام کی نشأۃ ثانیہ؛ نذر محبت؛ ازمنہ وسطیٰ میں مسلمانوں کا نظام تعلیم؛ مضامین دربارۂ اسلام و ہندستان۔

○ جناب قاضی عبدالودود بی۔اے (کینٹب)، بار۔ایٹ۔لا، پٹنہ ۴ (پ ۱۸۹۶ء)

— فارسی و اردو ادبیات کے معروف محقق، صدر جمہوریہ کے 'سرٹیفکیٹ آف میرٹ' کے اعزاز یافتہ۔ تالیفات: مآثر غالب؛ عیارستان؛ اشتر و سوزن؛ قطعات دلدار؛ مثنوی کلیان سنگھ؛ دیوان رضا عظیم آبادی؛ دیوان جوشش عظیم آبادی؛ کلام شاد؛ قاطع برہان و رسائل متعلقہ؛ تذکرہ ابن طوفان؛ شہر آشوب قلق؛ تذکرہ مسرت افزا۔ اور آٹھ جلدوں میں (زیر طبع) مقالات قاضی عبدالودود، مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد۔ علاوہ ازیں: رسالہ معیار ۱۹۳۶ء۔ اور رسالہ تحقیق ۱۹۶۱ء

○ ڈاکٹر سید حسن عسکری ایم۔اے؛ بی۔ایل؛ پٹنہ۔۶ (پ ۱۹۰۱ء)

— تاریخ ہند، ازمنہ وسطیٰ کے معروف مورخ؛ مگدھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری اور غالب ایوارڈ برائے تحقیق کے اعزاز یافتہ۔ عہد سلطنت کی سیاسی و سماجی تاریخ اور صوفیائے بہار پر تقریباً ڈیڑھ سو مقالات کے مصنف۔

○ ڈاکٹر نذیر احمد ایم۔اے، ڈی لٹ؛ پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (پ ۱۹۱۶ء)۔

— چند تالیفات:۔ ظہوری: احوال و آثار؛ دیوان سراجی؛ مکاتیب سنائی؛ دیوان حافظ؛ فرہنگ قواس؛ کتاب نورس، مصنفہ ابراہیم عادل شاہ تاریخی و ادبی مطالعہ؛ فرہنگ دستور الافاضل۔

○ عابد رضا بیدار ایم۔اے؛ پی۔ایچ۔ڈی (علیگ)، ڈائرکٹر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ (پ ۱۹۳۴ء)

— چند تالیفات:۔ نئے اور پرانے چراغ (تنقید)، اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار؛ عظیم اور لازوال؛ علی گڑھ کا مسئلہ؛ ہندوستانی مسلمان قیادت کی تلاش میں؛ سیما کی تلاش؛ ہندوستان کی عربی اسلامی درسگاہیں؛ ابوالکلام آزاد؛ ڈاکٹر ذاکر حسین؛ ہندوستانی مسلمانوں کی ریفارم کے مسائل؛ قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان؛ غالبیات نو (دو حصے)؛ علوم اسلامیہ کی ایک اردو انسائکلوپیڈیا: معارف اور برہان کا اشاریہ؛ دیوان تسکین دہلوی؛ انتخاب قائم چاندپوری۔

○ جناب افسر الدولہ فیاض الدین حیدر، ایم۔اے؛ ڈپ۔لٹ (تہران)، ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ (پ ۱۹۲۴ء)

— ریسرچ کا موضوع: صفویوں کی تشکیل اداری۔ علاوہ ازیں متعدد مقالات۔

○ ڈاکٹر عبدالرشید، ایم۔اے؛ پی۔ایچ۔ڈی؛ فاضل دیوبند و لکھنؤ، استاد شعبۂ عربی، پٹنہ کالج پٹنہ (پ ۱۹۳۷ء)

— 'طبقات الشافعیہ' پر ڈاکٹریٹ کے لئے کام کرنے کے بعد اب طبقات الحنفیہ کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔

●●

تعارف

خدابخش لائبریری بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ خدابخش لائبریری کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ "خدابخش لائبریری جرنل" کے نام سے نکالا جائے، اور اس کی یہ خصوصیت ہو کہ اس کے مندرجات کا کسی نہ کسی طرح کا تعلق کتبخانہ مذکور سے ضرور ہو۔ اس تعلق کی نوعیت کیا ہوگی، دو تین شماروں کے دیکھنے سے ناظرین پر واضح ہو جائے گی۔ اس میں اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے مضامین ہوں گے اور ایسے مضامین یا مختصر رسالے بھی اس میں شامل ہوں گے، جو پہلے کہیں اور شائع ہو چکے ہیں۔

انگریزی کا پہلا مضمون صلاح الدین خدابخش کا بانی کتبخانہ سے متعلق ہے، یہ ان کے ایک مجموعۂ مضامین میں جو مدت ہوئی شائع ہوا تھا، شامل ہے۔ مقالہ نگار نے اپنے دادا اور بانیٔ کتبخانہ کے والد محمد بخش کی بیاض کی نسبت تحریر کیا ہے کہ کتبخانے میں ہے ص ۳۵۰۶ اور ان کا ارادہ ہے کہ اسے جلد شائع کریں۔ یہ نہ کبھی شائع ہوئی اور نہ کتبخانے میں ہے۔ خدابخش خاں نے بھی محبوب الالباب میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ مقالہ نگار کا بیان ہے کہ خدابخش نے اپنی عمر کے آخری زمانے میں شعرگوئی کی طرف توجہ کی اور انہوں نے اپنے اشعار کے ۳ ضخیم (stout) مجموعے چھوڑے ہیں، یہ تو مجھے یاد آتا ہے کہ کسی پرانے اخبار میں میں نے ایک مشاعرے کی روداد دیکھی تھی، اس میں خدابخش خاں نے اپنے اشعار پڑھے تھے، اور ان کا تخلص 'جمیل' تھا۔ مگر کتبخانے میں ۳ ضخیم جلدیں درکنار، ان کی کوئی مختصر بیاض اشعار بھی موجود نہیں۔

ڈاکٹر سید حسن عسکری نے ۱۹۷۶ء میں ۳ خدابخش لکچر (انگریزی میں) دیے تھے، پہلا اس شمارے میں شامل ہے، دو بعد کو شائع ہوں گے۔

پروفیسر نذیر احمد نے ۱۹۷۷ء میں خدابخش لکچر اُردو میں دیے تھے، ان کے تینوں لکچر اس شمارے میں شامل ہیں۔ غزالی مشہدی کی مثنوی اس بنا پر شائع ہو رہی ہے کہ یہ کلیات غزالی کے معلوم نسخوں میں نہیں اور کتبخانے کے ایک مجموعے میں ہے۔

فالنامۂ حافظ شیراز ایک مختصر سا رسالہ عنایت خان راسخ کی تالیفات سے ہے۔ بعض اصحاب یہ سمجھے

Essays: Indian & Islamic-1

ہیں کہ راسخ تخلص ہے، مگر یہ تخلص نہیں، خانِ راسخ مولف کا خطاب ہے۔ ان کے والد لطف اللہ خانِ صادق کے متعلق بھی بعض اصحاب کو یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ ان کا تخلص صادق ہے۔ حالانکہ خانِ راسخ کی طرح خانِ صادق بھی خطاب ہے۔

مرزا جان طپش دہلوی غالباً تیسرے ریختہ گو شاعر ہیں جنہوں نے اپنی کلیات کا دیباچہ خود لکھا ہے، گارساں دتاسی نے اپنی تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی کے مقدمے میں جو اپنے ماخذ کی فہرست دی ہے، اس میں یہ دیباچہ بھی ہے۔ یہ کلیات کمیاب ہے، اس لئے یہ دیباچہ شائع کیا جا رہا ہے۔

طبقات الحنفیہ و مولفوھا، ایک عربی مقالہ اس موضوع پر اس کتبخانے اور بعض دوسرے کتبخانوں میں جو مخطوطات ہیں ان سے متعلق ہے۔

'کشمیر درپن' ایک اردو ماہنامہ تھا، جس کے مدیرِ اول سر تیج بہادر سپرو تھے، اس کے متعلق جو مقالہ ہے اس میں اس کا مفصل تعارف کرایا گیا ہے۔

یوپی پراونشیل کانگریس کمیٹی کی پہلی کانفرنس جو منعقد ہوئی تھی، اس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ ان کا خطبۂ صدارت جو اس شمارے میں شامل ہے، کشمیر درپن سے لیا گیا ہے۔ شرکا کی بہت بڑی اکثریت ہندو تھی، مگر خطبۂ صدارت کا آغاز ایک فارسی شعر سے ہوتا ہے، جس کی ابتدا ایک عربی جملے سے ہوتی ہے۔

'مطبوعاتِ جدیدہ' کے تحت "رہبرِ تحقیق" کا تبصرہ ہے۔ آیندہ بھی کتابوں کے تبصرے شائع ہوتے رہیں گے۔

'تصحیح و اضافہ' کے تحت دیوان رضا سے متعلق فہرست نگارِ کتبخانہ کی ایک فاحش غلطی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اس عنوان کے تحت مندرجاتِ رسالہ کی غلطیوں اور فروگذاشتوں کا ذکر بھی ہوا کریگا۔

'نوادر' کے تحت ابوالکلام آزاد کے ایک خط کا عکس اور وزیٹرس رجسٹر کے چند اقتباسات ہیں، ایسے نوادر آیندہ بھی شائع ہوا کریں گے۔

••

سلسلہ خدا بخش خطبات ۲۴

فارسی اور ہندوستان

ڈاکٹر نذیر احمد
پروفیسر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی۔ علیگڈھ

خدا بخش خطبات ـــــ ۱۹۷۴ء

سال طباعت ـــــ ۱۹۷۶ء

خدا بخش لائبریری میں پچھلے چند برسوں سے خدا بخش سالانہ خطبات کا ایک سلسلہ قائم ہے جس میں عربی فارسی یا علوم اسلامیہ کے معروف فاضلوں کو لکچر دینے کے لئے لائبریری میں مدعو کیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں اس کے لئے ڈاکٹر نذیر احمد منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد سے قبل پروفیسر آصف فیضی، ڈاکٹر زبیر صدیقی اور قاضی عبدالودود اس سلسلہ کے لکچر دے چکے ہیں۔

مجیب حسین نے "لیبل لیتھو پریس" رمنا روڈ، پٹنہ ۴ میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا

۱

فارسی کے اثرات ہندوستانی معاشرت اور ہندوستانی زبانوں پر

ہندوستان اور ایران کے تعلقات بہت قدیم ہیں، حضرت عیسیٰؑ سے سیکڑوں سال قبل دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان سیاسی و ثقافتی تعلقات استوار ہو چکے تھے، چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران میں ہخامنشی خاندان کی حکومت قائم ہوئی، اس خاندان کے نامور فرمانروا داریوش اعظم نے اپنی سلطنت کے حدود سندھ تک بڑھائے تھے، چنانچہ ہخامنشی کتبات میں نہ صرف سندھ کا ذکر ملتا ہے بلکہ ان ہندوستانی سفیروں کی تصاویر بھی تخت جمشید کے مشہور محل کے زینے پر کندہ ہیں، جو نوروز کے موقع پر تحائف لے کر حاضر ہوئے تھے، بعض محققین کا خیال ہے کہ شہنشاہ اشوک کے کتبات پر ہخامنشی اثر پایا جاتا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خروشتی خط جس میں اشوک کے بعض کتبات ہیں وہ ہخامنشی کتبات کے خط میخی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ساسانی دور میں (۲۲۷- ۹۵۲) دونوں ملکوں کے ثقافتی تعلقات اور بھی مستحکم ہو جاتے ہیں، شطرنج کا کھیل اور پنج تنترا کے قصے ہندوستان سے ایران گئے اور وہاں بہت مقبول ہوئے، اجنتا کے غار کی نقاشی میں بھی ایرانی اثرات بتائے جاتے ہیں، اس کی بعض نقاشی سے ایرانی تاریخ کے ایک واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے، طبری نے اپنی تاریخ میں خسرو پرویز کی ایک سفارت کا ذکر کیا ہے جو جنوبی ہندوستان بھیجی گئی تھی، غار کی چند نقاشی ساتویں صدی عیسوی کی بتائی جاتی ہے۔ اس میں جنوبی ہند کے بادشاہ پولاکیسن دوم کی تصویر ہے جس میں وہ ایرانی سفیروں کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ یہ ایرانی سفرا اپنے لباس، اسلحے اور دوسرے سامان سے پہچانے جاتے ہیں۔ ساسانی

اور ہندوستانی تعلقات کا واضح ثبوت ان پہلوی کتبات سے فراہم ہوتا ہے، جو جنوب ہند میں اب پائے جاتے ہیں، یہ کتبے سریانی کلیسا سے متعلق ہیں، ان میں سے کم از کم چھ مختصر کتبے پتھر کی صلیب پر منقّش ہیں، ان میں سے ایک مدراس کے قریب کوہ سینٹ ٹامس، دو ٹراونکور، دو کوٹیام میں پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان و ایران کے قبل اسلام کے سیاسی و ثقافتی تعلقات کا مطالعہ نہایت دلچسپ موضوع ہے۔ لیکن فی الحال یہ ہماری گفتگو سے خارج ہے، ہماری گفتگو اسلامی دور کے ایرانی اثرات کے ایک شعبے یعنی فارسی زبان تک محدود رہے گی، اس صحبت میں فارسی زبان کے اثرات یہاں کے تمدّن و معاشرت اور زبانوں پر مختصر طور پر بیان کئے جائیں گے۔ اس لئے کہ یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس کے لئے مجلدات درکار ہیں۔

ہندوستان کے خطۂ سندھ پر محمد بن قاسم کا حملہ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوا، اس حملے کے نتیجے میں ہندوستان کا جنوب و مغرب کا علاقہ عربی نفوذ کے تحت آیا، مگر اس حملے کے اثرات دور رس نہ تھے، البتہ جب دسویں و گیارہویں صدی میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر مسلسل حملے شروع کئے، تو ایرانی تمدّن و ایرانی زبان کے پھیلنے کے مواقع زیادہ ہوگئے، اہل ایران کو ہندوستانی مسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی، ابوریحان بیرونی کی کتاب تحقیق ماللہند اور زین الدین گردیزی کی کتاب زین الاخبار کے بعض اجزا سے اس بات کا بخوبی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض صوفیوں نے اس عہد سے قبل ہی ہندوستان میں اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری کر رکھی تھیں، لیکن اس کے بعد یہ سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں۔ ان صوفیہ میں سب سے زیادہ ممتاز شخصیت شیخ ابوالحسن ہجویری کی ہے جو تصوف و عرفان کی دنیا میں اپنی شہرۂ آفاق کشف المحجوب کی وجہ سے زندۂ جاوید ہوگئے ہیں؛ وہ لاہور میں مدفون ہیں اور حضرت داتا گنج لاہوری کے نام سے ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔

غزنوی حکومت کے آخری دور میں لاہور و ملتان کے خطّے کو بڑی سیاسی و علمی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، وہ غزنین کے بعد سب سے بڑا اہم سیاسی اور نتیجۃً ثقافتی و علمی مرکز بن جاتا ہے! یہیں ایرانی و ہندی تہذیب کا سب سے بڑا سنگم بنتا ہے؛ مسعود سعد سلمان (م: ۵۲۵ھ) کو ہندی شاعر قرار دینے کا واقعہ صحیح نہ بھی ہو، پھر بھی اس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اطراف لاہور

میں مقیم رہنے کی بنا پر فارسی کے شاعر کی مہارت ہندوستانی زبان میں اتنی ہو سکتی تھی کہ وہ اس زبان میں شعر کہہ سکے؛ اگر اس کا امکان نہ ہوتا، تو محمد عوفی اور امیر خسرو، مسعود سعد سلمان کے ہندی میں شعر کہنے کی روایت کو خلاف حقیقت و امکان قرار دے کر بآسانی رد کر سکتے تھے۔

غزنوی دور کے آخری دو فرماں روا خسرو شاہ (۵۴۷-۵۵۵) اور امیر خسرو ملک نے غزنین کے بجائے لاہور کو اپنا مستقل مستقر قرار دیا، اس کی بنا پر غزنین کی ساری علمی و ادبی میراث اسی خطے کے حصے میں آ گئی۔

اسی درمیان معز الدین محمد بن سام (م ۶۰۲) جو عام طور پر شہاب الدین محمد غوری کے نام سے مشہور ہے، ہندوستان پر حملہ آور ہوتا ہے۔ غوریوں نے غزنین کو تخت تاراج کر کے ہندوستان کو اپنی آماجگاہ بنایا، پہلے لاہور اور پھر دہلی پر اپنا تسلط قائم کیا اور ساتھ ہی ان کے غلام قطب الدین ایبک نے ایک مستقل حکومت کی بنیاد ڈالی۔

شہاب الدین غوری کا جانشین قطب الدین ایبک ہندوستان کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک طرف تو اس نے مستقل اسلامی سلطنت کی بنا ڈالی، جو ساڑھے چھ سو برس تک قائم رہی، دوسری طرف ایران و ترک کی مشترک تہذیب کے پھیلنے کے وسائل پیدا کئے۔ قطب الدین ترک تھا۔ چنانچہ "ای یک" جو اس کے نام کا جز ہے اس کے ترک نژاد ہونے کا شاہد ہے۔ قطب الدین ایبک کے جانشیں ترک تھے، ان کے زمانے میں ہندوستان میں ترکی اثرات خوب پھیلے، ان بادشاہوں کی مادری زبان ترکی لیکن تہذیبی زبان فارسی تھی جس پر ترکی اثرات غالب تھے۔ یہی فارسی ہندوستان میں مروج ہوئی اور رفتہ رفتہ اس کا اثر اتنا بڑھا کہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا تسلط ہو گیا۔

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے چھ سو سالہ تسلط کا زمانہ نہ صرف ہندوستانی تمدنی و سیاسی تاریخ کا اہم باب ہے۔ بلکہ خود ایران کی تمدنی تاریخ میں بے پایاں اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور کا قرار واقعی مطالعہ اب تک نہیں ہو سکا ہے، اس کی وجہ سے مشرق و مغرب کے فضلا بڑی غلط فہمی کے شکار ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ایک اعتبار سے ہندوستانی فارسی ادب و شعر کی اہمیت تسلیم کر لی گئی ہے۔ دور مغلیہ ہندوستانی فارسی کا عہد زریں قرار دیا گیا ہے اور اس دور میں فارسی کی غیر معمولی ترقی کی بنا پر ہندوستان دنیائے فارسی کا سب سے اہم مرکز اور یہاں کا سبک سبک ہندی

کے نام سے اس دَور کا نمائندہ مکتبِ فکر گردانا گیا ہے۔ اگرچہ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایرانیوں نے ہندوستانی فارسی کو سبکِ ہندی کے نام سے منسوب کرکے اس کی قدردانی کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک معاملہ برعکس ہے۔ ایران کے دانشوروں کے نزدیک سولہویں اور سترہویں صدی میں فارسی ادب کی سربراہی ہندوستان کے حصّے میں تھی، اور یہی مکتبِ فکر سارے جہانِ فارسی کے لئے نمائندہ مکتب تھا۔ اس کی پیروی ہندوستان، ایران، افغانستان اور دوسرے فارسی خطوں میں ہوتی تھی۔

ہندوستان میں فارسی کے تسلّط کی طویل مدّت میں فارسی زبان میں متنوع موضوعات پر صدہا کتابیں لکھی گئیں چنانچہ بعض اعتبار سے ہندوستانی فارسی ادب ایرانی فارسی ادب سے سبقت لے گیا ہے۔ ذیل میں بعض تالیفات اور مؤلفین کا ذکر کیا جاتا ہے، جو ایرانی فارسی ادب میں اہم درجے کے حامل ہیں۔ ان کا مطالعہ محض ہندوستانی فارسی کے لحاظ سے نہیں بلکہ عام فارسی ادبیات کے لحاظ سے حد درجہ درخورِ اعتنا ہے۔

ہندوستان کی سب سے پہلی اور اہم نثری تالیف کشف المحجوب ہجویری، جو فارسی میں تصوّف کی قدیم ترین کتاب ہے اور سب سے پہلا تذکرہ شعر الباب الالباب عوفی ہے۔ اس سے قدیم کوئی اور تذکرہ فارسی میں نہیں ملتا۔ فرہنگ قواس لغت فرس کے دوسری قدیم ترین فرہنگ ہے۔ فرہنگ دستور الافاضل قدامت کے اعتبار سے چوتھی فرہنگ ہے۔ فرہنگ جہانگیری جو جہانگیر کے نام پر مدون ہوئی بعض لحاظ سے فارسی کی سب سے اہم فرہنگ ہے۔ برہان قاطع جو بہت متداول لغت ہے، وہ بھی ہندوستان ہی میں تالیف ہوئی۔ سراج الدین علی خاں آرزو کی کتاب جو فارسی کے اصول زبان سے تعلق رکھتی ہے، فارسی میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ ٹیک چند بہار کی فرہنگ بہارِ عجم اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے نظیر تالیف ہے، آداب الحرب والشجاعہ جو التمش کے عہد میں فخر مدبر نے تالیف کی، آدابِ جنگ پر فارسی میں قدیم ترین تالیف خیال کی جاتی ہے۔ عربی کے مشہور متنوں کا ترجمہ ہندوستان میں ہوا۔ ان میں سے چند خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں: ترجمۂ عوارف المعارف جو ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا کے مرید قاسم داؤد خطیب کی توجہ سے فارسی میں منتقل ہوا، اس کتاب کا قدیم ترین ترجمہ ہے، احیاء علوم الدین کا فارسی ترجمہ التمش کے عہد میں مؤید جاجرمی کے قلم کا رہینِ منّت ہے۔ مگر اس کے کسی کامل نسخے کا پتہ نہیں چلا سکا۔ عجب نہ جیسے مختلف کتابخانوں

میں ملتے ہیں، اسی زمانے میں محمد عوفی نے تنوخی کی کتاب الفرج بعد الشدۃ کو فارسی میں منتقل کیا، چچ نامہ جو سندھ کی تاریخ پر سب سے قدیم کتاب ہے، ایک عربی تاریخ کا ترجمہ ہے۔ ابوالفضل کا آئین اکبری فارسی ادب میں بے مثل کتاب ہے۔ جوامع الحکایات عوفی جیسی کوئی جامع کتاب اس موضوع پر موجود فارسی میں نہیں۔ مؤرخ کی حیثیت سے منہاج سراج صاحب طبقات ناصری، ضیاء برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی، عبدالقادر بداونی صاحب منتخب التواریخ، محمد قاسم فرشتہ صاحب تاریخ فرشتہ غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں، شاعری کے میدان میں مسعود سعد سلمان، امیر خسرو، حسن دہلوی، فیضی، عرفی، نظیری، صائب، کلیم، بیدل، غالب، اقبال وغیرہ کسی تعارف کے محتاج نہیں، بیدل کی شاعری نے معاصر افغانی شعراء کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے، یہاں تک بعض افغانی نقاد کے نزدیک کم شاعر اس کے درجے کے پائے جاتے ہیں۔ ماوراء النہر کے علاقے میں بیدل کافی مقبول ہیں، غالب اگرچہ ایران میں کم مقبول ہے لیکن افغانستان اور تاجیکستان وغیرہ میں اس کے کافی قدردان مل جائیں گے، خود سبک ہندی کا نفوذ جدید ایرانی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ ایران میں متعدد شاعر ہیں جو سبک ہندی میں شاعری کرتے ہیں۔ ان میں فیروز کوہی سب سے ممتاز ہیں۔

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ فارسی ادب جو ہندوستان میں پھیلا وہ اپنی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے کسی طرح نظر انداز ہونے کے لائق نہیں، اس ادب کے بعض شعبے ایسے ہیں جن میں ہندوستان ایران سے سبقت لے گیا ہے، چنانچہ اوپر جو خلاصہ بیان ہوا ہے اس سے اس کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً لغت نویسی کے لحاظ سے ہندوستان کا پلہ بہت بھاری ہے۔ نہ صرف بیشتر فرہنگیں اسی ملک میں لکھی گئیں، بلکہ اصول زبان سے متعلق تالیفات ہندوستان ہی میں مرتب ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی اکثر فرہنگوں کا انتقادی متن ایران سے شائع ہو رہا ہے، حال ہی میں فرہنگ جہانگیری ایڈٹ ہو کر مشہد یونیورسٹی سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ برہان قاطع کا انتقادی متن مشہور ایرانی فاضل ڈاکٹر محمد معین کی توجہ سے عرصہ ہوا پانچ جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ فرہنگ آنندراج بھی شائع ہوئی۔ مگر یہ ناقدانہ ایڈیشن نہیں۔ فرہنگ قواس اور فرہنگ دستورالافاضل کے انتقادی متن جو راقم حروف نے مرتب کئے ہیں عنقریب

شائع ہو جائیں گے۔ تذکرہ نویسی کے اعتبار سے ہندوستان نے نہایت شاندار خدمت انجام دی ہے؛ شاعری کا پہلا باقاعدہ تذکرہ لباب الالباب عوفی کا ہے جو اندازاً ۶۱۷ ہجری کے قریب مرتب ہوا، یہ تذکرہ اولاً یورپ اور پھر ایران سے دوبارہ شائع ہوا، دوسرے عام تذکروں میں تقی اوحدی کا تذکرہ (عرفات عاشقین کی ضخامت اور اس نسخوں کی کمیابی اس کی اشاعت میں حائل ہے) اور ہفت اقلیم تالیف امین احمد رازی ایران میں چھپا مگر نا قص طور پر۔ ہندوستان میں اس کے اجزاء کا تنقیدی متن شائع ہوا ہے ——— عبدالنبی کا تذکرۂ میخانہ دوبارہ تہران سے بھی شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ پچاسوں چھوٹے بڑے تذکرے ہندوستان میں مرتب ہوئے ہیں جن کے مطالعے کے بغیر فارسی ادب کی تاریخ ادھوری اور نامکمل رہے گی۔

تفصیلات بالا سے اندازہ ہوگا کہ ہندوستان میں فارسی کے تسلط سے ایک طرف تو فارسی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا اور دوسری طرف اس نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ اگرچہ اس کے دورِ تسلط کو ختم ہوئے ایک صدی سے زیادہ ہوا۔ لیکن یہاں کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر اس کے اثرات کے نقوش تازہ ہیں۔ یہی آج کی گفتگو کا موضوع ہے۔

ایرانی زبان اور ایرانی تمدّن کے غیر معمولی نفوذ کے دور رس اسباب یہ ہیں:۔

(۱) ہندوستان پر ایسے حکمرانوں کا تسلّط جو ایرانی تہذیب و ایرانی زبان کے حامل تھے، اس کی وجہ سے فارسی یہاں کی سرکاری و تہذیبی زبان ہوئی، اور اس نے ہندوستانی زندگی کو متاثر کیا۔

(۲) جدید ایرانی تہذیب کا سرچشمہ اسلامی تہذیب و تمدّن ہے۔ جس میں بذات خود بڑی جاذبیت و تنوع ہے۔

(۳) ایران و ہندوستان ہم جوار ملک ہیں اور دونوں ملکوں کے باشندے آریائی نسل کے ہیں۔

(۴) ہندوستان کی زبانیں آریائی نسل کی ہیں اور فارسی زبان کی ہم ریشہ و ہم رشتہ، فارسی یہاں کی سرکاری زبان ہوئی، تو اس میں اور یہاں کی زبانوں میں زیادہ دوری نہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے متاثر ہونے کے مواقع پیدا ہوئے۔

ضمناً یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس صحبت میں ان امور کا ذکر خاص طور پر ہوگا، جن میں

فارسی زبان کے واضح اثرات آج تک پائے جاتے ہیں، البتہ ان اثرات کی نشاندہی کے موقع پر عربی کے وہ الفاظ و فقرات بھی مذکور ہوں گے جو فارسی زبان کے جزء بن چکے ہیں اور ایک مدت تک ایران میں مستعمل رہنے کے بعد ہندوستان میں رائج ہوئے ہیں، اس بنا پر ان کا استعمال فارسی اثرات کی نشاندہی کرتا ہے عربی کا نہیں، اس لئے کہ ہندوستان میں وہ فارسی کے وسیلے سے آئے اور یہاں ان کا چلن ایرانیوں کی وجہ سے ہوا۔ اس امر کی توضیح کے لئے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

عربی میں مسلم، مومن، حاکم، سامع کی طرح کے الفاظ کی جمع بالترتیب مسلمون، مومنون، حاکمون، سامعون آتی ہے جو مفعولی و اضافی صورتوں میں مسلمین، مومنین، حاکمین، سامعین ہو جاتی ہے، گویا یہ آخری صورتیں فاعلی حالت کے طور پر استعمال نہیں ہوتیں، ایرانیوں کا یہ تصرف قابلِ لحاظ ہے کہ انھوں نے عربی کی فاعلی صورت مسلمون، مومنون، حاکمون، سامعون کو ترک کر کے ان کی مفعولی حالت یعنی مسلمین، مومنین، حاکمین اور سامعین کو فاعلی صورت میں استعمال کیا، جیسے مومنین آمدند، مسلمین خوشنود شدند، حاکمین خوب اند، سامعین حاضر نبودند، عربی زبان کے اعتبار سے یہ صورتیں غلط ہیں اس لئے کہ یہ مثالیں فاعلی صورت کی ہیں، ان میں مفعولی یا اضافی شکلیں استعمال نہیں ہو سکتیں۔ یہی فارسی صورت ہندوستان میں مروج ہوئی، عربی فاعلی حالت یہاں مروج نہ ہو سکی۔ اردو میں یہی صورت فارسی کی طرح فاعلی، مفعولی، اضافی تینوں حالتوں میں استعمال ہوتی ہے۔ صفت موصوف کی کے سلسلے میں ایرانیوں نے عربی قاعدے میں جو تبدیلی کی تھی، وہ بعینہٖ اردو میں رائج ہوئی۔ اسی کے ضمن میں عربی تائے تانیث کی فارسی ہائے مختفی میں تبدیلی بھی فارسی کی طرح اردو میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوئی کہ عربی کے الفاظ و فقرات ہندوستانی زبانوں میں فارسی کے توسط سے آئے اور اسی بنا پر ان کا استعمال فارسی اثرات کا شاہد ہے۔

ہندوستانی زندگی میں فارسی زبان کے اثرات کے تعین کے سلسلے میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ناگزیر ہے اور چونکہ یہ مسئلہ آمار و حساب کا ہے، اس لئے اس میں مفرد الفاظ سے استشہاد ہو گا جو سامعین کے لئے اکثر غیر دلچسپ ہو گا، اس لئے ان سے معذرت خواہ ہوں۔

انسانی زندگی میں "نام" کی بڑی اہمیت ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے نام اکثر عربی اور اسلامی ہیں، لیکن خاصی تعداد ایسے ناموں کی بھی مل جاتی ہے جو اصلاً فارسی ہیں۔ ان میں

خال خال ایسے نام بھی آجاتے ہیں جو زرتشتی مذہب اور قدیم ایران کی اساطیری تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں ؛ یہ کوئی عجیب بات نہیں اس لئے خود اسلامی تہذیب میں قدیم ایرانی و زرتشتی روایت کا اثر ملتا ہے ، یہی وجہ ہے کہ جب ایرانی تہذیب ہندوستان میں اپنا اثر جماتی ہے تو اس کے قدیم ایرانی عنصر کا کچھ اثر ہندوستانی زندگی پر بھی پڑتا ہے ؛ اردو زبان و ادب خصوصاً اور بعض اور دوسری زبانیں عموماً قدیم ایرانی اثرات سے بڑی حد تک متاثر ہوئی ہیں ، چنانچہ راقم حروف نے اپنے ایک مقالے میں اس امر پر کسی قدر تفصیلی بحث کی ہے ، اس کے دہرانے کا اس وقت موقع نہیں -

ذیل میں کچھ ایسے ہندوستانی نام دیے جاتے ہیں ، جو فارسی اثرات کے حامل ہیں :

نوشابہ ، ہوشنگ ، جمشید ، رستم ، سہراب ، کیقباد ، فریدوں ، خسرو ، پرویز ، فروز ، آذرمیدخت ، منیژہ ، ناہید ، خورشید ، بہرام ، آفتاب ، ماہتاب ، شاہ بانو ، زرینہ ، شاہین ، شاہینہ ، نوشین ، فیروزہ ، نورجہاں ، شاہ جہاں ، شاہوار ، دُردانہ ، فرزانہ ، شاہانہ ، دلشاد ، دلدار ، اختر نواز ، دلنواز ، شاہ نواز ، مہدی نواز ، دولت یار ، بخت یار ، شہریار ، شمشاد ، یاسمین ، نسرین ، گلاب ، مہرجہاں ، جان جہاں ، اورنگزیب ، جہانگیر ، بیدار بخت ، بہادر شاہ ، باز بہادر ، شیر جنگ ، شیر خان ، دریا خان ، شہناز ، گلنار ، نورنگ ، مہرافروز ، افسر بانو وغیرہ وغیرہ - بعض ہندوؤں کے نام بھی اسی انداز کے ہیں مثلاً لال بہادر ، جنگ بہادر ، شیر بہادر ، شمشیر بہادر ، رائے بہادر ، راج بہادر ، بجرنگ بہادر ، روشن لال ، اقبال سنگھ ، خوش وقت سنگھ ، دیبی بخش وغیرہ -

ہندوستانی خطابات میں فارسی کی جا بجا آمیزش ملتی ہے - مثلاً خان بہادر ، رائے بہادر ، آصف جنگ ، شمشیر جنگ ، یاور جنگ ، بہادر جنگ ، سالار جنگ ، وغیرہ

میرے ایک دوست نے جو گڑھوال کی پہاڑیوں میں کافی پھر چکے ہیں ، مجھے بتایا کہ اکثر پہاڑیوں کے نام میں فارسی آمیزش ملتی ہے - جیسے دربان سنگھ ، مہربان سنگھ ، بلند سنگھ ، علم سنگھ ، قلم سنگھ وغیرہ ، وہاں ان کو بتایا گیا کہ ۱۸۵۷ کی شورش کے زمانے میں بعض مغل امرا وغیرہ ان اطراف میں آ بسے تھے - اس وجہ سے اس طرح کے نام وہاں رائج ہو گئے -

انسانی اعضائے بدن یا جسم کے تعلقات کے مقبول عام تمدن و معاشرت

کے محرکات کے غماز ہوتے ہیں اس سلسلے کے اکثر الفاظ فارسی کے ہیں، جو عام لوگوں کی زبان پر ہیں:۔
جسم، خون، ابرو، ناخن، سینہ، جگر، دل، بغل، پہلو، پلک، کنار، بازو، پشت، پنجہ، گردن، کمر، سر، پیشانی، زبان، حلق وغیرہ۔ اِن میں اکثر اتنے عام ہیں کہ ان کا بدل ہندی لفظ موجود ہی نہیں اور ہے بھی تو زبان پر نہیں چڑھا۔ خون، ناخن، بغل، پلک، پنجہ، گردن، کمر، سینہ، سر، زبان ایسے لفظ ہیں جن کو عامی سے عامی آدمی بولتا اور سمجھتا ہے۔ ان میں بعض لفظ سنسکرت یا ہندوستانی ماخذ میں بھی اسی شکل اور اسی معنی میں مستعمل ہیں۔ مثلاً کنار اور سر، ان کے متعلق قطعی فیصلہ مشکل ہے کہ ہندوستان میں ان کا چلن فارسی کی وجہ سے ہوا یا خود یہیں کی زبان سے لیا گیا ہے۔ البتہ فارسی لفظ کران جو اُردو ادب میں اکثر استعمال ہوا ہے، وہ فارسی لفظ کنار کی تقلیبی شکل ہے۔

انسانی زندگی میں رشتہ اور رشتہ داری کو بڑی اہمیت حاصل ہے، زندگی کا یہ شعبہ فارسی سے کم متاثر ہوا ہے اس لئے کہ اس سلسلے کے زیادہ الفاظ فارسی سے ماخوذ نہیں پھر بھی الفاظ ذیل سے فارسی کے اثر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

داماد، شادی، باجی، بابا، ہمزلف، خویش، برادر، برادرِ نسبتی، زوجہ، شوہر، چچا زاد، پھوپھی زاد، خالہ زاد، گھر داماد، خالہ، خالو۔

غذا و خوراک انسانی زندگی کی ناگزیر چیزیں ہیں۔ جب تہذیب ترقی کرتی ہے، تو اس کے کھانے پینے کے لوازم میں تنوع پیدا ہوتا ہے، متنوع قسم کے کھانے دسترخوان کی زینت ہوتے ہیں، اس طرح کے تنوع میں ایرانی اثرات کافی دخیل رہے ہیں۔ ضمناً یہ بھی عرض ہے کہ رشتہ کے سلسلے کے نام مخصوص اور محدود ہوتے ہیں، ان میں تہذیبی ترقی کسی اضافے کی موجب نہیں ہوتی۔ برخلاف غذا و خورش کے کہ ان میں تمدنی ترقی کے شانہ بشانہ روز افزوں ترقی و اضافہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

خوراک، دسترخوان، گوشت، سبزی، قورمہ، قیمہ، کوفتہ، قلیہ، دوپیازہ، بریانی، شامی کباب، شوربہ، چپاتی، نان، نان ختائی، شیرمال، تنور، تندوری (= تنوری) خشکہ، زردہ، پلاؤ، کلہ پایہ، فالودہ، نہاری، خاگینہ، لیسندے، آش، یخنی، مزعفر، شیر، شیر برنج،

شیرخرمہ، شیرانیہ، مرغ، دم پخت، حلیم، شب دیگ۔

ہندوستان کے اکثر لباس اور اس کے متعلقات کے نام فارسی زبان کے ہیں۔ اس سلسلے کے چند نام یہ ہیں:۔

پوشاک، پاجامہ، زیرجامہ، چارجامہ، شلوار، قمیص، ازار، ازاربند، پاتابہ، عمامہ، موزہ، جراب، شیروانی، کف، جامہ، جیب، استر، ابرہ، لحاف، مغزی، دامن، عرض، پہنا (پہن، پہنا سے مقلوب ہے اور گاؤں میں مستعمل ہے)، جاجم، خیمہ، قنات، پشمینہ، سینہ بند، عبا، قبا، تنزیب، مخمل، اطلس، زربفت، وغیرہ۔

ہندوستان کے بعض شہروں، قصبوں، اور محلوں کے نام فارسی سے لئے گئے ہیں، جب تک ان کا وجود ہے۔ فارسی کا اثر باقی رہے گا اور جب بھی کوئی ان کی وجہ تسمیہ سے بحث کرے گا، اسے فارسی ہی کا سہارا لینا پڑے گا۔ اس سلسلے کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

آباد پر ختم ہونے والے نام:۔ احمد آباد، محمود آباد، حسن آباد، حیدر آباد، فیروز آباد، شاہجہاں آباد، الہ آباد، غازی آباد، فرخ آباد، فیض آباد، شمس آباد وغیرہ۔ (اس طرح کے نام ایران میں آج بھی پائے جاتے ہیں)۔

گنج پر مشمول نام: نواب گنج، یحییٰ گنج، حضرت گنج، گنج مراد آباد، جے گنج، کشن گنج۔ (بظاہر گنج وہی لفظ ہے، جو فارسی میں خزانہ کے معنی میں مستعمل ہے)۔

پور پر ختم ہونے والے نام: جونپور، برہانپور، مرزا پور، کانپور، محمد پور، بختیار پور، احمد پور، شاہجہاں پور، حسن پور وغیرہ۔

(بظاہر یہ نام نیشاپور کے قیاس پر فارسی ہیں اور ان کا وجود فارسی کے زیر اثر ہوا ہے)

باغ پر ختم ہونے والے نام: قاضی باغ، صاحب باغ، بدر باغ، کمپنی باغ، زہرہ باغ، اردو باغ وغیرہ۔

سرائے پر مشمول نام: کھیتا سرائے، لکھی سرائے، مغل سرائے، سرائے خاص۔

(ان ناموں میں سرائے فارسی ہے، اور یہ شہر بھی ایرانی اثر کے تحت وجود میں آئے ہیں)

گھر، وغیرہ کے متعلقات بھی فارسی اثر سے محفوظ نہ رہ سکے، اس سلسلے کی چند مثالیں

یہ ہیں:-

غریب خانہ، صحن، دروازہ، طاق، دہلیز، دالان، شہتیر، برآمدہ، دریچہ، تخت، کرسی، نعمت خانہ، پایہ، دستہ، چارپائی، غسل خانہ، پاخانہ، آبدارخانہ، چبوترہ، محل سرا، بالاخانہ، پائیں باغ، غلام گردش، باورچی خانہ وغیرہ۔

ظروف جو ہندوستان میں مستعمل ہیں، اکثر لفظاً و معناً فارسی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

دیگ، دیگچی (کبھی کبھی ان کا تلفظ ڈال سے ہوتا ہے)، لگن، طشت، سیلپچی، کفگیر، ماہی تابہ، دست پناہ، سینی، قاب، پتیلہ (پاتیلہ سے ماخوذ ہے) پتیلی، گلدان، سرمہ دان (سرمہ دانی)، پاندان، خاصدان، اُگالدان، قلم دان۔

زیورات اور خوشبو کی چیزوں کے نام فارسی کے ہیں، مثلاً:

زیور، بازوبند، گلوبند، ہار، انگشتر، انگشتری، آویزہ، دست بند، جوشن، طوق، پازیب، ہیکل، عطر، مشک، مشک نافہ، نافہ، عنبر، زعفران۔

ہندوستانی پھلوں کے نام میں کچھ فارسی کے ہیں، بعض نام ایسے ہیں جن کا بدل ہندوستانی زبان میں نہیں، اس سلسلے کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

میوہ، سیب، انار، انگور، امرود، چلغوزہ، شفتالو، ناشپاتی، خوبانی، شریفہ، بادام، کشمش، خربوزہ، تربوز، سردا، شہتوت، ہندوانہ۔

یہ آخری لفظ ہندوستان میں عام نہیں، لیکن اودھ کے بعض علاقے میں تربوز کی جگہ بولا جاتا ہے۔ ایران، افغانستان، ماوراءالنہر وغیرہ میں تربوز کی جگہ یہی لفظ مستعمل ہے؛ وہاں اس کا شمار اچھے پھلوں میں ہوتا ہے اور دسترخوان کی زینت سمجھا جاتا ہے، اس لئے بڑی کثرت سے رائج ہے۔ بہرحال اودھ کے بعض علاقے میں اس اصیل فارسی لفظ کے استعمال کی وجہ معلوم نہ ہو سکی، لیکن یہ امر قابل توجہ اور دلچسپ ہے۔ بریلی و مرادآباد کے علاقے میں امرود کو سفری، بھی کہتے ہیں، اس کی وجہ تو نہ معلوم ہو سکی۔ لیکن یہ دونوں نام بھی فارسی ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں پھولوں کی کثرت ہے اور عام طور پر ان کے نام بھی ہندوستانی ہیں۔

لیکن خال خال فارسی نام بھی مل جاتے ہیں؛ اُردو زبان وادب اور بعض دوسری ادبی زبانوں میں فارسی پھولوں کے نام کثرت سے ملتے ہیں لیکن یہ جگہ ان کے ذکر کی نہیں۔ بعض فارسی نام یہ ہیں :

گلاب، گلِ داؤدی، گل شبو، حسن حنا، لالہ، نیلوفر۔

ہندوستانی جانوروں اور پرندوں کے ناموں میں بعض خالص فارسی کے ہیں اور وہ اتنے عام ہیں کہ ہر شخص ان کو استعمال کرتا ہے۔ اس سے فارسی اثر کا اندازہ ہو سکتا ہے، مثلاً : بیجان، حیوان، جانور، جاندار، شیر، خرگوش، شکرہ، شاہین، بلبل، باز، فاختہ، کبوتر، مُرغابی، سیخ پر، قاز، سُرخاب، نیل سر، کلنگ، بط، مرغ زریں (اس نام کے سلسلے میں میرے دوست ڈاکٹر کرمانی نے بتایا کہ یہ مخصوص چڑیا اُنھوں نے نیپال میں دیکھی اور اس کا یہ نام وہیں سنا)

ہندوستان میں پودوں اور درخت کی بڑی کثرت ہے اور ان کے بیشتر نام ہندوستانی ہی ہیں۔ لیکن خال خال فارسی نام بھی مل جاتے ہیں جیسے : چنار، حنا، بنفشہ، بعض ہندوستانی سبزیاں فارسی نام کی حامل ہیں مثلاً شکر قند، زمین قند، شلجم، کدو، خرفہ، شکر قند کو بعض علاقوں میں گنجی کہتے ہیں، جو بظاہر فارسی لفظ گنج سے بنا ہے۔

ہندوستانی گالیوں اور تنبیہ کے کلمات میں فارسی کے کافی عناصر اس زبان کے غیر معمولی اثرات کا پتہ دیتے ہیں، اس سلسلے کے بعض کلمات جو عام لوگوں کی زبان پر ہیں، کچھ اس طرح کے ہیں :

آوارہ، بدمعاش، حرامزادہ، بے شرم، بے حیا، کمینہ، بدذات، بیہودہ، نالائق، احمق، بدبخت، بدنصیب، مُجغد، کندۂ ناتراش، بے شعور، بے وقوف، اُٹھائی گیرا وغیرہ وغیرہ۔

ان کے مقابل میں تحسین کے کلمات قدرتاً کم ہیں۔ مثلاً : شاباش، زندہ باد، سبحان اللہ وغیرہ۔

سواری وسفر کے سلسلے کے خاصے الفاظ فارسی زبان سے ماخوذ ہیں مثلاً ملاحظہ ہوں :

راہ، میل، سوار، سواری، پیادہ، لگام، رکاب، رکابدار، زین، نعل، نعل بندی، فیس، چوبدار، چوبداری، راہ گیر، دُور، نزدیک، رتھ سوار، گھُڑسوار وغیرہ۔

ہندوستانی پیشہ وروں کے اکثر نام اور متعلّقات فارسی عربی کے ہیں، اس سلسلے کے چند نام یہ ہیں:

درزی، حجام[1] (خلیفہ)، نانبائی (نا نوائی)، باورچی، خانساماں، بزاز، قصاب، جلاد، گورکن، کتاب فروش، سبزی فروش، حلوائی، ندّاف، ملّاح، جولاہہ، مہتر، مہترانی، حلال خور، زرگر، سقہ، صرافہ، صراف، منعم، شُتربان، گاڑی بان، پیلبان وغیرہ۔

ہندوستان زرعی ملک ہے، کھیتی اور زراعت کے متعلق سیکڑوں لفظ و اصطلاح عوام و خواص کے زبان زد ہیں۔ ان میں خاصے الفاظ فارسی عربی کے ہیں۔ بہرحال یہ لفظ خواہ فارسی کے ہوں یا عربی کے فارسی زبان کے اثرات پر دلالت کرتے ہیں، اس سلسلے کی قابلِ ذکر مثالیں یہ ہیں:

کاشتکار، کاشتکاری، زمیندار، زمینداری، فصل، ربیع، خریف، زاید، گندم، جَو، آبپاشی، نہر، مزروعہ، غیر مزروعہ زمین، مالگزاری، تحصیل وصول، بقایا، رعایا، بارش، موسم، سردی گرمی، تقاوی، گِردی، دہندہ، نادہندہ، دخلی، اصلی، وغیرہ۔

ہندوستان میں عہدوں کے اکثر نام پُرانے ہیں، ان میں اکثر کی ذمہ داریاں بدل چکی ہیں لیکن نام وہی پُرانے چلے آتے ہیں۔ گویا فارسی کے اثرات ہنوز جاری وساری ہیں۔ چند قابلِ ذکر نمونے یہ ہیں:

سپاہی، شحنہ، دیوان، تحصیلدار، ضلعدار، تھانہ دار، کارندہ، مختار، امین، ترق امین، حاکم پرگنہ، حاکم تحصیل، حاکم ضلع، کوتوال، یہ آخری لفظ کوٹ اور وال سے بنا ہے جس کے معنی قلعہ وار کے ہیں۔ فارسی میں کوتوال "کوٹ والا" کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن جب فارسی یہ لفظ ہندوستانی زبان میں آیا، تو اس کے معنی بدل گئے، یہ محکمہ پولیس کی ایک اصطلاح ہے اس میں

---

[1] حجام کو خلیفہ اور حلال خور کو مہتر کہنے کی بظاہر یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ اس سے پیشہ کا احترام مقصود ہوگا۔

"یائے نسبتی" کے اضافہ سے "کوتوالی" کا لفظ بن گیا ہے۔

ہندوستان میں اکثر ایسی اصطلاحات رائج ہیں جن کی اصل عربی ہے (فارسی کی بھی قابل توجہ تعداد ہے)، چونکہ یہ عربی الفاظ اصطلاحات براہ راست عربی زبان سے نہیں، بلکہ فارسی زبان کے وسیلے سے آئے، اس لئے ان کے استعمال سے فارسی کے اثرات کا رشتہ کمزور نہیں ہوا، بہرحال فارسی و عربی کے یہ الفاظ صدیوں سے ہندوستان کی زبانوں کا جزو ہیں۔ اور لوگوں کے عام استعمال میں ہیں۔ اس سلسلے کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ جن میں بعض کاشتکاری سے بھی متعلق ہیں۔

عدالتی و قانونی اصطلاحات: عدالت، قانون، مدعی، مدعا علیہ، منصفی، دیوانی، مال، وکیل، مؤکل، وکالت، وکالت نامہ، رہن، مرتہن، بیعنامہ، رہن نامہ، ملزم، شہادت، گواہ، الزام، گواہی، سزا، جرمانہ، ثبوت، حاضری، حاضر، دستاویز، ملزم، جرح، نقشہ، خسرہ، مسودہ، ہبہ، کاتب، گواہ، حاشیہ۔

تحریر و کتابت کی اصطلاحات: قلم، دوات، سیاہی، روشنائی، کتاب، کاغذ، خط، املا، دستخط، درس، استاد، مشق، مسطر، طالب علم، ورق، صفحہ، باب، سرخی، کتابت، جلد، شانِ خط، پشت، پشتہ، سرورق، دیباچہ، مقدمہ، متن، حاشیہ، فصل۔

نجاری کے متعلقات: رندہ، دراز، برمہ، کمانی، زنبور، چوبہ، آرہ، آری، دلہ۔

معماری کے سلسلے کے الفاظ: راج (راز بمعنی معمار کی ہندی صورت)، معمار، آثار، مسطر، فصیل، ردہ، منزل۔

تعمیرات کے متعلقات: گنبد، منارہ، منار، محراب

طبی اصطلاحات: نبض، قارورہ، پیشاب، پاخانہ، حرکت۔

موسیقی: کمانچہ، ضرب، خیال، جھجز۔

پیمانے: گز، میل، من، سیر، مکعب، مربع، پیمانہ، پیمائش۔

ہندوستانی بول چال میں فارسی کے سیکڑوں کلمات مستعمل ہیں، ان الفاظ کے علاوہ فارسی کے فقرے، ضرب الامثال، روزمرے روزانہ کی گفتگو میں آتے ہیں۔ البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تدریجاً ان کا استعمال کم ہوتا جارہا ہے، لیکن ان کے استعمال سے گفتگو میں شائستگی اور بیان میں زور پیدا ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے کی بعض مثالیں درج ذیل کیجاتی ہیں:

از خویشتن گم است کرا رہبری کند ؛ آزمودہ را آزمودن جہلست ؛
بسلامت روی و باز آئی ؛ آفتابِ لبِ بام ؛
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی ؛ باہمیں مرداں بباید ساخت ؛
پایانِ شبِ سیہ سفید است ؛ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود ؛
جای استاد خالی است ؛ جای تنگ است و مرداں بسیار ؛
چون بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند ؛ چون عشق حرم باشد سہل است بیابانہا ؛
چرا کاری کند عاقل کہ باز آید پشیمانی ؛ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک ؛
کم از کم ؛ خدا نخواستہ ؛ خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود ؛ چوں بیاید ہنوز خر باشد ؛
خفتہ را خفتہ کی کند بیدار ؛ دیوار ہم گوش دارد ؛
در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست ؛ دیوانہ بکارِ خویش ہشیار ؛
دیدہ باید شد چہ می زاید کہ شب آبستن است ؛ دانہ دانہ ہمی شود انبار ؛
سگ باش برادرِ خرد مباش ؛ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم ؛
شنیدہ کی بود مانند دیدہ ؛ صدا ہر جا کہ شنید صدا است ؛
سگِ اصحابِ کہف روزی چند ؛ پی نیکان گرفت مردم شد ؛
شاہان چہ عجب اگر بنوازند گدارا ؛ عقلمنداں را اشارہ کافی است ؛
عاقبت گرگ زادہ گرگ شود ؛ قطرہ قطرہ دریا می شود ؛
کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی ؟ ؛ کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحلہا ؛
گربہ کشتن روزِ اول ؛ لیلیٰ را بچشمِ مجنوں باید دید ؛
مارا چہ ازیں قصہ کہ گاو آمد و خر رفت ؛ مشک آنست کہ خود ببوید ؛

من خوب می شناسم پیران پارسا را ؛ نہاں کی مانند آں رازی کز و سازند محفلہا ؛
ہر چہ استاد ازل گفت ہمان میگویم ؛ ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامی دارد ؛
ہمیں گوی و ہمیں چوگان ؛ یک انار و صد بیمار ؛

ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر فارسی جس قدر اثر انداز ہوئی ہے۔ اس کا کسی قدر اندازہ اس وقت تک کی گفتگو سے ہو گیا ہوگا، لیکن سب سے زیادہ یہاں کی زبانیں متأثر ہوئی ہیں۔ ہندوستانی زبانوں پر فارسی کا گہرا اثر ہوا ہے، ان میں شمال و جنوب دونوں خطوں کی زبانیں شامل ہیں۔ دراوڑی زبانیں یعنی تامل، تیلگو، کنڑی، ملیالم اور براہوی بھی اس کے حلقۂ اثر میں آگئیں۔ زبان پر جو اثرات ہوئے ان کے علاوہ بعض زبانوں کے ادب بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ان میں اُردو، ہندی، کشمیری، بنگالی اور پنجابی بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس کے لئے مجلدات درکار ہوں گے۔ اس سلسلے کے بعض مطالعے سامنے آچکے ہیں، ڈاکٹر عبدالحق کا کتابچہ مرہٹی پر فارسی کے اثر کے عنوان سے عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے؛ حال ہی میں ڈاکٹر یادو رنے بمبئی یونیورسٹی سے اسی موضوع پر کام کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان یہ ہے:- Impact of Persian on Marath Bakh- -ars and Aifihasic Patna Veovhar

اس مقالے میں موصوف نے نہایت مفید اور مفصل معلومات فراہم کر دی ہیں بنگال پر فارسی کے اثرات کے عنوان سے ڈاکٹر عطا کریم برق استاد کلکتہ یونیورسٹی نے تہران یونیورسٹی میں ایک مقالہ پیش کیا، جو ڈاکٹریٹ کے لئے منظور ہوا، یہ مقالہ ان تمام مقالات سے ممتاز ہے، جو غیر ایرانی طلبہ پیش کرتے ہیں۔ کاشی کالج کے فارسی کے ایک استاد آسامی زبان پر فارسی کے اثر و نفوذ کے عنوان سے پی ایچ ڈی کے حصول کے لئے ایک مقالہ تیار کرنا چاہتے ہیں، فارسی نے ہندی کو جس طرح متأثر کیا ہے، اس پر کئی دانشمندوں کے کتابچے سامنے آئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر کا مطالعہ خاصہ دلچسپ اور قابل توجہ ہے، یہ بات البتہ قابلِ ذکر ہے کہ اُردو فارسی نے سب سے زیادہ اثرات مرتب کئے۔ لیکن اس

سلسلے میں اب تک کوئی بڑا کام نہیں ہوا ہے ۔ عرصہ ہوا راقم حروف نے ہندوستان کی زبانوں پر فارسی کے اثر و نفوذ کے عنوان سے) شہنشاہ ایران کے جشن تخت نشینی کے موقع پر ایک مقالہ پیش کیا تھا جو اپریل ۱۹۷۲ میں انڈو ایران سوسائٹی کے رسالہ " انڈو ایران " میں شائع ہو گیا ہے ۔ اس موقع پر اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ، البتہ ہندی اور اردو پر فارسی کے اثرات کے سلسلے میں ایک مختصر سی گذارش ذیل میں درج کی جاتی ہے ۔

ہندی زبان پر فارسی کے اثرات حسب ذیل امور کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں ۔ چونکہ ہندی اور اردو کی بنیادی قواعد یکساں ہے ، اس لئے اردو بھی ان امور میں ہندی کی شریک ہے ۔

(۱) ہندی کے اکثر صفات فارسی سے ماخوذ ہیں اور ان سے اسم کیفیت بنانے کا قاعدہ دونوں میں یکساں ہے ، یعنی " ی " کے اضافے سے مثلاً آباد ، بہادر ، برابر ، برا ، گندہ صفت کی مثالیں اور آبادی ، بہادری ، برابری ، برائی ، گندگی اسم کیفیت کی مثالیں ہیں ۔ اسی کے ذیل میں وہ صفات بھی درج ہیں جو فارسی اسماء میں " ی " کے اضافے سے بنائے جاتے ہیں ، جیسے اصلی ، نقلی ، قیمتی ، غداری وغیرہ ۔

(۲) فارسی حاصل مصدر کثرت سے مستعمل ہیں جیسے : مالش ، سفارش ، سوزش ، گفتگو ، بارش ، خواہش ، آلائش ، آمیزش ، نالش اور اسی قیاس پر رہائش ۔

(۳) مصادر بھی فارسی لفظوں سے بنائے گئے ہیں جیسے : آزمانا ، خریدنا ، تراشنا ، لرزنا ، گذرنا ، فرمانا ، بدلنا ، شرمانا وغیرہ ۔

(۴) فارسی حروف جار ، متعلقات وغیرہ آزادانہ طور پر استعمال ہوتے ہیں جیسے : ہمیشہ ، بیشک ، بجز ، بغیر ، بجائے ، ہوبہو ، بابت ، پس ، ردبرد ، وغیرہ ۔

(۵) اس طرح کے مرکبات بھی فارسی اثر سے محفوظ نہ رہ سکے ۔ سرگشت ، کمرجھکا ، گھڑسوار ، دل چلا ، دماغ چلا ، سرپھرا ، اٹھائی گیرا ، وغیرہ

(۶) بعض فارسی اسم مفعول بھی ہندی میں مستعمل ہیں جیسے : شادی شدہ ، رجسٹری شدہ ، منتھی شدہ وغیرہ ۔

(۷) ریل پیل ، کھینچا تانی ، دھکا چوکڑی ، دھینگا مشتی ، کڑا کڑ ، بوندا بوندی ،

دھڑا دھڑ، پھماچھم، پٹاپٹ، بھاگا بھاگ، مارا مار وغیرہ فارسی انداز کے ہیں قس تگاپو، سراپا وغیرہ۔

(۸) فارسی پیشوند و پسوند (Prefixes suffixes) وغیرہ کا استعمال ملاحظہ فرمایئے: اُگالدان، پیکدان، پاندان، سنگار دان، سرمہ دانی، مچھر دانی، پاگل خانہ، چھاپہ خانہ، چنڈو خانہ، تاڑی خانہ، کھنڈ سار، چلمچی، ڈولچی، بے ڈھب، بے ڈول، بلاوجہ، بلاسبب، ہمجولی وغیرہ۔

(۹) بعض اسم فاعل فارسی قاعدے کے ملتے ہیں جیسے: چوڑی گر، جادکار، کلاکار، منھ توڑ، سرتوڑ، تیس مار، مکھی مار، کفن کھسوٹ، پتھر کٹ، پتھر چٹ۔ بعض میں فارسی افعال کی آمیزش ہے جیسے: دھوکے باز، اٹکل باز، دگلی باز، ٹھٹھے باز، گھڑی ساز، جوڑی دار وغیرہ۔

(۱۰) بعض اوقات فارسی کی طرح مضاف، مضاف الیہ کی تقلیب سے لفظ بنا لیتے ہیں، جیسے:- چور دروازہ، راج محل۔

(۱۱) بعض الفاظ میں یائے لیاقت کا استعمال قابل توجہ ہے جیسے: ہونی، انہونی، کرنی، بھرنی۔

فارسی نے ہندی ادب کو ایک حد تک متاثر کیا ہے، بعض ہندی شعرا نے غزل کی روایت اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اِن میں پرتاپ نرائن مصرا، ایودھیا سنگھ اوپادھیا، نرالا وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ بعض شعرا نے رباعی کے انداز میں شعر کہے ہیں، اس سلسلے میں رام شنکر شرما کا نام آتا ہے، بچن نے عمر خیام کی پیروی کی کوشش کی ہے جو ہندی میں نہایت درجہ مقبول ہوئی، ہندی صوفی شعرا کے لئے مثنوی خصوصیت سے قابلِ تقلید رہی، بعض شعرا نے فارسی بحور کے استعمال کا تجربہ کیا، اِن میں پرتاپ نرائن مصرا، سری دھر پاٹھک، ایودھیا سنگھ اُدپادھیا، بال مکند گپتا، نرالا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بعض ہندی شاعروں نے فارسی اشعار کا ترجمہ کر لیا ہے، اِس سلسلے میں کبیر داس خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

فارسی	ہندی
ہر کسی پنج روزہ نوبت اوست	کبیر اپنی نوبت دس دن لیو بجاے
چہ بندی تو دل برسرائے فسوس	کبیر شریر سرائے ہے کیا سووے سکھ چین
کہ در ہر زماں آید آوای کوس	سانس نگارہ کوچ کا باجت ہے دن رین

ہندی زبان پر فارسی کے جو اثرات ہیں، وہ سب اُردو پر بھی ہیں، ان کے علاوہ اُردو حسب ذیل لحاظ سے مزید متاثر ہوئی ہے۔

(۱) فارسی اضافت کا اُردو میں آزادانہ استعمال ملتا ہے، جیسے: مژہای دراز، گلہای ناز، علاوہ بریں عربی علامت 'ال' فارسی لفظوں کے ساتھ بھی کبھی مِل جاتی ہے جیسے: حسب الفرمائش، حسب الفرمودہ، قریب المرگ وغیرہ۔

(۲) فارسی واو عطف اُردو میں برابر استعمال ہوا ہے جیسے پیچ و تاب، خد و خال، سروپا، کرّ و فر، آب و ہوا، آب و رنگ، آب و دانہ، رفت و گذشت۔

(۳) فارسی اسم فاعل مرخم کی اُردو میں بہتات ہے۔ اس سلسلے کی یہ مثالیں، دلکش، دلفریب، مے کش، دلربا، جانفزا وغیرہ وغیرہ۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جائے گی۔

(۴) فارسی اسم مفعول کی یہ مثالیں ملاحظہ فرمائیے: گذشتہ، پیوستہ، آزمودہ، رفتہ، پروردہ، آموختہ وغیرہ۔

(۵) فارسی صفات اُردو میں ہندی کے مقابلے میں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں، اسی طرح صفات کے درجے بھی ہندی میں خال خال، لیکن اُردو میں زیادہ مروّج ہیں جیسے۔ بہ، بہتر، بہترین، کم، کمتر، کمترین، خوش، خوشتر، خوشترین، خوب، خوبتر، خوبترین وغیرہ۔

(۶) فارسی اسم حالیہ اُردو میں مروج ہے جیسے: لرزاں، خنداں، گریاں، نالاں وغیرہ۔

(۷) فارسی حروف جارہ اُردو مرکبات میں کثرت سے مستعمل ہیں جیسے: دراصل، بکثرت، بغور، درحقیقت، بر سبیل تذکرہ، دم بدم، پے در پے، بیش از بیش، کم از کم، علاوہ بریں، دربدر، قدم بقدم۔

(۸) عربی تنوین فارسی کی راہ سے اُردو میں آئی، اس سلسلے کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

فوراً، کنایتہً، عادۃً، مثلاً، یقیناً، اصلاً، ذیلاً، نسبتہً، مقابلتہً، حقیقتہً، مختصراً، اختصاراً، خصوصاً، اشارۃً، کنایتہً، اولاً، ثالثاً، رابعاً، ایماناً، ضرورۃً، ایضاً وغیرہ۔ اِسی عربی انداز کی فارسی کی یہ مثالیں بھی ہیں:

نمونتہً، انداز اً، نمونہ اور انداز فارسی لفظ ہیں، جو تنوین قبول نہیں کرتے۔

(۹) فارسی جمعیں کثرت سے اُردو میں مستعمل ہیں جیسے: سالہا سال، مدتہای دراز، غلطیہائے مضامین، سخت جانیہا، ہزارہا، صدہا، والیان، فرمانروایان، صاحبان، صاحبزادگان، خواجگان، پس ماندگان، بندگان وغیرہ۔

بعض جمعیں عربی قاعدے سے بنائی گئی ہیں جیسے: باغات، بیگمات، آلائشات، فرمائشات، گزارشات، خواتین، خوانین، فرامین، فرمودات وغیرہ۔

اُردو میں جمع الجمع کا استعمال فارسی کے قیاس پر ہوا، عربی میں اس کا وجود نہیں، جیسے وجوہات، فارسی میں مستند اساتذہ کے یہاں الحانہا، عشاقاں، ادتان، ملوکان کی طرح کی جمعیں پائی جاتی ہیں۔

(۱۰) عربی کے جو الفاظ و فقرات فارسی کے توسط سے اُردو میں آئے ہیں، ان کی نوعیت اس طرح پر ہے:

(الف)۔ کچھ الفاظ ہیں، جن میں لفظی و صوری تبدیلی ہوئی جیسے: مُسلمان ظاہر ہے کہ فارسی والوں نے اس کو مسلم کے معنی میں استعمال کیا اور وہی اُردو میں بھی رائج ہوا۔

(ب) کچھ الفاظ ہیں جن میں معنوی تبدیلی ہوئی جیسے عورت، عربی میں اس کے معنی چھپانے والی چیز کے ہیں، فارسی میں نیا لفظ زن کے معنی میں استعمال ہوا اُردو والوں نے اسے اپنایا۔

(ج) - عربی کی بعض جمعوں کی مفعولی صورت فاعلی شکل میں استعمال ہوئی جیسے: مسلمین سامعین وغیرہ، اس کے بارے میں شروع میں عرض کیا جا چکا ہے۔

(د) . فارسی والوں نے فارسی الفاظ کی چند جمعیں عربی کے دستور کے مطابق بنائی

ہیں، جیسے: گذارشات، باغات، اُردو میں یہ تحریک خاصی عام ہوگئی ہے، اس سلسلے کی مثالیں یہ ہیں: فرمودات، سفارشات، نامہ جات، وغیرہ۔

(ہ) عربی تثنیہ کا نہ صرف استعمال ہوا، بلکہ اس کی مفعولی و اضافی شکلیں فاعلی صورت میں رائج ہوئیں۔ یہ تصرف فارسی والوں کا تھا، یہی اُردو میں بھی مروّج ہوا، جیسے والدین، طرفین، جانبین، نعلین، مغربین، مشرقین، حرمین، سبطین وغیرہ۔

(و) صفت موصوف کی تطبیق[1] اُردو میں فارسی کی راہ سے آئی، اس سلسلے کی مثالیں یہ ہیں: والدۂ محترمہ، قوۃ ناطقہ، علوم اسلامیہ، ارشادات عالیہ، عادت ثانیہ وغیرہ۔

(ز) تطبیق صفت موصوف کی تثنیہ کی ایک صورت اُردو میں ملتی ہے:- حرمین شریفین۔

(ح) عربی تائے تانیث فارسی کی پیروی میں اُردو میں ہائے مختفی میں تبدیل ہوئی، جیسے: والدہ، محترمہ، کلمہ، ناطقہ، ثانیہ وغیرہ۔

(ط) تنوین کا استعمال فارسی کی راہ سے آیا ہے، یہی حال علامت اضافت وصفت موصوف کا ہے۔

(۲۰) فارسی کے اکثر محاورے اُردو میں ترجمہ ہوگئے ہیں۔ کچھ ہندی میں بھی استعمال ہوتے ہیں:-

سر آمدن = سر آنا
قسم خوردن = قسم کھانا
زبان کشودن = زبان کھولنا

---

[1] کبھی کبھی عربی زبان کے قاعدے سے ناواقفیت کی بنا پر غلطی سرزد ہوجاتی ہے۔ حال ہی میں راقم کی نظر سے "کتاب عظمیٰ" کی ترکیب نظر سے گذری، حالانکہ کتاب مذکر ہے۔ اس بنا پر عظمیٰ کے بجائے عظیم درست ہوگا۔

راز کشودن = راز کھولنا

از پوست براوردن = پول کھولنا

باد شدن = ہوا ہونا

گوش دادن = کان دھرنا

حرف گرفتن = بات پکڑنا

شرط بستن = شرط باندھنا

نام نہادن = نام رکھنا

لاف زدن = ڈینگ مارنا

از عہدہ بدر آمدن = عہدہ بر آ ہونا

آب آب شدن = پانی پانی ہونا

درپے شدن = درپے ہونا

ادبی اعتبار سے فارسی کے اثرات متنوع ہیں مثلاً :

(۱) فارسی کے سارے اصناف اُردو میں رائج ہیں، ویسے بعض اصناف عربی میں ہیں لیکن صراحتہً اردو نے فارسی نمونے اپنے سامنے رکھے۔

(۲) اُردو میں فارسی کے بحور متداول ہوئے، قوافی و ردیف کے معاملے میں اُردو نے فارسی ہی کی پیروی کی عربی کی نہیں، اگرچہ خود یہ اوزان اہلِ عرب کی ایجاد ہیں۔ لیکن فارسی طبائع نے ان میں خاصی تبدیلی کر لی ہے اور یہی تبدیل شدہ بحریں اُردو میں بھی رائج ہوئیں

(۳) اُردو میں قبل اسلام کی ایرانی روایت فارسی ہی کے وسیلے سے آئی - اِن میں بعض اعلام ہیں - ان میں سے کچھ نام ہندوستان میں رائج ہیں، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اِن کے علاوہ بعض نام ادبیاتِ اُردو میں آتے ہیں جیسے : انوشیرواں، ضحاک کیکاؤس، اردشیر، مانی، مزدک، ایزد، ژند، پاژند، موبد، موبد موبداں، باربد، بیستون، ترنج، ذرانغمۂ خسرو، طلائے دست افشار، کسریٰ، شوکت جم وغیرہ،

اس سلسلے کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

پہلے خوددار تو مانند سکندر ہو لے — پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی — کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری — محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

اُس مردِ خود آگاہ و خدا دوست کی صحبت — دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

کوہکن گرسنہ مزدورِ طربگاہِ رقیب — بیستون آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

شرارِ سنگ سے پا در حنا گلگوں شیریں ہے — ہنوز اے تیشۂ فرہاد عرضِ آتشیں پائی

حسن کا گنجِ گرانمایہ تجھے مل جاتا — تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی — ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

ان کے علاوہ عربی و اسلامی تلمیحات بھی براہِ راست اُردو میں نہیں آئیں، یہ مدتوں فارسی ادب میں استعمال ہوئیں اور ان میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ اس کے بعد اُردو میں مروج ہوئیں، اسی بنا پر ان کا استعمال بھی فارسی کے اثرات کا مظہر ہے۔

(۴) اُردو غزل کے تمام موضوعات و علامات فارسی ہی سے لئے گئے ہیں۔ یہ اتنے عام ہیں اور ان کی اتنی کثرت ہے کہ ہر شخص ان سے واقف ہے، پھر بھی مزید توضیح کے لئے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

بادہ، ساغر، ساقی، مُغبچہ، نرگس، سنبل، حریف، میکدہ، پیرِ مغاں، سوسن، بنفشہ، ذرہ، آفتاب، ابرو، چشم، سروِ شمشاد، مژگاں، گیسو، زلف، رخسار، مژہ، عشق، حسن، غمزہ وغیرہ وغیرہ، ان میں ہر ایک بطور علامت استعمال ہوتا ہے اور اپنے ساتھ معنویت کی ایک دنیا رکھتا ہے۔ ذیل میں محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب

آب حیات کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے، اس سے ہمارے قیاس کی توثیق ہو سکے گی :

"رات کو اہلِ محبت کے جلسے میں ساقی کا آنا واجب ہے۔ اس کی پیشانی اور رخسار سے نورِ صبح روشن ہے۔ مگر زلف کی شام بھی برابر مشک افشاں ہے، صراحی کبھی سرکشی کرتی ہے، اس لئے جگر خون ہو کر ٹپکتا ہے کبھی جھکتی ہے اور خندۂ قلقل سے ہنستی ہے، کبھی وہی قل قل حق ہو کر یادِ الٰہی میں صرف ہوتی ہے۔ مگر پیالہ اپنے کھلے منھ سے ہنستا ہے اور اس کے آگے دامن پھیلاتا ہے، فلک، تیر حوادث کا ترکش لئے، کمانِ کہکشاں لگائے کھڑا ہے، مگر عاشق ہما کا تیر آہ اس کے سینے کے پار ہو جاتا ہے، پیر زحل منحوس کی آنکھ نہیں پھوٹتی کہ عاشق کی صبحِ مراد روشن ہو، یہاں کی محفل میں شمع برقع فانوس میں تاج سر پہ رکھے کھڑی ہے۔ اس لئے پروانے کا آنا بھی واجب ہے۔ چراغ کو ہنساتے ہیں اور شمع کو عاشق کے غم میں رلاتے ہیں، وہ باوفا عشق کے غم میں سراپا جلتی ہے، اس کی چربی گھل گھل کر بہتی مگر پائے استقامت اس کا نہیں نلتا۔ یہاں تک کہ سفیدۂ سحر ہی کبھی آکر کافور دیتا ہے اور کبھی طباشیر، شمع کا دل اس لئے بھی گداز ہے کہ شبِ زندگی کا دامن بہت چھوٹا ہے۔ لیکن صبح دونوں کے ماتم گریبان چاک کرتی ہے۔"

کسی شاعر کی کوئی غزل لیجئے، اس میں فارسی غزل کی پوری پیروی ملتی ہے، غالب کے یہاں خصوصیت سے فارسی غزل کی مکمل روایت بڑی آب و تاب کے ساتھ پائی جاتی ہے، حسبِ ذیل غزل بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے :

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے	جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو	عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم	برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کئے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہای شرر بار ہے نفس	مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق	سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل — سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

اس طرح کی غزلوں کو فارسی میں ترجمہ کر دیں، تو ایرانی کے لئے اس سے محظوظ ہونے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا۔

تفصیلات بالا سے بخوبی روشن ہوتا ہے کہ اردو کی ساری ادبی و شعری روایات فارسی ہی سے ماخوذ ہیں، اس سلسلے میں مزید ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

فارسی کی روایت یہ ہے کہ نظرِ بد سے بچنے کے لئے سپند (رائی) جلاتے ہیں اِس روایت کو صدہا شاعروں نے برتا ہے، فارسی کے بہت قدیم شاعروں میں حنظلۂ بادغیسی ہے، اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

یارب سپند اگرچہ بر آتش ہمی فگند — ز بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند

اُو را سپند و مجمر ناید ہمی بکار — با روی ہمچو آتش و با خال چون سپند

ذوق نے سپند کو اس طرح نظم کیا ہے:

میں مجمرِ فنا میں ہوں کیا دانۂ سپند — کھولے ہے کار بستہ کی میری صدا گرہ

آتشِ غم کی روایت اردو میں عام ہے، فارسی کے ایک مشہور شاعر ابوشکور بلخی کا شعر سنیئے:

اگر غم را چو آتش دود بودی — جہاں تاریک بودی جاودانہ

ایرانی روایت میں کاغذی جامہ یا پیرہن کاغذی طلب فریادرسی کی علامت ہے۔

حافظ کہتے ہیں:

کاغذیں جامہ بخوناب بشویم کہ فلک — رہنمونیم بپای علم داد نہ کرد

غالب کہتے ہیں:

پہنے ہے پیرہن کاغذ ابری نیساں — یہ تنک مایہ ہے فریادی بیدادِ بہار

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

تفصیلات بالا سے اردو زبان وادب پر فارسی کے گہرے نفوذ کا بخوبی پتہ چلتا ہے، کوئی شخص جب تک فارسی زبان وادب سے بخوبی واقف نہیں ہوتا اردو کے مسائل سے کماحقہٗ عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ اور جب ہم اپنے ماحول پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں سوائے مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر فارسی کی تعلیمات کی طرف پوری توجہ نہ ہوئی۔ تو اردو کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جائے گا۔ کچھ کم درجہ میں یہی حال یہاں کی دوسری زبانوں کا ہے۔



فارسی کے اثرات ہندوستان کے تمدنی و تہذیبی اُمور پر :

حضرات ! کل کی گفتگو میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندوستانی معاشرت اور ہندوستانی زبانوں پر فارسی نے نہایت دور رس اثرات چھوڑے ہیں جن کے گہرے مطالعہ کے بغیر ہندوستانی معاشرت کی تاریخ اور ہندوستانی زبانوں کا جائزہ نامکمل رہے گا، آج ہندوستان کے بعض تمدنی و تہذیبی اُمور پر فارسی کے اثر و نفوذ کا ذکر کیا جائے گا، یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ موضوع نہایت وسیع ہے، اس لئے اس سلسلے میں محض بعض گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہندوستان میں فارسی کے نفوذ کی ایک زندہ و برجستہ مثال کتبات کی شکل میں ہے، یہ کتبات اس برصغیر کے طول و عرض میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مشکل سے کوئی ایسا خطہ ہوگا جہاں ان کے نشان نہ ہوں، یہ کتبے مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں، مقبروں، چشموں، باغوں، سرائے خانوں، نجی مکانوں، وغیرہ میں ملتے ہیں، جو شمالاً، جنوباً ہمالیہ سے راس کماری تک اور شرقاً و غرباً بنگال و آسام تک، اور پشاور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں ان کتبات کا مطالعہ اور ان سے متعلق معلومات بہم پہنچانا

حکومتِ ہند کے محکمۂ باستان شناسی کی ذمّہ داری ہے، اِس محکمہ کا ایک شعبہ کتبات شناسی کا ہے، جس کی توجہ کا مرکز یہی کتبات ہیں، لیکن اتنے عظیم کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے منصوبہ بندی ہونا چاہیئے اور ملک کے دوسرے اداروں اور دانش گاہوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے۔ اِس طرح جب ایک مدت میں اس سلسلے کا کام مکمل ہو جائے گا، تو اس سے ایک طرف ہندوستان کی سیاسی و تمدّنی تاریخ میں زبردست اضافے کی توقع ہے۔ دوسری طرف فارسی زبان کے غیر معمولی اثرات کا پتہ چلے گا۔

اِس میں شبہہ نہیں کہ سرسید کی "آثار الصنادید"۔ علی اصغر حکمت کی کتاب، نُقش پارسی بر احجار ہند، Epigraphiea 9ndo Moslemiec کے مختلف شماروں وغیرہ میں جو مواد جمع ہو چکا ہے، اِس سے ان کتبات کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے لیکن جیسا کہ عرض ہو چکا ہے، جو کچھ ابھی تک ہوا ہے، وہ بکھرے ہوئے مواد کا ایک حقیر حصّہ ہے۔ علی اصغر حکمت صاحب نے لکھا ہے: "کلمات و عبارات فارسی کہ منقوش بر چہرۂ سنگہا در خسارا احجار است، و در طول و عرض این شبہ قارۂ وسیع پراگندہ می باشد از حد شمار و حساب بیرون است و احصار، دقیق و ثبت و ضبط آنہا محتاج بوقتی موسع و خاطری آسودہ و سفر ہا در اطراف آن کشور می باشد کہ متاسفانہ این مقدمات برای کاتب این سطور فراہم نیست۔"

علی اصغر حکمت صاحب کے تحت الشعور میں یہ بات ہے کہ ایک یا دو آدمی کے ذریعے اس کام کی تکمیل ہو سکتی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ کام افراد کے بس کی بات نہیں، اداروں کے توسط سے واضح منصوبہ بندی کے پیش نظر اس بڑے کام کی بجا آوری ممکن ہو سکتی ہے:

گمان مبر کہ بپایان رسید کار مغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگِ تاک است

ہندوستان میں جو فارسی کے کتبات نظم و نثر میں ہیں، ان کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) وہ کتبے جو بادشاہوں کے محلوں وغیرہ میں ہیں، یہ اکثر منظوم و منثور قطعات

کی شکل میں ہیں، جن میں عموماً مادۂ تاریخی بھی پایا جاتا ہے۔

(۲) وہ کتبے جو مسجدوں، مدرسوں، اولیاء و بزرگان دین کے مزاروں اور خانقاہوں سے متعلق ہیں، جن میں آیات قرآنی و احادیث نبوی، عبارات و اشعار فارسی پائے جاتے ہیں اور جو عام طور پر مادۂ تاریخ کے حامل ہوتے ہیں۔

(۳) وہ کتبے جو پلوں، بازاروں، چشموں، کنوؤں وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

(۴) وہ کتبے جو بادشاہوں، امیروں، وزیروں، شاعروں اور دوسرے لوگوں کے مزاروں میں ملتے ہیں۔

ہندوستان میں اسلامی دور کی ابتدائی دو صدیوں تک اکثر کتبے عربی میں ہیں، لیکن ساتویں صدی ہجری سے فارسی کتبوں کی اکثریت ملتی ہے۔ رفتہ رفتہ عربی کتبے کم ہوتے جاتے ہیں، مغل دور کے تقریباً سبھی کتبے فارسی زبان میں ہیں، اسی طرح شروع کے فارسی کتبات میں نثری عنصر غالب ہے لیکن تدریجاً کتبات میں شعر کا عنصر غالب ہو جاتا ہے۔

کچھ دنوں پہلے تک کی تحقیق کے اعتبار سے سب سے قدیم اسلامی کتبہ عربی زبان اور کوفی خط میں ہے۔ یہ دریائے سندھ کے کنارے ایک قدیم قریہ "ہوند" کے کنویں کی ایک دیوار میں نصب تھا، ۱۸۹۳ء میں یہ کتبہ کشف ہوا اور ۱۹۱۲ء میں پشاور کے میوزیم میں منتقل ہو گیا، یہ کتبہ ۲۸۲ھ ہجری کا ہے۔ اور ایک کنویں کی تعمیر سے متعلق ہے جس کو ابوجعفر محمد بن عبدالجبار بن جونجانی نے سال مذکور میں بنوایا تھا۔ بہرحال چوتھی صدی کے بعد کے متعدد کتبے ہندوستان میں باقی رہ گئے ہیں، جو عربی زبان میں ہیں اور کوفی، ثلث، نسخ خطوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اب اس سے ایک قدیم کتبہ سندھ کے اطراف میں برآمد ہوا ہے، جو دوسری صدی ہجری کا بتایا جاتا ہے۔

فارسی کا قدیم ترین کتبہ مسجد قوۃ الاسلام دہلی میں ہے، جو ۵۸۷ ہجری میں تعمیر ہوئی۔ واضح رہے کہ یہ کتبہ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی سے ۱۵ سال قبل کا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"این حصار را فتح کرد و این مسجد جامع را بساخت بتاریخ فی شہور سنہ سبع و ثمانین و خمسمأ امیر اسفہسالار اجل کبیر قطب الدولت والدین

امیر الامرا، ایبک سلطانی اعزہ اللہ انصارہٗ ببیست و ہفت[۲] بت - بتخانہ کی در ہر بتخانہ کی دو بار ہزار و ار ہزار دیوال صرف شدہ بود درین مسجد بکار بستہ شدہ است خدای عزوجل بر آن بندہ رحمت کناد ہر کہ بر نیت بانی خیر دعای ایمان گوید۔"

اس مسجد میں دو چھوٹے کتبے اس طرح کے ہیں:

(۱) این منارہ فضل ابو المعالی ......

(۲) این مسجد را بنیاد کرد قطب الدین ایبک، خدای بر آن بندہ رحمت کناد ہر کی بانی این خیر را دعای ایمان گوید۔

(۲)۔ لال قلعہ کے میوزیم میں کسی قدیم قبر کا ایک پتھر ہے۔ اس پر ۶۰۸ ہجری کا ایک عربی کتبہ ہے، اس کے نیچے فارسی کی یہ عبارت ہے:

"بندہ بر آمدہ کرد .. بقعہ بر سد قطب الدین ایبک را دعا گوید"

ممکن ہے کہ اس پتھر کا تعلق قطب الدین ایبک کی قبر سے ہو اس لئے کہ اس کی وفات ۶۰۷ ہجری میں ہوئی اور قبر کا مذکورہ بالا کتبہ ۶۰۸ ہجری میں مرتب ہوا۔

(۳) تیسرا قدیم کتبہ بدایوں میں شیخ احمد خنداں کے مقبرے میں ہے جس کی حسب ذیل عبارت پڑھی جا سکی ہے، جس میں تاریخ ۶۸۳ شامل ہے۔

"بیامرزاد کی بندہ تیکین بانی این خیر را بدعائے رحمت مدد نماید و کتب فی الغرۃ من رمضان سنۃ ثلث وثمانین وستمأۃ"

بظاہر تیکین سے مراد غیاث الدین بلبن کے دور کے ایک امیر جمال الدین اتیکین سے ہے، جو بلبن کے حکم سے ۶۸۱ ہجری میں مقتول ہوا۔

(۴) قصبہ کھمبایت (گجرات) کے ناحیہ کیرا میں ایک مقبرہ پرواز شاہ کے نام سے منسوب ہے۔ اس قبر کی دیوار میں دوسری قبروں کے پتھر نصب کر دیئے گئے ہیں، ان میں سے ایک پتھر زین الدین علی بن سالار ابن علی یزدی نام کسی شخص کا لوح مزار ہے، جس کی وفات ۶۸۵ ہجری میں ہوئی تھی۔ اس لوح میں پہلے حسب ذیل فارسی غزل

مندرج ہے :

مقصد جان رو نمود جان بمیان گو مباش
دل چو ہمہ حال گشت قال لسان گو مباش

بی مدد صوت و حرف کشف شد اسرار غیب
کام و زبان گو بریز شرح و زبان گو مباش

از صدف تن چو یافت جان گہر سر عشق
در ہمہ جا از صدف نام و نشان گو مباش

چون لب جان نوش کرد جرعۂ جام بقا
منزل دار فنا در رہ آن گو مباش

از سقر و جنت است خوف و امان ہمہ
ما چو از آن فارغیم خوف و امان گو مباش

مایۂ سود و زیان دنیا و عقبای تست
ہر دو چو در باختی سود و زیان گو مباش

روح چون از باغ عشق نو بر وحدت گرفت
ابر یقین گو مبار گشت گمان گو مباش

چونکہ فرود آمدیم در حرم کبریا
شہپر روح الامین جلوہ کنان گو مباش

زبدۂ ہر دو جہان نقد حیات ہمہ است
تنگ در آغوش ما ہر دو جہان گو مباش

ذات تو سالار یا روح مکانست و کون
دور زمان گو گرد کون و مکان گو مباش

اس کے نیچے درمیان میں حسب ذیل عربی کی عبارت اور دائیں بائیں دو رباعیاں ہیں :

"ھذا قبر الصدر الکبیر المرحوم سلطان المحققین زین الملۃ والحق والدین علی بن سالار بن علی الیزدی متوفی فی یوم الاحد الثالث عشرین ذی الحجۃ سنۃ خمسین وثمانین وستمائۃ ۶۸۵"

دائیں جانب کی رباعی کے چند الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں :

.... دل ماست	... مکان و لامکان منزل ماست
.... مو الید فلک	.... جملگی حاصل ماست

بائیں جانب کی رباعی یہ ہے :

ما بہر نظام کائنات آمدہ ایم	باذات قدیم در صفات آمدہ ایم
نور ہمہ نور سایہ، سایۂ ماست	تو سایہ مبین کہ ما بذات آمدہ ایم

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی اور آقای علی اصغر حکمت نے ان اشعار کو زین الدین علی بن سالار بن علی یزدی کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن چونکہ غزل مذکور میں "سالار یا" آیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ شاعر کا تخلص سالاری ہے۔ اور جب تک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ زین الدین علی کا تخلص سالاری تھا۔ اس وقت تک اس منظومہ کا انتساب اس کی طرف مشکوک رہے گا، زین الدین علی کے باپ کا نام سالار تھا، اس بنا پر آخر الذکر کا تخلص سالاری زیادہ قرین قیاس ہوگا۔ بنا بریں اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ غزل باپ کی ہو، بیٹے کی نہ ہو۔

بہر حال غزل باپ کی ہو یا بیٹے کی، شعری اعتبار سے یہ کوئی بلند پایہ نظم نہیں، لیکن ۶۸۵ ہجری کے قبل کی تصنیف ہونے کی بنا پر اس کی اہمیت مسلم ہے۔ سالاری سعدی کا معاصر تھا، گجرات کے دور دراز کے علاقے میں سعدی کے معاصر کی یہ غزل تاریخی اعتبار سے نہایت اہم ہے :

(۵) دکن کے کتبات میں ایک نثری کتبہ ہے، جو گلبرگہ ضلع کے گوگی نام کے مقام پر پایا جاتا ہے، یہ کتبہ ایک پتھر پہ ہے۔ جس کے بعض حصے ضائع ہو چکے ہیں۔ باقی حصہ

فی الحال وہاں کی مسجد میں نصب ہے کتبۂ مذکور ایک قلعہ کی بنیاد کی تاریخ کا حامل ہے جو استاد آباد نام کے شہر میں ۷۳۸ ہجری میں محمد بن تغلقشاہ کے عہد میں خان اعظم خاقان معظم قتلغ خاں کے توسط سے تعمیر ہوا تھا، ڈاکٹر غلام یزدانی کے اعتنا ء سے یہ کتبہ Epigraphica Indo Moslemica ۱۹۳۱-۳۲، میں شائع ہو چکا ہے، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

(۱) "حصن حصین و سنگر متین مرخدا یرا کے در عہد پادشاہ آفتاب آثار و ماہ انوار و زحل اقتدار و عطارد شعار قطب فلک مملکت .... [محمد] بن تغلقشاہ السّلطان شید اللہ ...... دولتہ بتوالہ توفیق بنا رحصار حطۂ استاد آباد کے کوکبۂ کنگرہ بلند او بابرج فلک

(۲) ہم پہلوست و برج باثبات او باسیارات گردون وہم بازو بجبل کوہی است کہ تیغ خورشید کمر گیر ...... آب دریا رفعت و اساس خاک ریز .... دروازۂ او مفتاح ابواب جنان[1] بارہ کے دریاب بانے او معمار

(۳) "قلعۂ دین وایمان فرمود من بنی حصنا الاسلام بنی اللہ لہ قصرا .... [خا]ن اعظم خاقان معظم ..... معالیا و جعل لہ الکرام موالیا گردانید بتاریخ الغرۃ

(۴) من ذی الحجہ سنہ ثمان وثلاثین وسبعمائۃ بکار فرمائی ضیا .... خطۂ مذکورہ مدت اعمار ہا عمارت شد۔

---

[1] و بمجرد وصول ملاقات و حصول سعادات تفقد فراوان فرمود ...... بر زبان مبارک راند : اگر اتفاق عزیمت استاد آباد مصمم شود محض خیر باشد ...... چون روز دیگر طرف استاد آباد کہ مستقر دولت ادست الشمس تجری لمستقر خرامید ... بندہ چون عطارد تحت الشعاع شمسی در آمد ...... چون شاگردان مجردوی با ستاد آباد نہاد۔

بظاہر قریۂ گوگی قبلاً اُستادآباد کے نام سے مشہور تھا، ڈاکٹر غلام یزدانی دبے لفظوں میں لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی واضح طور پر اس نظریئے کے قائل ہیں، راقم حروف کو ایک مدت سے شہر استادآباد کے وجود وجائے وقوع کے بارے میں تلاش تھی اس لئے کہ حاجب خیرات دہلوی کی دستورالافاضل اسی شہر میں ۷۴۳ ہجری میں مرتب ہوئی تھی؛ میرا قیاس یہی تھا کہ یہ شہر دکن میں رہا ہوگا اس لئے کہ اس شہر میں پہنچنے کے قبل وہ قصبہ ابیر میں رہ چکا تھا اور آج تک اس آخری قصبہ کا مجلّہ موجود ہے۔ بہرحال اس کتبے کی وجہ سے میری ایک ذاتی مشکل حل ہوگی۔

اسی درمیان ڈاکٹر ڈیسائی نے مجھے ایک ایسے کتبے کی طرف رہنمائی کی جو احمد بن علی چچنیری کے توسط سے ۷۲۶ ہجری میں مرتب ہوا تھا، یہ کتبہ ایک مسجد سے متعلق تھا جس کی تعمیر سال مذکور میں ہوئی تھی، یہ بھی عجب حسن اتفاق ہے کہ احمد بن علی چچنیری کا تعلق اس لحاظ سے حاجب خیرات دہلوی مؤلف دستورالافاضل سے یہ ہے کہ آخرالذکر نے اپنی فرہنگ استادآباد کے صدر شمس الدین محمد کے نام پر لکھی اور خود حاجب خیرات کی صراحت[۱] کے بموجب شمس الدین محمد احمد بن علی چچنیری کا بیٹا تھا۔ چونکہ حاجب خیرات کی فرہنگ ۷۴۳ھ میں مرتب ہوئی اور احمد بن علی چچنیری ۷۲۶ھ میں بقید حیات تھا، اس لئے تاریخی اعتبار سے آخرالذکر کا شمس الدین محمد ممدوح حاجب خیرات کے باپ ہونے میں کوئی امر مانع نہیں؛ ان وجوہ کی بنا پر میرا خیال یہی ہے کہ احمد بن علی چچنیری جس نے ۷۲۶ ہجری میں مسجد بنائی تھی، اور مندرجہ ذیل کتبہ لکھوایا تھا، وہ شمس الدین محمد صدر اُستادآباد کا باپ تھا، یہ کتبہ عربی میں ہے، لیکن اس کے آخر میں ایک بیت فارسی میں ہے:

(۱) یا اللہ امر ھذہ العمارۃ المسجد المبارکۃ المیمونۃ الشریفۃ

فی عہدِ سلطانِ السلاطین

---

[۱] حاجب خیرات لکھتا ہے: "شمس الدولہ والدین عزالاسلام والمسلمین .... قرۃ عین الوزراء المتقدمین، ضیاء الملوک والسلاطین مخصوص لعنایت بادی محمد احمد چچنیری ...

گوہر پاکِ احمد بن علی
صدر آفاق شمس دولت و دیں

(۲) یا اللہ ظل اللہ فی العالمین ابو المجاہد فی سبیل اللہ محمد بن تغلقشاہ

(۳) یا اللہ السلطان خلد اللہ ملکہ وسلطانہ واعلیٰ امرہ وشانہٗ و درنوبت اقطاع ملک

(۴) یا اللہ الشرق قوام الدولۃ والدین وزیر اقلیم دیوگیر مکنہ اللہ بندہ الضعیف الراجی الی رحمۃ

(۵) یا اللہ تعالیٰ والغفران احمد علی ججنیری بتاریخ الغرۃ من صفر ختم اللہ بالخیر والظفر سنۃ ست وعشرین وسبعمائۃ

قطعہ

ہستی ہمہ در راہ تو خواہم کردن
آنرا کہ تو ہستی چہ کم آید ہستی

اس طرح کا کم اتفاق ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک سلسلے کے چند مسائل ایسی آسانی سے حل ہو جائیں جس طرح اس موقع پر ہوا کہ میرے مطالعے کی دو اہم گتھیاں ایک ہی ساتھ سلجھ گئیں، استاد آباد کی جائے وقوع کا تعین ایک کتبے سے ہو گیا اور دوسرے کتبے سے احمد بن علی ججنیری کی شخصیت متعین ہو گئی۔ ان دونوں کتبوں کو جو دو مختلف جگہوں پر موجود ہیں اور دو الگ موقعوں پر لکھے گئے، ایک دوسرے سے بظاہر کوئی ربط نہ تھا، لیکن دستور الافاضل کی صراحت سے ان دونوں کے درمیان ربط بھی قائم ہو گیا اور دیگر مسائل بھی حل ہو گئے۔

ہندوستان میں جو کتبات پائے جاتے ہیں، ان کا مطالعہ چند در چند وجوہ سے نہایت اہم ہے، مثلاً:

(۱) ہندوستان کی سیاسی و تمدنی تاریخ پر اس سے بڑی روشنی پڑتی ہے۔ بادشاہوں وزیروں، امیروں، عارفوں، صوفیوں، عالموں، اور دوسرے ایسے اشخاص جو زندگی کے شعبے میں ممتاز رہ چکے ہیں، ان کی تاریخ وفات اور بعض صورتوں میں تاریخ پیدائش

کتبات سے فراہم ہو جاتی ہے۔ ان میں بعض تاریخی شخصیات کے متعلق جو مواد کتابوں میں درج ہوتا ہے، اس کا مقابلہ اِس نئے مواد سے کیا جا سکتا ہے جس کی صحت و صداقت کے بارے میں شبہ کی گنجائش کم ہوتی ہے۔

(۲) جب تک ان تاریخی ابنیہ وغیرہ کا وجود باقی ہے، فارسی زبان کا اثر واضح سے واضح تر ہوتا رہے گا، یہ کتبات نقش کالحجر نہیں، بلکہ واقعی نقش بر حجر ہیں اور اس اعتبار سے ڈاکٹر علی اصغر حکمت کی کتاب کا عنوان نقش پارسی بر احجارِ ہند بڑا معنی خیز ہے۔ یہ عنوان فارسی کے گہرے اور نہ مٹنے والے اثر پر دلالت کرتا ہے۔

(۳) یہ کتبے محض ان عمارتوں پر نہیں، جو مسلمانوں سے منسوب ہیں بلکہ ایسی عمارتوں پر بھی کندہ ہیں، جو ہندوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اِس سلسلے کی چند مثالیں یہ ہیں :-

(الف) راجہ مان سنگھ، پسر راجہ بھگوان داس نے قلعۂ رھتاس میں ایک حرمسرا تعمیر کی تھی، اس کے دروازہ پر ایک فارسی قطعہ ہے، جو دروازہ کی تاریخ کا حامل ہے:

"دروازۂ مقیم بنای چو شد تمام ۔۔۔ دروازۂ سپہر ز رشکش سقیم شد
سال عمارتش چو نمودم بطبع گفت ۔۔۔ از راجہ مان سینگ بنای مقیم شد"

تحریرًا فی تاریخ بیست و ہشتم شہر رجب المرجب سنہ ہزار و پنج ہجری۔

(ب) جے پور کے والیان کا پایۂ تخت امیر تھا۔ وہاں کا قدیمی محل ہندوستانی معماری کا نفیس نمونہ ہے، یہ محل ۱۰۰۸ ہجری میں ۲۵ سال کے طویل عرصے میں مکمل ہوا تھا، اس میں حسب ذیل کتبہ پایا جاتا ہے، جس سے محل کی تاریخ بنا واضح ہوتی ہے:

"در عہد شہنشاہ سلاطین نشان جلال الدنیا والدین محمد اکبر پادشاہ خلد اللہ ملکہٗ، بام عالی بانی قصر سلطنت و کامرانی انوشیروان ثانی مہاراج مان سینگ این مہاراج ...... خلد اللہ اقبالہ، بتاریخ شہر ذی حجہ سنہ ہزار و ہشت این بنای جنت مثال در مدت بیست و پنج سال در نہایت اھتمام زینت اتمام و زیب اختتام یافت بالخیر والاقبال"

ہمیشہ تا کہ بنای فلک بود بادا　　　بنای دولت عمر تو از خلل خالی

تمت فی سنۃ ۱۲۰۸ھ"

یہ روایت حال تک جاری ہے، دورِ حاضر میں بعض ہندوؤں کے مکانات فارسی اشعار سے مزین ہیں، لکھنؤ میں ایک بزرگ کا مکان ہے۔ محلہ رکاب گنج سے کچھ آگے ریلوے لائن سے ملحق پورب طرف واقع ہے، اس کے دروازہ پر حافظ کا یہ مشہور شعر کندہ ہے:

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف است
با دوستان مروت، با دشمنان مدارا

ہندوؤں کی بعض مذہبی عمارتوں میں بھی فارسی کتبات خال خال مل جاتے ہیں، نقش پارسی بر احجار ہند میں مرقوم ہے:

"بعضی از این کتیبہ ہای مذہبی کہ خیلی نادر ولی جالب توجہ اند، عبارتست از چند کتیبہ ہای ابنیۂ مذہبی ہندو کہ مربوط بمعابد ہنود می باشد ولی بخط و زبان فارسی نوشتہ شدہ مانند کتیبۂ شاہ عالم دوم (۱۱۷۸ھ) راجع بہ اورنگاہ مانند معبد شیوا در شہر متھرا کہ در سالی ۱۲۲۲ھ ساختہ شدہ و ہر دو دارای کتیبۂ فارسی می باشند"

یقین ہے کہ دقیق تحقیق سے مزید ایسی مذہبی عمارتیں نکلیں گی، جو فارسی کتبوں سے مزین ہوں گی۔

اس سلسلے میں ان کثیر فارسی وقف ناموں، شاہی فرمانوں وغیرہ کا ذکر بیجا نہ ہوگا جو ان مندروں اور دوسری ہندو مذہبی عمارتوں کے نام مسلمان فرماں رواؤں کی طرف سے جاری کئے گئے تھے۔

(۴) خود ایران میں جو فارسی کا اصل وطن ہے، فارسی کے اتنے کتبات موجود نہیں، وجہ ظاہر ہے کہ وہاں اتنی آبادی نہیں، اسی بنا پر اتنی عمارتوں کی ضرورت نہیں، ثانیاً پرانے تہذیبی مراکز ایسے ویران ہوئے کہ ان میں سے بعض کا نام و نشان تک مٹ گیا، نہ ان میں مقبروں کا پتہ ہے، نہ مسجدوں، خانقاہوں اور دوسری عمارتوں کا، اس سلسلے میں

سب سے زیادہ نمایاں نام طوس کا ہے، ایرانی تاریخ کے طالب علم اس شہر کی عظمت سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن اب اس شہر کا کوئی نشان باقی نہیں۔ حال ہی میں فردوسی کا مزار یہاں درست کیا گیا ہے، جس پر کوئی قدیمی کتبہ موجود نہیں۔ ادھر امام غزالی کے مزار کی درستگی کا خیال پیدا ہوا۔ فردوسی کے مزار کو جاتے ہوئے سڑک کے پچھم طرف ایک پرانی عمارت میں قبر کا ایک پتھر نصب کیا گیا، جو امام غزالی کی طرف منسوب ہوا۔ لیکن مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ کسی دوسرے شخص کا سنگ مزار ہے۔ دوسری مثال شہر رے کی ہے، یہ شہر سیاسی و تمدنی اہمیت کے لحاظ سے بے نظیر سمجھا جاتا ہے، لیکن اب بالکل ویران ہو چکا ہے اور تہران کی آبادی میں شامل ہو گیا ہے، یہاں حضرت عبدالعظیم کا مزار ہے اس کے علاوہ کوئی تاریخی عمارت باقی نہیں، ادھر تحقیق ہوئی تو بعض آثار کا پتہ چلا ہے، جو ایک کتابی شکل میں مدون ہو چکے ہیں۔ تیسری مثال نیشاپور کی ہے، یہ شہر جو اسلامی دور میں عظیم سیاسی و علمی مرکز تھا اب ایک چھوٹے قصبے کی شکل میں باقی ہے، یہاں دو بڑی نامور شخصیتوں کے مزار درست کر لئے گئے۔ ایک عمر خیام اور دوسرا عطار کا۔ خیام کے مزار کے سلسلے میں کوئی قدیم سند نہیں، البتہ عطار کے مزار کا کتبہ نویں صدی ہجری میں تیموری شاہزادے بایسنقر مرزا کا تعمیر کردہ ہے۔

بہرحال اس ضمنی گفتگو سے ظاہر ہے کہ ایران میں نہ کتبات اتنی کثرت سے باقی ہیں اور نہ ان میں اتنا تنوع ہے۔ گویا اس اعتبار سے فارسی اپنے وطن میں اتنی دخیل نہیں جتنی ہندوستان میں۔

(۵) نثری کتبات محض تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، لیکن شعری کتبات کی ادبی اہمیت بھی مسلم ہے۔ یہ سارا مواد اس لحاظ سے اچھوتا ہے کہ ان کے دوسرے نقش کا تصور نہیں ہو سکتا، اس میں شبہ نہیں کہ خال خال ایسے کتبات مل جاتے ہیں، جن میں مشہور فارسی شعراء حافظ، سعدی، خیام، عطار، کاتبی وغیرہ کے اشعار شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن غالب حصہ نئے کلام کا حامل ہے۔ یہ مواد اتنی کثرت میں ہے کہ اگر یہ سارا مواد اکٹھا ہو جائے تو کئی ضخیم مجلدات کو حاوی ہو گا، مشکل سے کسی زبان میں کتباتی کلام اتنی وافر تعداد میں دستیاب ہو گا۔

ممکن ہے خالص ادبی لحاظ سے اس کا پایہ اتنا بلند نہ ہو۔ لیکن یہ مواد اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس کے ذریعے سیکڑوں ایسے شاعروں اور ان کے کلام تک رسائی ہوتی ہے جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعر شعری اعتبار سے قابلِ توجہ نہ بھی ہوں، لیکن ادبی تاریخ میں ان کے ضمنی شمول کے بغیر تاریخ نامکمل رہتی ہے، اسی بنا پر وہ نظر انداز ہونے کے قابل نہیں، ہندوستانی فارسی کی ادبی تاریخ اس لحاظ سے ناقص ہے کہ اس میں کتبات میں شامل اشعار اور ان کے مصنفین سے متعلق کوئی یادداشت درج نہیں ہوئی ہے۔

ہندوستان میں فارسی زبان کے تسلط کا زمانہ چھ سو سال سے زائد رہا ہے، اس طویل مدت میں یہ زبان یہاں کی سرکاری اور تہذیبی زبان رہی ہے۔ اس کی بناء پر سارے سرکاری و غیر سرکاری کاروبار اسی زبان کے ذریعہ انجام پاتے رہے، اس کے نتیجے میں لاتعداد فرامین، دستاویزیں، پروانے، رقعے، خطوط اور آرکایوز سے متعلق دوسرے مواد یہاں موجود ہیں، ان کی جمع آوری اور ان کے متعلق یادداشت تیار کرنے کے لئے مختلف ریاستوں میں ریکارڈ آفس اور مرکز میں نیشنل آرکایوز اور انڈین ریکارڈس کمیشن موجود ہیں۔ لیکن ان ریکارڈس کی فراہمی کا کام ہندوستان میں دیر سے شروع ہوا۔ اس کے نتیجے میں قدیم مواد یکسر تلف ہو گیا عہدِ مغلیہ کے قبل کا مواد بالکل نہیں ملتا، لیکن مغلیہ دور اور اس کے بعد کا وافر مواد ادھر ادھر منتشر ہے، اگر یہ سارا مواد جمع ہو جائے، تو کئی کتب خانے تیار ہو سکتے ہیں، جن کے متعلق یادداشت کے لئے سیکڑوں مجلدات درکار ہوں گی، ادھر نیشنل آرکایوز کی طرف سے انیسویں (19) صدی کے کارپوز کے بارے میں بیس (20) مجلدات شائع ہو چکے ہیں اور نہ جانے کتنے مجلدات کی تیاری ہو رہی ہے۔ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک اسکیم کے تحت اورنگ زیب کے دربار کے اخباری مراسلے جو امیر کے وکیل کے ذریعے بھیجے گئے تھے زیرِ ترتیب ہیں، ان اخبارات کے دو مجموعے موجود ہیں، ایک ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتابخانے میں اور دوسرا راجستھان آرکایوز بیکانیر میں، اول الذکر مجموعے کی تقریباً چار ہزار اور آخر الذکر کی دو ہزار شیٹیں ہیں، اس طرح کے سیکڑوں ہزاروں مجموعے ہوں گے جنکی فراہمی ایک طویل مدت اور بڑے عملے کی متقاضی ہے۔

ہندوستان کے سلاطین اور دوسرے بیرونی سلاطین سے خط وکتابت کے پچاسوں مجموعے ہندوستان کے مختلف کتابخانوں میں محفوظ ہیں۔ اِن کی اشاعت اور ان سے استفادہ ہندوستان کی سیاسی وتمدنی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ابھی تک ان سے بجا طور پر استفادہ نہیں ہوا ہے اس لئے ہندوستان کی تاریخ کا یہ اہم گوشہ پوری طرح روشن نہیں ہوسکا؛ حال ہی میں راقم نے چند ایسے خطوط کو شائع کیا ہے، جو دکنی سلاطین نے شاہ عبّاس کو لکھے تھے اور جن میں جہانگیر بادشاہ کے خلاف زبردست شکایت لکھی تھی، ان میں سے ایک خط کی روشنی میں جو ابراہیم عادل شاہ کی طرف سے شاہ عباس کی خدمت میں شاہ خلیل اللہ کی معرفت روانہ کیا گیا تھا، بعض امور کی وضاحت کی تھی، اِن سے دکنی سلاطین اور مغل بادشاہ کے تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

اس ضمن میں ایک قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ایسے متعدد شاہی فرمان دستیاب ہوتے ہیں۔ جو ہندوؤں کے مذہبی عبادت خانوں کے مصارف کی کفالت وغیرہ کے متعلق جاری ہوئے تھے، ان فرامین میں اورنگ زیب کے جاری کردہ فرمان بھی شامل ہیں۔ بمبئی کے ایک دانشمند جناب جین چندلا نے گزشتہ چند سالوں میں اس سلسلے میں کافی دلچسپ مواد فراہم کیا ہے، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل ج ۵ شمارہ ۴ میں انھوں نے اورنگ زیب کے دس ایسے فرمان کی نشاندہی کی ہے جو ہندو مندروں کے نام اورنگزیب کے جاری کئے ہوئے ہیں۔ اسی جرنل کی چھٹی جلد حصّہ اوّل میں موصوف نے اسی بادشاہ کے زمانے کے تیرہ پروانے اور سندیں شائع کی ہیں، جو مالوہ کے صوبہ داروں کی طرف سے جاری ہوئے تھے، یہ پروانے اجین کے ایک برہمن خاندان کی کفالت کی غرض سے لکھے گئے تھے، اسی خاندان کے لوگ آج تک اجین کے مہا کالیشور مندر کے پجاری ہیں؛ اِن پروانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجابت خاں صوبے دار مالوہ نے اورنگ زیب کے ساتویں سال جلوس میں کوکا نامی ایک برہمن کی روزمرہ ضروریات کے لئے تین مرادی ٹنکہ یومیہ منظور کئے تھے۔ دس سال بعد کوکا فوت ہوا، تو یہی رقم اس کے بیٹے کانجی کے لئے بحال ہوئی، اُنیسویں سال جلوس میں یہ رقم چار آنہ یومیہ کردی گئی، مگر اس کے

وارث اس تبدیلی پر رضامند نہ ہوئے اور یہ رقم تین مرادی ٹنکہ یومیہ ہی رہی یا خان زمان صوبیدار مالوہ نے کچھ دنوں بعد چار آنہ یومیہ کر دیا اور اس طرح یہی رقم بحال رہی، دو اور سندوں سے پتہ چلتا ہے کہ کانجی کو ہر خریف کے موقع پر ساٹھ روپے سرکاری خزانے سے بطور خیرات ملتے تھے۔

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل کی جلد ششم کے دوسرے شمارہ میں جلن چندر صاحب نے دو مزید پروانے شائع کئے ہیں، یہ دونوں پروانے ایک مٹھ سے تعلق رکھتے ہیں، اس مٹھ کی پانچ حویلیاں بنارس کے جنگم باڑی علاقے میں تھیں، ان کا کرایہ پانچ سو روپیہ مقرر کر کے یہ رقم بیت المال میں داخل کر دی گئی۔ مٹھ کے سنیاسیوں نے اورنگ زیب کے دربار میں حاضری دی اور بادشاہ سے فریاد رسی کی، بادشاہ ان سے متاثر ہوا اور اس نے یہ معاملہ اقضی القضاۃ قاضی عبدالوہاب کے سپرد کیا، قاضی مذکور نے اس معاملہ کی پوری تحقیقات کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حویلیاں سنیاسیوں کے حوالے کر دی گئیں اور پانچسو روپے کے کرایہ کی رقم جو بیت المال میں داخل کر دی گئی تھی سنیاسیوں کو واپس کی گئی۔

اس طرح کی لاکھوں سندیں اور پروانے ادھر ادھر منتشر ہوں گے۔ ان کی فراہمی اور بازیابی ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی صحت کی ضمانت ہوگی اور ضمناً یہ بھی معلوم ہوگا کہ فارسی زبان نے ہندوستان کی سیاسی و تمدنی زندگی پر کتنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

آرکائیوز سے متعلق مواد کی کثرت کے اعتبار سے ہندوستان کا پلہ خود فارسی کے اپنے وطن ایران سے کہیں بھاری ہے۔ یہ انکشاف اپنی جگہ پر نہایت درجہ قابل لحاظ ہے۔

ہندوستان میں فارسی کے غیر معمولی نفوذ کی ایک برجستہ مثال یہاں کے کتبخانے پیش کرتے ہیں، ان میں ہزارہا فارسی قلمی کتابیں موجود ہیں، ان میں خاصی تعداد ایسے مصنّفین کی ہیں، جو ہندوستانی تھے، کچھ کتابیں ہندوستانی خطاط کے قلم کی یادگار ہیں اور خاصی تعداد میں غیر ہندوستانی مصنّفین کی تالیفیں اور غیر ہندی کاتبوں کے تراوش خامہ

کا نتیجہ ہیں۔ پٹنہ، کلکتہ، رام پور، علی گڑھ، حیدرآباد، بمبئی، مدراس کے کتابخانے فارسی مخطوطات کے اعتبار سے عالمگیر شہرت کے مالک ہیں، اِن میں بعض ایسا بیش قیمت مواد موجود ہے، جو دنیا کے کسی کتابخانے میں نہیں پایا جاتا۔ پھر مخطوطات کی کثرت کے اعتبار سے ہندوستان علمی دنیا میں اہم مقام کا مالک ہے، کیونکہ بہرحال معلوم ہے کہ جس طرح مطبوعہ کتاب کی سب سے اہم خصوصیت ایک مرتبہ کی چھپی ہوئی کتابوں کی بالکلیہ یکسانی ہے، اسی طرح مخطوطہ کی سب سے قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ہر مخطوطہ دوسرے مخطوطے سے مختلف ضرور ہوتا ہے خواہ کاتب اور منقول عنہ دونوں ایک ہی ہوں؛ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہر مخطوطہ خواہ کیسے ہی درجے کا ہو، ایسے مواد کا حامل ہوتا ہے، جو دوسرے مخطوطے کے ذریعے نہیں مل سکتا، بالفاظ دیگر یہ بات واضح ہے کہ ہندوستان کے بیش قیمت مطبوعات کے علاوہ یہاں کے کثیر مخطوطات اہم تحقیقی مواد کے حامل ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے عمومی کتابخانوں کے علاوہ صدہا نجی کتابخانے ہیں جن میں نہ جانے کتنی قیمتی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں فارسی کے جتنے مخطوطات ہیں وہ تعداد میں ایران سے کم نہ ہوں گے اور شاید یہاں کی کسی زبان میں اتنے متنوع قسم کے مخطوطے نہ ہوں جتنے کہ فارسی میں ہیں، یہ فارسی کے نفوذ کی زندہ مثال ہے۔

ہندوستان میں فارسی کی کتابوں کے چھاپنے کا کام بھی بڑی توجہ سے ہوا، نولکشور پریس نے اس ضمن میں جو کام کیا ہے، اس کی مثال ایران میں بھی نہیں ملتی اور اس حقیقی امر کا اعتراف کہ اگر یہ پریس فارسی کی کتابیں چھاپ کر عام نہ کر دیتا تو ہزارہا کتابیں تلف ہو گئی ہوتیں، اس کا اعتراف سارے ایرانی دانشور کرتے ہیں؛ کسی کتابخانے میں جائیے آپ کو نول کشور کی مطبوعہ کتابیں ضرور ملیں گی۔ اس شاندار خدمت کی وجہ سے نولکشور کی ذات علمی دنیا میں غیر فانی ہو گئی اور اسی کی بناء پر ہندوستان کا نام بھی لازوال ہو گیا۔ فارسی کی یہ کتابیں اس زبان کے حلقۂ اثر کو وسیع کرنے کا موجب ہیں۔

ہندوستان میں فنون لطیفہ اور فن تعمیرات کی ترقی فارسی نفوذ پر دلالت کرتی ہے۔ قرون وسطیٰ کا ہندوستانی فنِ تعمیر ایرانی اثرات سے بھرپور ہے۔ ہندو راجاؤں

کے محل اور مذہبی عبادتیں خصوصاً مندروں کی تعمیر میں اسلامی و ایرانی اثرات کی زبردست آمیزش ہے۔ ڈاکٹر تارا چند کے بقول اس سلسلے کی مثال جودھپور ریاست کے رامپور مندر کی ہے، یہ مندر ۱۴۳۹ء میں میوار کے رانا کمبھا کے عہد میں ایک جینی دھرنک نامی نے بنوایا تھا، اس عمارت میں گنبد ہیں، جن کے ستون احمد شاہ کی بنائی ہوئی جامع مسجد کے ستون کے مشابہ ہیں، دوسری مثال گوالیار کے رانا مان سنگھ کے محل کی ہے، جس نے ۱۴۸۶ء سے ۱۵۱۶ء تک حکومت کی تھی، اس محل کی تعمیر ہند و معماروں کی مرہون منت ہے، جنہوں نے اسلامی فن معماری میں بھی دستگاہ پیدا کر رکھی تھی، یہ محل مشترک ہندی و اسلامی فن تعمیر کی عمدہ مثال ہے۔ بابر جب ۱۵۲۶ء میں گوالیار پہنچا، تو اس سے بہت متاثر ہوا، جس کا ثبوت اس کی توزک سے بخوبی فراہم ہوتا ہے۔ دور قبل مغل کا مشترک ہندی و اسلامی و ایرانی فن تعمیر اکبر و جہانگیر کے دور میں اپنی انتہائی عروج کو پہنچا جس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں:

(۱) امبیر کا محل جو جے پور کے راجہ مان سنگھ کے حکم سے تعمیر ہوا۔

(۲) اکبر کے دور کے چار مندر، جن میں سے تین بندرابن اور ایک گوردھن میں تعمیر ہوئے۔ ان میں سے پہلا مندر ۱۵۹۳ء میں راجہ مان سنگھ ہی کا بنوایا ہوا تھا۔

(۳) جہانگیر کے دور کا بندرابن کا مندر جس کی تعمیر ۱۶۲۸ء میں ہوئی۔

ہندوستان میں فن تعمیر پر جو ایرانی اثرات مترتب ہوئے، وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ لیکن اس سلسلے کی عمارتوں کے فارسی کتبات، اور ان کی دیواروں کے نقش و نگار، آویزاں تصویریں جو کبھی کبھی فارسی عبارتوں سے مزین ہوتی ہیں اور فارسی خطاطی کے دلکش نمونے جو بعض اوقات دیواروں کی زینت ہوئے ہیں، وہ یقیناً ہمارے موضوع گفتگو میں شامل ہیں، یہ امور ہندوستانی تہذیب میں فارسی کے غیر معمولی نفوذ کے شاہد ہیں۔

ہندوستانی مصوری کی ترقی میں ایرانی عنصر کی گہری چھاپ ہے، اس قسم کی مصوری مغلیہ دور میں ترقی کی انتہائی منزل کو پہنچی، خصوصاً اکبر کے دور میں فرخ قلمقاق، عبدالصمد، میر سید علی اور مسکین کے زیر تربیت ہندو مصوروں کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی جنہوں نے مصوری کے اس نئے مکتب کو کافی ترقی دی، ان میں سے سونت، بساون، کیشو لال،

مکند، مادھو، جگناتھ، مہیش، بھیم کرن، تارا، سانولا، ہری بنس اور رام کے نام "آئین اکبری" میں درج ہیں۔ اِن کے علاوہ کافی اور مصوروں کے نام مخطوطات کے ذریعے فراہم کرتے ہیں۔ کتابخانۂ خدابخش میں تیمور نامہ کا جو مصور نسخہ ہے ان میں تکسی، بسجان، سورداس، ایسار، شنکر، رام داس، بنوالی، نند، ننھا، جگجیون، دھرم داس، نارائن، چترلامن، صورج، دیوجیو، سرن، گنگا سنگھ، پارس، دھنا، بھیم، وغیرہ کی مصوری کے نمونے موجود ہیں۔

بابرنامہ (ترجمہ فارسی) کا ایک اعلیٰ درجہ کا نسخہ نیشنل میوزیم دہلی میں ہے۔ اس کی کتابت ۱۰۰۵ ہجری/۱۵۹۶ کی ہے، اس میں ۱۴۴ تصویریں اکبری عہد کے ۴۹ ممتاز مصوروں کی ہیں۔ اِن میں سے ۳۶ نام نئے ہیں، جو تیمور نامہ میں شامل نہیں۔ اللہ قلی، آننت، السی، السی کہار، بندے، بنواری، بھاگ، بھگوان، بھوانی، بھورا، دولت، دھنراج، فرخ چیلہ، نتھو، گوبند، حسین چیلہ، ابراہیم، ابراہیم کہار، جمل، جمشید، کاسو کہار، خان، کھرا، لچھمن، لوکھا، مکیرا، منصور، محمد کشمیری، محمد نیڈت، نقی، نرسی، نرسنگھ، پریم، پریم گجراتی، شیوداس، تیمور استاد۔

جس طرح فن تعمیر پر ایرانی اثرات کا تعین ہماری گفتگو سے خارج ہے، فنِ مصوری کی بھی یہی صورت ہے، لیکن ان مصوروں نے فارسی کے اہم مخطوطوں کی تصویر کشی کی اور مصوّر نسخے تیار کیے، اس کام کی ابتدا ہندوستان میں میر سید علی اور استاد عبدالصمد کے ذریعے ہوئی۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمایون کے دور میں اس کا کام کی ابتدا داستان امیر حمزہ کی تصویر کشی سے ہوئی۔ اس داستان میں ۱۴۰۰ تصویروں کے شامل کرنے کا منصوبہ تھا، معلوم نہیں کہ کتنی تصویریں مکمل ہوئیں۔ مگر اس کے مصوّر اوراق جو مختلف عجائب خانوں میں ملتے ہیں۔ اِن کی تعداد تقریباً ۱۲۵ ہے۔ ایسا خیال ہے کہ یہ تصویر کشی ۱۵۸۲ تک ہوتی رہی، اسی سال اکبر نے رامائن اور مہابھارت کے مصور کرنے کا فرمان جاری کیا اور ان دونوں کتابوں پر کام شروع ہو گیا۔ ان کے علاوہ داراب نامہ، شاہنامہ، بابرنامہ، جامع التواریخ، تیمور نامہ، تاریخ الفی، اکبر نامہ، خمسۂ امیر خسرو، خمسۂ نظامی، انوار سہیلی، گلستان، بہارستان وغیرہ کے اعلیٰ درجے کے مصوّر نسخے تیار ہوئے۔ داراب نامہ کا ایک نسخہ لندن میں ہے، شاہنامہ کا میونخ میں، بابرنامے

کے پانچ اہم مصوّر نسخے معلوم ہیں، دو لندن میں، ایک ایک ماسکو میں پیرس اور نیشنل میوزیم نئی دہلی میں)، برٹش میوزیم کے ۲۲ مصوّر صفحے ماسکو میں ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ جامع التواریخ کے دو نسخے ہیں۔ ایک تہران میں، دوسرا پیرس میں؛ اکبر نامہ کا ایک مصوّر نسخہ لندن میں ہے تاریخ الفی کا مصوّر نسخہ فریر آرٹ گیلری واشنگٹن میں ہے۔ اس کے ایک ورق کا عکس Indian Miniature Painting میں شائع ہوا ہے۔ خمسۂ امیر خسرو کا ایک مصوّر صفحہ بھی اسی آخرالذکر کتاب میں جس میں داستان امیر حمزہ کا بھی عکس ملتا ہے۔ شائع ہوا ہے۔ خمسۂ نظامی کا ایک مصوّر نسخہ تہران میوزیم میں ہے، جو اکبری دور میں ۱۰۰۴ ہجری کے قریب مرتب ہوا۔ اس کا ایک ورق Indian Miniatureg of the Moghul coure میں شائع ہوا۔ انوارِ سہیلی، گلستان، بہارستان وغیرہ جو اکبری دور میں مصوّر شکل میں مرتب ہوئیں، یورپ کے بعض کتاب خانوں میں ملتے ہیں۔

اِن مصوّر نسخوں سے ایک طرف مغل بادشاہوں کے فن مصوّری سے بے پایاں لگاؤ کا پتہ چلتا ہے، دوسری طرف فارسی زبان کے غیر معمولی نفوذ کا بھی وافر ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

مصوّری میں شبیہ کشی (Portrait making) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جہانگیر کو اس فن سے بڑا شغف تھا۔ اِس کے دربار کے مخصوص مصوّر فرخ بیگ، ابوالحسن نادرالعصر، آقا رضا، استاد منصور وغیرہ جنہوں نے شبیہ کشی میں ناموری حاصل کی تھی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ جہانگیر نے مرقع گلشن کے نام سے تصویروں اور خطاطی کا ایک نفیس البم تیار کیا تھا۔ لیکن دست بُردِ زمانہ سے یہ مُرقع محفوظ نہ رہ سکا۔ البتہ اس کے جستہ جستہ اوراق ایران اور یورپ کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اب تک اس کے ۱۲۰ اوراق کا پتہ چل سکا ہے جن میں ۸۶ تہران میں موجود ہیں۔ (۸۸ عجائب خانے میں اور ۸ کتابخانۂ سلطنتی میں) کچھ اوراق یورپ اور امریکہ کے عجائب خانے کی زینت ہیں۔

مرقع گلشن اس دور کے نامور مصوّروں اور خطّاطوں کی یادگار ہے۔ خطّاطوں میں میر علی، سلطان علی مشہدی اور محمد حسین کشمیری قابلِ ذکر ہیں۔ خطّاطی کے نمونے فارسی نفوذ کو واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ شبیہ کشی کبھی کبھی فارسی کتاب کی اور عموماً مصوّر کے نام

کی حامل ہوتی ہیں - اور انہیں فارسی عبارتوں سے فارسی کا نفوذ ظاہر ہوتا ہے - فرخ بیگ کی شبیہہ کشی کا ایک اعلیٰ نمونہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شبیہہ کا حامل ہے، مشہور انگریز نقاد رابرٹ اسکلٹن اور ان کی پیروی میں چیکوسلواکی نقاد لیوبر حیجک کا خیال ہے کہ تصویر بیجاپور دکن میں کھنچی، جو بعد ا جہانگیر کے مرقع گلشن میں شامل ہوئی اور اسی سے ان دونوں نقادوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ ابراہیم عادل شاہ کے دربار کا مصوّر فرخ حسین جس کا ذکر ظہوری نے سہ نثر میں کیا ہے، وہی ہے جو دربار جہانگیر میں فرخ بیگ کے نام سے مشہور ہے - راقم حروف نے اسلامی کلچر کے ذریعے اس نظریے کی تردید کی تھی - بعد میں رابرٹ اسکلٹن نے اپنے خیال کی تائید میں فرخ بیگ کی بنائی ہوئی عادل شاہ کی تصویر پیش کی، مگر اس سے بھی ان کے اقوال صحیح نہیں قرار پاتے، چنانچہ راقم نے انڈو ایرانیکا کے ایک مضمون میں ان کے ذریعے کی تردید کی، میرے قیاس کی بنیاد خود شبیہہ کی فارسی عبارتیں ہیں ؛ تصویر کے اوپر یہ تحریر ہے :

" اللہ اکبر شبیہہ ابراہیم عادل خاں دکنی طرف دار بیجاپور کہ در علم موسیقی دکن خود را اسر امد اہل ان فن میداند "

تصویر کے نیچے یہ تحریر ہے :

" عمل فرخ بیگ فی سنہ جلوس مبارک موافق ۱۰۱۹ بندہ کمترین محمد حسین زریں قلم جہانگیر شاہی تحریر نمود "

اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل توجہ ہیں :

(۱) مغل بادشاہوں، مورخوں، اور امیروں نے دکن کی سلطنتوں کے الگ وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا، چنانچہ ان کی تحریروں میں دکنی سلاطین کو 'خان' لکھتے ہیں - بادشاہ نہیں، اس شبیہہ میں بھی ابراہیم عادل شاہ، عادل خاں کے نام سے یاد ہوا ہے -

(۲) اس کو بادشاہ بیجاپور کے بجائے اس کو طرفدار لکھا گیا ہے -

(۳) ۱۰۱۹ میں فرخ حسین مصور آگرہ میں موجود تھا، توزک میں اس کا ذکر ہے -

(۴) کاتب محمد حسین زریں قلم ۱۰۱۹ میں توزک کی تصریح کے مطابق آگرہ میں تھا، وہ خود کو واضحاً جہانگیر شاہی لکھتا ہے -

(۵) ۱۰۱۹ میں ابراہیم عادل شاہ کی عمر ۴۰ سال کی ہوتی ہے، لیکن اس تصویر میں وہ ۳۵ سال سے زیادہ کا نہیں، بنابریں اگر یہ اس سنہ کی تصویر ہے، تو تصویر کی تصویر ہے۔

یہ سارے اُمور جن کی بنیاد تصویر کی عبارت ہے۔ ہندوستان کی مصوری اور موسیقی کی تاریخ میں کافی اہمیت کے حامل ہیں، ان سے فارسی کے اثر کا بخوبی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

مرقّع گلشن میں ایک شبیہہ بختر خاں کلاونت کی بھی شامل ہے، مصوّر معلوم نہیں البتہ اس پر جہانگیر کے ہاتھ کی تحریر ملتی ہے:

"۱۰۲۴ شبیہہ بختر خاں کلاونت کہ داماد عادل خاں می شود در اجمیر آمدہ ملازمت نمود۔

اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل ذکر ہیں:

(۱) جہانگیر نے عادل شاہی کلاونت کی شبیہہ اپنے البم میں شامل کی، اس سے ایک طرف اس کی فنِ مصوری اور دوسری طرف فنِ موسیقی سے دلچسپی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

(۲) حسبِ معمول وہ عام دکنی سلاطین کی طرح ابراہیم عادل شاہ کو عادل خاں لکھتا ہے، گویا اس کے الگ وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔

(۳) یہ تحریر، تزکِ جہانگیری کے نسخہ، دہلی میوزیم کے عین مشابہ ہے، جو جہانگیر کی طرف منسوب ہے، اس سے آخرالذکر تحریر کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔

(۴) اِس تحریر سے واضح ہوا کہ بختر خاں کلاونت ابراہیم عادل شاہ کا داماد تھا، آخرالذکر کتاب نورس کا مؤلف ہے اور موسیقی کا عالم تھا۔

(۵) توزک میں لکھا ہے کہ بختر خاں ۱۰۲۴ میں اجمیر میں شرفِ ملاقات سے مشرف ہوا، وہ ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس کے دھرپد ہونے وقت جہانگیر کو سناتا تھا۔ اور بادشاہ اس سے بیحد متاثر ہوتا تھا۔ توزک کے قول کی اِس تحریر سے پوری تائید ہوتی ہے۔

اِس تفصیل سے ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بسا اوقات ضمنی تحریریں تاریخی و سیاسی و تمدّنی اعتبار سے کتنی اہم ثابت ہوتی ہیں۔ دوسری طرف ان سے

فارسی کے نفوذ کا پتہ چلتا ہے۔

فن خطاطی کی ترقی ایرانی خطاطی کے ذیل میں ہوئی، ایران کی طرح خطِ نستعلیق ہندوستان میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ بقول ابوالفضل اکبر کو اس خط سے خاص لگاؤ تھا، اس کے نتیجے میں خطِ نستعلیق نے اس کے دور میں خصوصیت سے ترقی کی؛ دربارِ اکبری کا سب سے ممتاز خطاط محمد حسین کشمیری ہے، جو زرّیں قلم کے خطاب سے نوازا گیا، اس کے معاصر ی ابوالفضل نے مولانا باقر، محمد امین مشہدی، میر حسین کلنکی، مولانا عبدالحی، مولانا داوری، مولانا عبدالرحیم، میر عبداللہ، نظامی قزوینی، علی چین کشمیری، نوراللہ قاسم ارسلان کا ذکر کیا ہے، جہانگیر کے دور میں نستعلیق کی ترقی ہوتی گئی، اور اکبری دور کے بعض خطاط اس زمانے میں بھی اس فن کی خدمت کرتے رہے۔ ان میں محمد حسین کشمیری اور عبدالرحیم خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اِن دونوں خطاطوں کی خطاطی کے متعدد نمونے جہانگیر کے مرقع گلشن میں شامل ہیں۔ علاوہ بریں محمد حسین کشمیری کے بعض مخطوطے محفوظ ہیں، مثلاً:

(۱) بہارستان جامی کا ایک نسخہ باڈلین کتابخانے میں محفوظ ہے جس کی کتابت ۹۸۳ میں ہوئی۔ یہ مصور نسخہ ہے، جس کی تصویر کشی میں اکبری عہد کے ۱۶ مصوروں نے حصّہ لیا تھا۔

(۲) کتابخانہ خدابخش خاں، بانکی پور، پٹنہ میں ایک بیاض کا نسخہ ہے جو محمد حسین کشمیری زرّیں قلم کی یادگار ہے، اس میں کل ۸۲ اوراق ہیں، تاریخ کتابت ۱۰۰۰ھ ہے اور اکبری عہد کے دو مصوروں یعنی فرخ اور شنکر کی تصویریں بھی شامل ہیں۔

(۳) کتابخانۂ خدابخش میں دیوان حسن کا نسخہ محمد حسین کی خطاطی کا نمونہ ہے۔ اِس کی کتابت ۱۰۰۱ ہجری میں ہوئی، یہ اکبر کے ایک جنرل شیخ فرید بخاری کے کتابخانے کے لئے تیار ہوا تھا۔

(۴) باڈلین کتابخانے میں بہاءالدین عاملی کے نان و حلوا کا ایک نسخہ زرّیں قلم کی یادگار ہے۔ ان کے علاوہ اس کے خط کے اور نمونے اِدھر اُدھر مل جاتے ہیں۔

عبدالرحیم بھی اپنے زمانے کا بڑا خطاط تھا، عبدالباقی نہاوندی، محمد حسین کشمیری کے بعد اس کو سب سے بڑا خطاط جانتا ہے۔

الحال در ہندوستان بعد از ملّا محمد حسین کشمیری بہتر از وی نیست

عبدالرحیم ہروی کو عنبرین قلم کا خطاب ملا تھا۔ اس کی خطاطی کا ایک اہم نمونہ خمسۂ نظامی کے مخطوطے کی شکل میں ہے جو لندن میں Dysen Perrins کے ذاتی کتابخانے میں محفوظ ہے۔

اس طرح کے ہزاروں فارسی خطاطی کے خط کے نمونے دنیا کے مختلف کتابخانوں میں محفوظ ہیں جن سے فارسی کے نفوذ کی وسعت کا اندازہ ہو سکے گا۔

میری دو روز کی گفتگو کا ماحصل یہ ہے:

(۱) فارسی نے ہندوستان پر جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں وہ کسی اور زبان کے نہیں۔

(۲) ہندوستان کے دورِ وسطیٰ سے آج تک کی تمدنی و تہذیبی زندگی کے سلسلے میں اس زبان سے کماحقہٗ واقفیت کے بغیر کوئی معقول اقدام نہیں ہو سکتا اور جو اقدام اس کے بغیر ہوا ہے، یا آئندہ ہوگا، وہ ناقص ہوگا اور ناقابلِ اعتبار۔

(۳) ہندوستان کی زبانوں کی تحقیق کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی ایک اہم شرط فارسی زبان سے واقفیت ہے۔

(۴) اس زبان سے تعلق رکھنے والوں کی جتنی ذمہ داریاں ہیں وہ کسی اور زبان والوں کی نہیں، عموماً ہمارے یہاں کے فارسی کے نصاب میں ادب کا حصہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے ہمارے یہاں کا فارسی عالم ادب و شعر و شاعری کے کچھ مسائل سے واقف ہوتا ہے، عمیق مسائل سے عمومی طور پر واقفیت نہیں ہوتی، لیکن یہ محض زندگی کا ایک رُخ ہے۔ فارسی والوں کو تاریخ، تمدن، معاشرت، فنونِ لطیفہ، ہندوستانی زبانوں وغیرہ کے مسائل سے واقف ہونا چاہیئے اس لئے کہ ان مسائل کے مطالعے میں فارسی کو بے حد دخل ہے، لیکن بحالتِ موجودہ ہم ان کو حل کرنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ افسوس اس کا ہے کہ ہم ان امور کو اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتے، ہمارے ایک دوست نے ایک ایسے فارسی کے استاد پر سخت اعتراض کیا،

جو فارسی تاریخ نویسی (Historiography) کے سلسلے میں کام کر رہے تھے، ان بزرگ کے نزدیک یہ کام فارسی کے کام میں شمار نہیں ہو جاتا۔

زبان و ادب کی اہمیت قومی و ملکی ضرورت کی کفالت کے اعتبار سے ہوتی ہے، فارسی کی اہمیت کا مدار اس امر پر ہے کہ اس سے یہ ضرورت کس حد تک پوری ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ ہندوستان کے سیاسی و تمدنی ولسانی مسائل کا اس زبان سے بہت گہرا تعلق ہے لیکن فارسی کے ہندوستانی دانشوران مسائل کے حل میں ناکام رہے ہیں۔ ان میں ماضی اور حال کے دانشور شامل ہیں، ہمیں ان مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے، اپنے نصاب میں ترمیم کرنا چاہیئے، اساتذہ کے انتخاب میں نہایت توجہ دینی چاہیئے، بہتر طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی صورتیں نکالنی چاہیئے، تحقیق اور تعلیم کے معیار کو بلند کرنا چاہیئے، تحقیقی موضوع کے انتخاب میں بڑی چھان بین کرنا چاہیئے، صرف سستی شہرت مدنظر نہ رکھنا چاہیئے۔

(۵) ہندوستان کی حکومت اور یہاں کے عوام پر واضح ہونا چاہیئے کہ فارسی کے زوال سے ہندوستان کا تہذیبی زوال ہوگا اور اس سے زیادہ مایوس کن اور کیا صورت حال ہوگی کہ پورے ایک صوبے میں اعلیٰ تعلیم کے طلبہ کا کیا ذکر، ان طلبہ کی تعداد متوسط درجے تک جو فارسی پڑھتے ہیں انگشت شمار ہیں۔ ایسی صورت میں جو بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے، فارسی مخطوطات کو کون پڑھے گا۔ دستاویزات و رقعات کا ترجمہ کون کرے گا، کون ادر دوسرے کے بارے میں یادداشت شائع کرے گا، مصور نسخوں کی شناخت کیونکر ہوگی، تاریخی مسائل کس کے ذریعے حل ہوں گے، زبانوں پر فارسی کے اثرات کون مرتب کرے گا۔ یہ ملکی و قومی خسارہ ہے۔ اس کا صحیح طور پر احساس ہونا چاہیئے۔ ان امور پر غور و فکر کرنے اور خاطر خواہ اقدامات کے لئے ضروری ہے کہ حکومت ایک کمیشن مقرر کرے۔ اس صورت میں توقع کی جاسکتی ہے کہ ہماری تمدنی و تہذیبی تاریخ کی بنیاد استوار ہو جائے۔



قدیم ہندوستانی کتابخانوں کی نادر کتابیں اور موجودہ ہندوستان میں فارسی سے متعلق تحقیقی مواد

حضرات، گذشتہ دو جلسوں میں ہندوستان کی تہذیبی و معاشرتی زندگی پر فارسی کے اثرات واضح کئے گئے تھے۔ آج کی گفتگو میں ہندوستان کے قدیم کتابخانوں کے ذکر کے ساتھ، فارسی سے متعلق ہندوستان میں جو اہم تحقیقی مواد موجود ہے۔ اس کا مختصر تعارف کیا جائے گا۔ آج کی گفتگو کا موضوع اس لحاظ سے بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہم ایک اہم مشرقی کتابخانے کے مہمان ہیں، اور اسی کے زیرِ اہتمام ہمارے جلسے ہو رہے ہیں، اس لئے ہماری گفتگو کا اختتام بھی ہندوستان کے قدیم مشرقی کتابخانوں کے تبصرے پر ہو رہا ہے۔

واضح رہے کہ یہ موضوع نہایت وسیع ہے، اس لئے اس کا واقعی احاطہ ایک مختصر سی مجلس میں نہیں ہو سکتا۔ یہاں جو کچھ عرض ہو رہا ہے، وہ محض مشتے از خروارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اہم ذاتی کتابخانوں کا ذکر نہیں ہو سکے گا، اور اس کا تو امکان بہت زیادہ ہے کہ نہایت اہم اور معتبر نسخے اس بیان میں شامل نہ ہو سکیں۔ اس لئے کہ اوّل وہ سب ہمارے علم میں نہیں۔ دوم ہندوستان کے تمام نسخوں کا تعارف ایک مجلس کے حوزہ سے باہر ہے۔

کتابخانوں کی روایت بہت قدیم ہے، فارسی کے رواج کے ساتھ ہی ہندوستان میں فارسی کے کتابخانوں کا چلن ہوا، عموماً مسلمانوں کے دور میں کتابخانہ حکومت وامارت کی نشانی سمجھا جاتا تھا، شاہی کتابخانوں کے ساتھ شخصی کتابخانے قائم کرنے کا عام طور پر رواج تھا۔ لیکن مغلیہ دورِ حکومت سے قبل کسی بڑے کتابخانے کا نشان باقی نہیں اور نہ کسی بادشاہ، امیر، عالم یا دانشمند کی کوئی تحریر مکشوف ہوئی ہے۔ یہ صورت حال بہت عجیب و غریب ہے جس کی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ صدہا علمی شخصیات گذری ہیں، جنہوں نے ہزاروں کتابیں اور رسالے لکھے ہوں گے، لیکن ان میں کسی کی اپنی کتابت کی ہوئی کوئی چیز نہیں ملتی۔ سلطان التتمش کے بیٹے سلطان ناصرالدین محمود (م: ۶۶۴) کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ وہ سرکاری خزانہ سے کچھ نہیں لیتا، گذر اوقات کا طریقہ کتابت پر تھا۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ کی متعدد کتابیں ہوں گی لیکن اب اس کا دستخط تک نہیں ملتا، پوری تحریر کا کیا ذکر؛ خلاصۂ کلام یہ کہ مغلیہ عہد کے قبل کی کسی نامور شخصیت کی کوئی تحریر تک مکشوف نہیں ہو سکی ہے۔

مغلیہ عہد میں حسب معمول کتابوں کے جمع کرنے کا شوق بادشاہوں، امیروں، شاہزادوں، دانشمندوں وغیرہ میں پایا جاتا تھا اور قابلِ اطمینان بات یہ ہے کہ اس دور کی متعدد یادگاریں، قلمی کتابوں کی شکل میں آج تک باقی ہیں۔ بابر ایک زبردست فاضل گذرا ہے، اس کی توزک بابری اس کے علم و فضل پر شاہد عدل ہے۔ فنِ خط سے اس کی دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ ایک خط کا موجد سمجھا جاتا ہے، جو خط بابری کے نام سے مشہور ہے اِس خط کے نمونے بعض کتابخانوں میں موجود ہیں۔ راقم نے مشہد میں نادر شاہ کے عجائب خانے میں خطِ بابری کا نمونہ حال ہی میں دیکھا ہے۔ رضا لائبریری رامپور میں دیوان بابر کا ایک نسخہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی بابر کا ترجمہ کیا ہوا رسالہ والدیہ بنام رسالہ والدیہ ترجمہ شامل ہے۔ اس میں بابر کے ہاتھ کی اصلاح و تصحیح ہے۔ اور آخر میں بابر ہی کے خط میں ایک رباعی ہے۔ اس خط کی شہادت شاہجہاں نے اِن الفاظ میں پیش کی تھی۔

"این رباعی ترکی واسم مبارک تحقیق خط اعلیٰ حضرت فردوس مکانی بابر بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ است۔ حررہٗ:۔ شاہ جہان بن جہانگیر بادشاہ بن اکبر بادشاہ بن ہمایون بادشاہ بن بابر بادشاہ"

ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر کتابخانۂ خدا بخش خاں، پٹنہ کے توسط سے ان اندراجات کا عکس "نذرِ عرشی" میں شائع ہو چکا ہے۔

بابر کے بیٹے ہمایون کو علم سے شوق تھا۔ وہ صاحبِ دیوان شاعر بھی تھا۔ یہ بڑے افتخار کی بات ہے کہ اس دیوان کا واحد نسخہ آپ ہی کے صوبۂ بہار میں موجود تھا۔ جس کو ڈاکٹر ہادی حسن صاحب نے شائع کیا۔ ہمایون کے خط کے دو نمونے موجود ہیں: پہلا کتبہ خراسان میں جام نامی قصبہ میں حضرت جام ژندہ پیل کے مزار میں ہے۔ جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:[1]

ای رحمت تو عذر پذیر ہمہ کس ظاہر بجناب تو ضمیر ہمہ کس

درگاہ و در تو قبلہ گاہِ ہمہ خلق لطفت بکرشمہ دستگیر ہمہ کس

سرگشتۂ بادیۂ بی سرانجامی

محمد ہمایون ۱۴ شوال سنہ ۹۵۱

اس کتبہ کی قدیم ترین شہادت مآثر رحیمی کی حسب ذیل عبارت سے فراہم ہوتی ہے:

"در پنجم ذی الحجہ ہمیں سال[2] (۹۵۰ھ) زیارت مرقد منور حضرت ژندہ پیل احمد[3] جام نمودند و بیتی مناسب حال بر سنگ مزار کثیر الانوار آن عارف آگاہ

---

[1] یہ رباعی خود ہمایون کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مین مطابق حسب ذیل رباعی ہے، جو بقول ڈاکٹر ہادی حسن (Unique Diwan، ص ۲۷) عمر خیام کی ہے، یا ابن یمین کی:

ای واقف اسرار ضمیر ہمہ کس در حالت عجز دستگیر ہمہ کس

یارب تو مرا توبہ دہ و عذر پذیر ای توبہ دہ و عذر پذیر ہمہ کس

[2] ابوالفضل نے بھی ذی الحجہ ۹۵۰ لکھی (بیورتج، اکبر نامہ ۱: ۴۳۴)

[3] عارف مذکور (م ۵۳۶ھ) ہمایون کی ماہم اور اس کی بیگم حمیدہ بانو کے اجداد میں تھے دک: آئین اکبری ج ۱ ص ۱۲۱، ہمایون نامہ ص ۱۴۵ حاشیہ ۲، نیز اکبر نامہ ج ۱ ص ۵۲ (ترجمۂ انگلیسی)

بخط شریف نوشتہ اند، اگرچہ آن بیت درخاطر راقم این نسخہ کہ بشرف دیدن آن مشرف شدہ نماندہ است فاما نام نامی خود را کہ نوشتہ اند و در یاد ہست ہمیں عبارت است کہ سرگشتۂ وادی بے سرانجام محمد ہمایون، و نواب خان خانان بیرام خان نیز بیتی مناسب در حوالی قلمی سودہ اند و راقم در سنہ الف و عشرین آن ارقام سعادت انجام را دریافتہ بہمان دستور باقی است ...... و در محرم نہصد و پنجاہ و یک بزیارت روضۂ رضویہ فائز گشتند ‘‘

یہ عبارت مآثر رحیمی (جلد اول ص ۵۸۸) میں ہے، پھر جلد ۲ ص ۱۸ پر یہی قول دہرایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ عبدالباقی مؤلف مآثر رحیمی نے اپنے حافظہ پر بھروسا کیا تھا، اس بنا پر اس سے کچھ سہو واقع ہو گیا۔ مثلاً ہمایوں کی مقبرہ احمد جام کی زیارت کی تاریخ ۵ ذی الحجہ ۹۵۰ لکھی، حالانکہ خود اصل کتبہ میں تاریخ ۱۴ شوال ۹۵۱ ہجری موجود ہے۔

عبدالباقی نے ایک بیت لکھے جانے کا ذکر کیا ہے، حالانکہ ہمایون نے ایک رباعی درج کی ہے۔

عبدالباقی کے بقول ہمایون نے اپنے متعلق جو کلمات لکھے وہ یہ تھے: ’’سرگشتہ وادی بی سرانجام‘‘ جو اصل سے خاصہ مختلف ہیں۔

بہر حال ہمایون کا کتبہ محفوظ ہے، لیکن خان خاناں کے کتبے کا پتہ نہیں۔

ہمایون کی دو اور تحریریں دیوان حافظ کے اس اہم مخطوطے میں شامل ہیں جو کتابخانہ بانکی پور میں محفوظ ہے اور جس پر جہانگیر نے آٹھ یادداشتیں اپنے فال نکالنے کے سلسلے کی درج کی ہیں؛ یہ ہمایون کے ذاتی کتابخانے کا نسخہ تھا، جو بعد میں جہانگیر کو ورثہ میں ملا اور

لہ یہ رباعی درج کی تھی:

ای واقفِ اسرارِ نہان ہمہ کس | ای در ہمہ حال رازدانِ ہمہ کس
ای ذکر تو بر سرِ زبانِ ہمہ کس | ای نام خوش تو حرزِ جانِ ہمہ کس (مآثر رحیمی ۲: ۹۵)

جو داراشکوہ کے بھی مطالعے میں رہ چکا تھا۔

ہمایون لکھتا ہے :

"از فال مصحف کہ "رتبک" بر آمدہ از دیوان حافظ این شاہ بیت آمدہ، و چندین بار ابیات مناسب آمدہ کہ اگر شرح آن شود کتابی شود۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بعون فتح ولایات شرقی و مبارزان ان دیار بامر کردگار شود نذر خوبی بخواجۂ لسان الغیب فرستادہ شود و جمع آن تفالات نیز رقم کردہ شود بمنہ و توفیقہ، شبِ دوشنبہ، ہیجدہم ذی الحجہ سنہ[1] ۹۶۲ در شہر دین پناہ[2] تحریر یافت"۔

اس اہم تحریر سے ہمایون کے دیوان حافظ سے گہرے شغف کا پتہ چلتا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کو خواجۂ حافظ کے لئے نذر بھیجنے اور اپنے فال دیکھنے کے واقعات کے جمع کرنے کا موقع ملا یا نہیں، بہر حال اس اہم معاملے کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں۔

اکبر اعظم، اگرچہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ لیکن علم کا شوق رکھتا۔ اس کا کتابخانہ نفیس کتابوں کا زبردست ذخیرہ تھا، وہ ان کتابوں سے براہ راست استفادہ تو نہیں کر سکتا تھا لیکن لوگ مقرر تھے، جو اس کو ہر روز کتابیں پڑھ کر سناتے تھے۔ اس سلسلے میں ابو الفضل نے آئین اکبری میں بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ آئین خط کے ذیل میں ابو الفضل لکھتا ہے :

"بادشاہ کا کتابخانہ کئی حصوں میں منقسم ہے، کچھ کتابیں حرم میں اور کچھ حرم سے باہر رہتی ہیں۔ کتابخانوں کے مختلف حصے تھے، جو کتابوں کی ذاتی قیمت اور اس علم کے درجے کے لحاظ سے جس میں وہ کتاب ہوتی یہ حصے مقرر

---

[1] فتح دہلی کا واقعہ ۴ رمضان ۹۶۱ ہجری کو ہوا، گویا اس کے سوا سال بعد یہ تحریر لکھی گئی۔

[2] قانون ہمایونی ص ۸۶ سے معلوم ہوا کہ اس شہر کی تعمیر ہمایون کے واسطے سے ۹۴۰ میں ہوئی۔ ہست شہر پادشاہ دین پناہ سے تاریخ سے نکلتی ہے۔

ہوئے۔ کتب نثر، کتب نظم، کتب ہندی، (سنسکرت) کتب فارسی، کتب یونانی، کتب کشمیری، کتب عربی کیلئے جدا جدا حصے متعین تھے؛ اسی ترتیب سے ان کی نگہداشت بھی ہوتی تھی؛ ہر روز ہوشیار و تجربہ کار لوگ ان کتابوں کو بادشاہ کے حضور میں لاتے اور پڑھتے؛ بادشاہ ہر کتاب کو شروع سے آخیر تک سنتا، قاری جس صفحہ تک پڑھتا، بادشاہ وہاں اپنے قلم سے ایک نشان لگاتا اور ہر قاری کو سونے یا چاندی میں پڑھے ہوئے اوراق کے حساب سے انعام دیتا۔ اہم کتابوں میں کم کتابیں ہوں گی، جو بادشاہ کے حضور میں نہ پڑھی گئی ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ماضی کا کوئی اہم تاریخی واقعہ یا سائنس کے عجائبات میں کوئی عجوبہ یا فلسفہ کے نکات میں سے کوئی نکتہ ایسا نہیں، جس سے بادشاہ واقفیت نہ رکھتا ہو، وہ کتابوں کے بار بار سننے سے نہیں گھبراتا، بلکہ دوبارہ اس کی توجہ اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ اخلاق ناصری، کیمیائے سعادت، قابوس نامہ، تالیفات شرف الدین منیری، جام جم، بوستان، شاہنامہ، مثنویات شیخ نظامی، تالیفات خسرو جامی، دیوان خاقانی، دیوان انوری، کے علاوہ متعدد کتب تاریخ، اس کے حضور میں برابر پڑھی جاتیں۔ متعدد زبان شناس ہندی (سنسکرت) یونانی، عربی اور فارسی کی کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے میں برابر مشغول رہتے۔ اس طرح زیج جدید مرزائی کا ترجمہ امیر فتح اللہ شیرازی کی نگرانی میں ہوا، کشنجوشی، گنگادھر، مہیش مہانند، ابوالفضل کی توجہ سے فارسی میں منتقل ہوئیں۔ اس سلسلے میں مہابھارت نے نقیب خاں، عبدالقادر بدایونی، شیخ سلطان تھانیسری کی توجہ سے فارسی کا جامہ پہنا۔ اس میں ایک لاکھ اشعار ہیں اور حضور شہنشاہ اس کو "رزم نامہ" کہتے ہیں۔ انہیں حضرات کی کوششوں سے رامائن بھی فارسی میں منتقل ہوئی۔ یہ کتاب رام چندر کی زندگی کے علاوہ فلسفہ کے دلچسپ نکات سے بھر پور

ہے۔ حاجی ابراہیم سرہندی نے اتھربن کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ لیلاوتی کا فارسی ترجمہ شیخ ابوالفیض فیضی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ فرمان شاہی کے مطابق مکمل خان گجراتی نے جین مت کی مشہور کتاب جاتک کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ بابرنامہ جو عقل علمی کا دستور نامہ ہے مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے توسط سے فارسی میں منتقل ہوا۔ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے تاریخ کشمیر جو چار ہزار سال کے واقعات کو حاوی ہے، اس کا ترجمہ کشمیری سے فارسی میں کیا۔ معجم البلدان کئی عربی کے متعدد دانش ور، جیسے ملا احمد تھتوی، قاسم بیگ، شیخ منور، وغیرہ کی کوشش سے فارسی میں منتقل ہوا۔ ہری بنس، جو کرشن کے حالاتِ زندگی پر ہے، اس کا ترجمہ ملا شیری کے توسط سے ہوا۔ کلیلہ و دمنہ کو راقم نے نئے انداز پر عیار دانش کے نام سے مرتب کیا، نل اور دمن کی عشقیہ داستان کو فیضی نے نل دمن کے نام سے، لیلیٰ مجنوں کی بحر میں نظم کیا۔

جب شہنشاہ معظم کو تاریخی خزائن سے روشناس ہوئے تو ہفت اقلیم کے ہزار سال کے واقعات پر مشتمل ایک تاریخ مرتب کرنے کا حکم دیا۔ نقیب خاں اور متعدد فضلا نے یہ کام شروع کیا، ایک بڑا حصہ ملا احمد تھتوی نے اضافہ کیا۔ بالآخر جعفر بیگ آصف خاں کے ہاتھوں یہ کام جو تاریخ الفی کے نام سے معروف ہے، انجام پایا۔''

اس تفصیل سے شہنشاہ اکبر کے ذوقِ علمی کا پتہ چلتا ہے۔ اس بادشاہ کے دور میں جتنا متنوع علمی و ادبی کام ہوا، وہ کسی اور دور میں نہیں ہوا، علم و ادب کے علاوہ مصوری، خطاطی، اور دوسرے فنون میں اس دور میں اتنی ترقی ہوئی کہ اس کو بجا طور پر دورِ متوسط کا سنہرا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کتابخانے کا اہتمام بھی قابل توجہ ہے۔ لیکن بظاہر ان کتابوں میں جو بادشاہ کے سامنے پڑھی گئیں اور جن کے صفحات پر اس نے اپنے قلم سے نشان بنایا، کسی قابل ذکر مخطوطے کا تعین نہیں ہو سکا ہے۔

مخطوطہ شناسی اور کتاب دوستی کے لحاظ سے نورالدین جہانگیر نہ صرف تمام مغل بادشاہوں میں سب سے ممتاز ہے، بلکہ دنیا کے کم بادشاہ ہوں گے، جنہوں نے مخطوطات کا ایسا گہرا مطالعہ کیا ہو۔ آج بھی دنیا کے مختلف کتابخانوں میں ایسے صدہا نسخے مِل جاتے ہیں۔ جو جہانگیر کی یادداشت سے مزین ہیں۔ وہ نسخے اس بادشاہ کے کتابخانے کے ہیں اور وہ اس کے مطالعے میں رہ چکے ہیں۔ اِس سلسلے کے کچھ مخطوطات سے متعلق ضروری گذارش ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

۱- توزکِ جہانگیری بخطِ جہانگیر: یہ نفیس تاریخی مخطوطہ نیشنل میوزیم دہلی میں محفوظ ہے؛ اس میں ۲۷۳ ورق ہیں، سائز ۱۵×۲۸ سنٹی میٹر، حوض ۷×۴ا سنٹی میٹر ہے۔ صفحے میں سطور کی تعداد مختلف ہے۔ ۱۲ سے ۱۷ سطریں ہیں۔ یہ مخطوطہ شاہی نسخے کے سارے خصوصیات کا حامل ہے۔ مطلا و مذہب ہے، حاشیہ مصور ہے۔ حاشیے کی تذہیب و مصوری جہانگیر کے البم مرقع گلشن کے مشابہ ہے۔ اور اگرچہ اس میں جہانگیر کا نام درج نہیں لیکن اس بادشاہ کے خط کے متعلق کسی قسم کا شبہ نہیں۔ جہانگیر کے خط کی خصوصیت حرفوں پر نقطوں کا عدم استعمال ہے؛ نسخہ زیر نظر اس خصوصیت کا پوری طرح حامل ہے۔

جہانگیر کی وہ تحریر جو، ابراہیم عادل شاہ کے ایلچی بختر خاں کی شبیہہ پر ۱۰۲۴ھ کی ملتی ہے، وہ توزک کی تحریر سے ہر جزئی باب میں کامل توافق رکھتی ہے، اس میں بھی نقطوں کا عدم استعمال نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ غرض یہ نسخہ جہانگیر کے شخصی کتابخانے کا اہم نسخہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کئی سال کی کوشش میں مرتب ہوا ہوگا، البتہ یہ قیاس مشکل سے تسلیم ہو سکتا ہے کہ یہی اصل نسخہ تھا، جس کو جہانگیر نے اپنی متواتر یادداشت سے مرتب کیا ہے۔ بہر حال اس کی اہمیت اور افادیت مسلم ہے۔

۲- دیوان حافظ: دیوان حافظ کا یہ نسخہ، بانکی پور ہی ہے جس کا ذکر ہمایوں کے ضمن میں آچکا ہے، یہ خاندانی نسخہ دو جگہ ہمایوں کی تحریر اور آٹھ جگہ جہانگیر کی یادداشت سے مزین ہے۔ ہمایوں کی طرح جہانگیر نے بھی

دیوان حافظ سے برابر فال نکالی۔ چنانچہ آٹھ مرتبہ کی فال کی تفصیل نسخے کے حاشیے میں درج کی ہے۔ اگر ہمایون بھی اپنے تمام تفاولات نسخے کے اندر درج کر دیتا تو ہم ایک اہم میراث سے محروم نہ رہتے۔

جہانگیر کی سب سے قدیم فال وہ ہے، جو اس نے اکبر کے پاس آگرہ جاتے وقت ۱۰۱۴ھ میں دیکھی؛ اس کی تفصیل غزل بمطلع ذیل کے سامنے حاشیے میں اس طرح درج ہے:

چرا نہ در پی عزم دیار خود باشم
چرا نہ خاک کف پای یار خود باشم

"وقتی کہ از الہ باس بقصد ملازمت حضرت والد بزرگوار خواہشمند اگرہ بودم، در اثناء راہ بخاطر رسید کہ تفاول بدیوان حافظ باید نمود، این غزل بر آمد، وہم سعادت خدمت و رضاجوئی و حاضر بودن در واقعہ ناگزیر دست داد وہم دولت موروثی روزی گشت کہ بعینہ مضمون این غزل بود، در جمید الثانی گشودہ شد۔ راقمہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی"

اکبر، جہانگیر سے ناخوش تھا۔ اس وقت جب جہانگیر خدمت میں حاضر ہوا، تو بادشاہ کی رضاجوئی حاصل ہو گئی۔ جہانگیر کی موجودگی میں تھوڑے ہی دن میں بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور جہانگیر کو حکومت مل گئی۔ ان ساری باتوں کی طرف غزل میں اشارہ پایا جاتا ہے، جو ناظرین کی تفنن طبع کے لئے درج کی جاتی ہے:

چرا نہ در پی عزم دیار خود باشم — چرا نہ خاک کف پای یار خود باشم
غم غریبی و غربت چو بر نمی تابم — بشہر خود روم و شہر یار خود باشم
ز محرمان سرا پردہ وصال شوم — ز بندگان خداوندگار خود باشم
چو کار عمر نہ پیداست باری آن اولی — کہ روز واقعہ پیش نگار خود باشم
ز دست بخت گران خواب و کار بی سامان — اگر کنم گلہ، راز دار خود باشم
ہمیشہ پیشہ من عاشقی و رندی بود — دگر بکوشم و مشغول کار خود باشم

بود کہ لطف ازل رہنمون شود حافظ
وگرنہ تا با بد شرمسار خود باشم

جس صفحہ پر ہمایون نے اپنی فال سے متعلق یادداشت قلمبند کی ہے، اسی صفحہ پر اس یادداشت کے نیچے جہانگیر نے ایک دلچسپ فال کے بارے میں حسب ذیل اطّلاع بہم پہنچائی ہے:-

"در اجمیر بر سر رانا رفتہ بودم، در شکار تعویذ الماس تراشیدہ از سر من اُفتاد، شگون این را خوب ندانستہ تفاول بدیوان خواجہ نمودم این غزل بر آمد:
(ستارہ ای بدرخشید و ماہ مجلس شد دل رمیدۂ ما را رفیق و مونس شد)
در روز دیگر تعویذ پیدا شد۔ حررہٗ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی فی محرم سنہ ۱۰۲۳"

جہانگیر کے پوتے شاہزادہ داراشکوہ نے سفینۃ الاولیا صفحہ ۳۱۷ پر جہانگیر اس فال کا ذکر کیا ہے اور "باشم" والی پوری غزل درج کی ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ دیوان حافظ کے حاشیہ پر اس نے جہانگیر کے خط میں یہ عبارت دیکھی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بانکی پور کا زیر نظر نسخہ وہی ہے، جس کا حوالہ داراشکوہ نے دیا ہے۔

اسی طرح کی چھ اور یادداشتیں جہانگیر کے قلم کی ہیں، ان سے عہد جہانگیر کے اہم سیاسی و تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے؛ اس نسخے کی اہمیت کی بنا پر اس کو عکسی طور پر چھاپ کر عام کر دینا چاہیئے۔ دنیا بھر میں فارسی کا کوئی نسخہ اتنی اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

۳۔ جہانگیر کے جلوس اوّل کی ۵ ویں آذر کو جو کتابیں شاہی کتابخانے میں داخل ہوئیں ان میں سے ایک فارسی بیاض اور سلطان حسین غازی کا ترکی دیوان کا پہلا ورق مع جلد مسلم یونیورسٹی کے کتابخانے میں موجود ہیں، فارسی بیاض جو عراقی کی تین ترجیع اور اوحدی، خواجوی کرمانی اور امیر نعیمی کی ایک ایک ترجیع پر مشتمل ہے، مشہور خطاط اظہر کی نستعلیق خطاطی کی یادگار ہے۔ اظہر سلطان حسین مشہدی کا استاد تھا اور تیموری سلاطین و شاہزادگان کی خدمت میں رہ چکا تھا، ۸۸۰ ہجری کے کچھ بعد وہ فوت ہوا۔ اس کی خطاطی کے نمونے نہیں ملتے، اس

لحاظ سے یہ بیاض نہایت درجہ اہم ہے۔ ترقیمہ یہ ہے:

فی شہر محرم الحرام المنتظم فی سلک شہور عام ثمانین وثمان مائۃ من الہجرۃ النبویہ

بحمداللہ کہ این فرخندہ نامہ — زنوک خامۂ من یافت تسوید

بجستم سال ارقامش ز دل گفت — کتابت ہای ما تاریخ گردید

...... علی ید العبد المذنب الراجی برحمۃ ربہ الواہب

اظہر الکاتب غفر ذنوبہ وستر عیوبہ فی بلدۃ ہراۃ۔

اس نسخے پر جہانگیر کی یادداشت ملاحظہ ہو:

اللہ اکبر

خاصۂ دوم ۵ بہجم آذر سنہ ۱ داخل کتابخانۂ این نیازمند درگاہ الٰہی، در دارالخلافہ آگرہ۔ حررہ نورالدین جہانگیر سنہ ۱۰۱۴ بن اکبر بادشاہ

اس کے سرورق پر مغل دور کے متعدد امرا کی یادداشتیں ہیں۔ جن میں سے ملا حبیب اللہ، محمد ہاشم، منعم بیگ، مراد بیگ، اعظم بیگ اور حسام الدین قابل ذکر ہیں۔

۴۔ سلطان حسین غازی متخلص حسینی کے ترکی دیوان کا پہلا ورق یونیورسٹی کے کتابخانے میں محفوظ ہے۔ اس پر جہانگیر کی یہ یادداشت ملتی ہے:

اللہ اکبر

خاصۂ اول ۵۔ بہجم آذر سنہ ۱ داخل کتابخانۂ این نیازمند درگاہ الٰہی شد، حررہ نورالدین جہانگیر ۱۰۱۴ بن اکبر بادشاہ۔

جہانگیر کی اپنی یادداشت سے واضح ہوتا ہے کہ مخطوطے کے کتابخانے میں شامل کرنے سے قبل وہ خود اس کی حیثیت کا تعین کرتا اور اسی کے اعتبار سے وہ مخطوطہ کتابخانے میں اپنی جگہ پر محفوظ ہوتا۔ بظاہر خاصہ کے دو درجے تھے۔ درجہ اول میں تو دیوان سلطان حسین غازی کا نسخہ تھا اور خاصۂ دوم میں بیاض اظہر؛ دیوان سلطان حسین عنایت خاں کی مہر اور عبداللہ چلپی کے دستخط سے مزین ہے۔

(۵) تفتازانی کی شرح مطول کا ایک نسخہ جہانگیر کے کتابخانے میں ۱۰۲۳ ہجری میں داخل ہوا، جیسا کہ جہانگیر ہی کی یادداشت سے ظاہر ہوتا ہے:

اللہ اکبر

مطول در علم فصاحت و بلاغت بخط سید المحققین و سند المدققین میر سید شریف جرجانی .... بعد ملاحظہ داخل کتابخانۂ این نیازمند درگاہ الٰہی شد، سنہ ۱۰ جلوس مطابق ۱۰۲۳ ہجری حررہ نور الدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ غازی۔

یہ نسخہ مسلم یونیورسٹی کتابخانہ کے ذخیرہ حبیب گنج میں محفوظ ہے۔ اور عنایت خاں شاہجہانی، محمد حسن شاہجہانی، عبداللہ خان خازن، شاہ عالمگیر کی مہر، عبداللہ چلپی کے عرض دیدہ اور منعم بیگ قلیج خاں اور خواجہ انور کی یادداشتوں سے مزین ہے۔ سہیل کے خط میں یہ تحریر بھی اس میں موجود ہے: بتاریخ ۵ شہر ذی الحجہ سنہ ۱۶ جلوس مبارک ہمایون اشرف اقدس تحویل درگاہ سہیل شدہ۔ ترقیمہ یہ ہے:

تمت الکتاب بعون ملک الوھاب علی ید العبد الضعیف سید شریف یوم الجمعہ الرابع من شہر رمضان سنہ تسع و ثلاثین و ثمانمائۃ فی بلدۃ ھراۃ الخ

اس نسخہ کا کاتب سید شریف جہانگیر کی تحریر میں سید شریف جرجانی شارح مطول قرار دیا گیا ہے، لیکن اس سلسلے میں ایک دشواری ہے کہ سید شریف جرجانی کی وفات ۸۱۶ میں ہوئی جب کہ نسخہ کی کتابت ۸۳۹ کی ہے، اسی بنا پر مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے مقالاتِ شروانی اور پروفیسر مختار الدین احمد نے مجلۂ علوم اسلامیہ ج ۸ میں کاتب نسخہ کو شریف جرجانی سے الگ شخصیت قرار دیا ہے۔

(۶) کتابخانۂ بانکی پور کی بیاض شمارہ ۱۰۹۱ جہانگیر کے کتابخانے میں پنجم آذر سنہ ۱۰۱۴ میں داخل ہوئی، اس پر شاہزادہ خرم کی یادداشت ہے:

پنجم آذر سنہ ۱۰۱۴ داخل کتابخانۂ اعلیٰ حضرت ظل اللہ نور الدین جہانگیر بادشاہ بن اکبر بادشاہ شد۔ حررہٗ بندہ خرم بن جہانگیر بادشاہ

خرم. جو بعد میں شاہجہاں کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ ہوا اس کی بظاہر قدیم ترین تحریر ہے، جو دستیاب ہوئی ہے۔ اس سے اور اس طرح کے دوسرے مخطوطات سے اس کی کتاب دوستی ظاہر ہوتی ہے۔

بعض مخطوطات ایسے دستیاب ہوئے ہیں، جو اولاً جہانگیر کے کتابخانے میں تھے اور بعد میں شاہجہاں اور دوسروں کی تحریروں سے مزین ہیں، مثلاً:

(۷) صد پند لقمان، بخط میر علی کا ایک نسخہ رام پور (شمارہ ۷۵۶) کی رضا لائبریری میں موجود ہے، اس کی کتابت ۹۴۱ھ میں ہوئی۔ یہ نسخہ ۱۵ویں سال جلوس میں جہانگیر کے کتابخانے میں داخل ہوا:

بتاریخ سوم محرم سنہ ۱۵ داخل کتابخانہ این نیازمند درگاہ الٰہی شد حررہٗ جہانگیر ابن اکبر۔

چند سال بعد یہ شاہ جہاں کے کتابخانہ میں آیا، چنانچہ شاہجہاں لکھتا ہے:

"این پندنامۂ لقمان حکیم وغیرہ کہ بخط خوب امیر علی است۔ بتاریخ بیست و پنجم ماہ آبان الٰہی سنہ ۳ جلوس مطابق سلخ شہر ربیع الاول ۱۰۳۹ھ ہجری در دار الخلافہ اکبر آباد داخل کتابخانۂ این نیازمند درگاہ شد۔

حررہٗ شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ ابن جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی۔ قیمت ہزار روپیہ"

دوسرے سال بادشاہ نے اسے جہاں آرا بیگم کو ہدیہ کر دیا:

این پندنامہ را در ذی الحجہ ۱۰۴۰ ہجری موافق سنہ ۴ جلوس مبارک بفرزند ارجمند سعادت مند برخوردار کامگار بجان برابر بلکہ از جان بہتر جہان آرا بیگم [ہدیہ نمودم]

یہ خاصۂ اوّل کا نسخہ ہے۔ اس پر جہاں آرا کی بھی حسب ذیل یادداشت ملتی ہے:

این چند سخن کہ خواجہ عبداللہ انصاری شیخ الاسلام وقت خود گفتہ است اگر ہزار زبان داشتہ باشم کہ تعریف نتوانم کرد، گوش را وجان و دل

عجیب خبر میدہد، اگر توفیق رفیق گردد - حررہ جہان آرا، مریدِ حضرت شیخ خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ -

حسب ذیل یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں حکیم ہمام کے پاس یہ نسخہ رہا:

پند نامۂ لقمان حکیم و سخنان عبداللہ انصاری کہ بخط میر علی است از [کتابخانۂ حکیم] ہمام است سنہ ۲ -

ملّا صالح اور عنایت کا نام سرِ ورق پر موجود ہے -

(۸) مناجات خواجہ عبداللہ انصاری، کا ایک نسخہ سلطان علی کے خط میں رضا لائبریری رامپور (شمارہ ۷۰۵) میں موجود ہے جس کی کتابت ۹۲۱ ہجری میں ہوئی، یہ نسخہ نفیس خطّاطی کا اعلیٰ نمونہ ہونے کی بنا پر نہایت اہم ہے - جو جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے کتابخانوں میں شامل رہا ہے - جہانگیر کو یہ نسخہ خان خاناں نے پیش کیا تھا، جہانگیر لکھتا ہے:

رسالۂ خواجہ عبداللہ انصاری خط ملا سلطان علی از پیشکش خان خاناں بتاریخ ۲۴ جمادی الاوّل سنہ ۱۰۲۲ - حررہٗ جہانگیر ابن اکبر بادشاہ -

خان خاناں کے کتابخانے میں ۹۹۸ ہجری میں داخل ہوا تھا:

" درتاریخ ۳۵ الٰہی موافق سنہ ۹۹۸ ہجری این کتاب داخل [کتابخانہ] شد .... دوست بندگان و خاک پای ایشاں عبدالرحیم ابن محمد بیرم خان عفی عنہ "

شاہجہاں کی یہ یادداشت ملاحظہ ہو:

بتاریخ بست و پنجم ماہ بہمن الٰہی موافق بیستم شہر جمادی الثانیہ سنہ ۱۰۳۷ھ کہ روز جلوس مبارک است داخل کتابخانۂ این نیازمند درگاہ شد، حررہٗ شہاب الدین محمد شاہجہاں ابن جہانگیر شاہ بن اکبر شاہ

شاہجہاں اور اورنگ زیب کی مُہریں بھی ہیں، جن کی عبارتیں یہ ہیں:

شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ غازی صاحب قران ثانی

بندہ ابوالمظفر محی الدین محمد عالمگیر پادشاہ غازی

اس طرح مزید یادداشتیں نسخہ کی افادیت میں اضافہ کرتی ہیں:

"بتاریخ بست و نہم اردی بہشت ماہ الٰہی سنہ ۱۰۸۹ ہجری داخل کتابخانہ احقر العباد میر کریم الدین خان شد"

"اللہ اکبر بتاریخ ہشتم و بماہ الٰہی سنہ ۲ عرض دیدہ شد"

"اللہ اکبر پانزدہم ماہ اردی بہشت سنہ احد عرض دیدہ شد"

(۹) **دیوان کامران** کا جو نسخہ بانکی پور میں ہے، وہ مشہور کاتب محمود بن اسحاق الشہابی الہروی کے قلم کی یادگار ہے۔ یہ نسخہ بظاہر اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے کتابخانوں میں رہ چکا ہے۔ اکبری کتابخانے کی شمولیت کا ایک ثبوت حسب ذیل یادداشت ہے۔ "تحویل جناب شیخ فیضی از بابت تحویل میر محمد تقی بتاریخ ۲۷ شہر ذی حجہ سنہ ۹۹"۔ جہانگیر نے یہ عبارت درج کی ہے:

دیوان میرزا کامران کہ عم پدر بزرگوار منست بخط محمود اسحاق شہابی حررہٗ نورالدین محمد جہانگیر شاہ اکبر سنہ ۲۰ جلوس موافق سنہ ۱۰۳۵ھ

شاہجہاں کی یادداشت ملاحظہ ہو:

الحمد للہ الذی انزل علےٰ عبدہ الکتاب۔ حررہٗ شاہ جہاں ابن جہانگیر شاہ ابن اکبر شاہ

ممکن ہے، چند دنوں تک بیگم کی ملک میں رہا ہو:

مُہر قیمت اموال نور النساء بیگم

ذیل میں شاہ جہاں کے کتابخانے کے بعض اور نسخوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان پر شاہجہاں کے دستخط موجود ہیں:۔

(۱) **شش رسالۂ سعدی** کا ایک نسخہ بانکی پور، شمارہ ۹۳ میں ہے۔ کاتب میر علی الکاتب بتایا گیا ہے اور سال کتابت ۹۴۴، مگر اس کی یہ نسبت غلط ہے، اس کا اصل کاتب میر باقر ہے، جیسا کہ شاہ جہاں کی ذاتی تحریر سے واضح ہے:

الحمد للہ الذی انزل علیٰ عبدہ الکتاب، حررہٗ

شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی .... خط باقر پسر ملا علیست نام اور اترا شیدہ نام پدر نوشتہ اند۔

مندرجۂ ذیل یادداشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عبدالرحیم خان خاناں کے پاس بھی رہ چکا ہے:۔

در شب یکشنبہ سنہ ۱۰۱۹ ابکتابخانۂ نور دیدہ ...... متعلق ساخت - حررہٗ عبدالرحیم ......

اودے پور میں ۹۸۶ میں عوض دیدہ شدہ، چندے اورنگ زیب کے پاس بھی رہا تھا، جیسا کہ ابوالمظفر محی الدین عالمگیر بادشاہ کی مہر سے ظاہر ہوتا ہے، محمد رحیم بن محمد بیرم کی مہر بھی موجود ہے۔

(۲) **ایک قیمتی فارسی بیاض** کا ایک نسخہ بانکی پور (شمارہ ۱۰۸۹) میں موجود ہے، جس کو علی الکاتب نے لکھا تھا، یہ مجموعہ ۸ جمادی الثانی ۱۰۳۷ کو شاہ جہاں کے کتابخانہ میں داخل ہوا تھا، جیسا کہ ذیل کی تحریر سے واضح ہے:

"این مجموعۂ نفیس بتاریخ بیست و پنجم ماہ بہمن موافق ہشتم جمادی الثانیہ سنہ ۱۰۳۷ کہ روز جلوس مبارک است داخل کتابخانۂ این نیاز مند درگاہ شد، حررہٗ شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ ابن جہانگیر بادشاہ ابن اکبر بادشاہ غازی، ۲۵ خرداد سنہ ۲ جلوس تحریر یافت۔"

یہ مجموعہ نورجہاں کے پاس بھی رہ چکا ہے، جیسا کہ ظاہر ہے:

"قیمت پانصد روپیہ از بابت نورجہاں بیگم"

(۳) **تاریخ خاندان تیموریہ** کا جو نفیس مصور نسخہ بانکی پور میں ہے۔ اس پر شاہ جہاں کی حسب ذیل تحریر موجود ہے:

"این تاریخ کہ مشتمل است بر مجمل احوال حضرت صاحبقران گیتی ستان و اولاد امجاد آن حضرت و سوانح ایام حضرت عرش آشیانی انار اللہ برہانہ - تا سال بیست و دوم در عہد دولت شاہ بابا تصنیف شدہ،

محررہ۔ شاہ جہان بادشاہ بن جہانگیر بادشاہ بن اکبر بادشاہ۔

اِس میں متعدد امرا کی مُہر وغیرہ ہے جن میں محمد باقر، عبدالغفور، خواجہ سہیل، عبداللہ چلپی اور نور محمد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ واضح ہو کہ یہ خاندانی نسخہ مختلف کتابخانوں کی زینت رہ چکا ہوگا۔

(۴) **چہل مجلس** کا ایک نسخہ جہانگیری دربار کے ایک کاتب عبدالرحیم روشن قلم کا لکھا ہوا، شاہ جہاں کے کتابخانے میں موجود تھا، اس نسخے کی کتابت ۱۰۲۰ ہجری میں آگرے میں ہوئی تھی، شاہ جہاں کی یادداشت یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"الٰہی بتاریخ بیست و پنجم بہمن موافق ہشتم جمادی الثانیہ ۱۰۳۷ کہ [روز جلوس] مبارک است داخل کتابخانہ [بناہ مند] درگاہ شد۔

محررہ شہاب الدین (محمد) شاہ جہان ابن جہانگیر شاہ بن اکبر بادشاہ"

اس میں مغل اُمراء کی یادداشتیں اور عرض دیدہ ہیں، جن میں خواجہ سہیل، محمد باقر، نور محمد، عبداللہ چلپی، عنبر، دولت قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یادداشت یہ ہے:

اَللہُ اَکبر

ماہ فرودین سنہ ۲ مطابق ۱۰۳۸ ہجری حسب الحکم از تحویل عنبر تحویل

دولت تحویلدار کتابخانہ محل شد

اورنگ زیب بڑا ذی علم بادشاہ تھا۔ اس کے کتابخانے کی متعدد کتابیں موجود ہیں، لیکن اس کی یادداشتیں نہیں ملتیں، البتہ خود اس کی مُہریں اور اس کے کتابخانے کے تحویلداروں کی مُہریں مل جاتی ہیں، خود کاتب تھا اور قرآن کی کتابت اس کا مشغلہ تھا۔ چنانچہ اس کے ہاتھ کے بعض نسخے کتابخانوں میں محفوظ ہیں۔

۱ **حال نامہ عارفی** یا مثنوی گوی و چوگان کا ایک نسخہ جو ذخیرہ حبیب گنج (مسلم یونیورسٹی لائبریری) میں محفوظ ہے۔ کاتب علی الحسینی ہے اور سنہ کتابت ۹۲۶ بمقام ہرات، اورنگ زیب کو یہ نسخہ محاصرۂ گولکنڈہ کے موقع پر ملا تھا۔ جیسا کہ حسبِ ذیل یادداشت

سے واضح ہے:

کتاب گوی و چوگان بخط استاد الکتاب ملا میر علی بابت فتح گلکنڈہ غرہ ذی الحجہ، سال سی و یکم جلوس اقبال تحویل سہیل نمودہ شد۔

سہیل اس زمانے کا اہم امیر تھا جس کو کتابخانوں کی نگرانی کا عہدہ سپرد تھا، جس کی تحویل میں اہم نسخے رہ چکے ہیں، ان میں دیوان حافظ (بانکی پور شمارہ ۱۵۱) دیوان کامران (بانکی پور شمارہ ۲۳۷) تاریخ خاندان تیموریان (بانکی پور شمارہ ۵۵۱) میں رہ چکی تھیں اس مخطوطے کا تعارف پروفیسر مختار الدین احمد مجلہ علوم اسلامیہ ج ۱ میں کرا چکے ہیں۔

(۲) **مثنوی مولانا روم** کا ایک نسخہ حبیب گنج کے ذخیرہ میں ہے، اس کی کتابت ۱۰۱۲ھ کی ہے، یہ عالمگیر بادشاہ کے کتابخانے میں شامل رہ چکا ہے۔ چنانچہ اس پر اس بادشاہ کی چار مہریں ثبت ہیں۔ جن میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: "محمد اورنگ زیب بادشاہ"

(۳) **لوائح جامی** کا ایک نسخہ حبیب گنج کے ذخیرہ میں ہے، اس کے لوح پر یہ عبارت درج ہے:

"لوائح بابت گذرانیدہ میر معز، چہاردہم، ربیع الثانی ۱۰۹۶ داخل کتابخانۂ سرکار عالی شد"

اس عبارت کے اوپر قابل خان خانہ زاد عالمگیر بادشاہ کی مہر ہے، ایک اور عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۳۰ جلوس میں شایستہ خاں کے اموال کی بابت محمد باقر کی تحویل میں سپرد کی گئی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۹۶ھ میں شایستہ خاں کو مرحمت ہوئی۔ بہر حال یہ نسخہ اورنگ زیب کے کتابخانے میں شامل رہ چکا ہے۔

(۴) **حصن حصین**، تالیف امام جزری کا ۸۹۰ھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ میرک شاہ محدث کے قلم کے حواشی کے ساتھ، شاہزادہ اعظم شاہ نے عالمگیر بادشاہ کو سنہ پچاس جلوس میں پیش کیا تھا، یہ نسخہ عالمگیر کے کتابخانے کا ہے اور اب مسلم یونیورسٹی کے ذخیرہ حبیب گنج میں محفوظ ہے۔

(۵) **منہاج العابدین**، تالیف امام غزالی کا ایک نسخہ ذخیرۂ حبیب گنج میں موجود ہے۔ یہ نسخہ شاہزادہ محمد معظم شاہ بن عالمگیر بادشاہ غازی کے کتابخانے میں رہ چکا ہے۔

جیسا کہ شاہزادے کی مُہر سے ظاہر ہے:۔

فرخ سیر کے کتابخانے کے مخطوطات مِل جاتے ہیں۔ کلام مجید کا ایک نسخہ جو اس کے کتابخانے میں شامل تھا، اب مسلم یونیورسٹی کے ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ ہے۔ اِس کا کاتب ابوالفتح نامی ایک شخص ہے۔

دکن کے بہمنی خاندان کے بادشاہ علم دوست تھے، سلطان محمود شاہ کے دور کی ایک کتاب، جو ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ ہے، دستیاب ہوگئی ہے، اِس کا نام مشکوٰۃ المصابیح ہے۔

مشکوٰۃ المصابیح کا ایک نسخہ ۸۷۷ھ شہر بیدر میں لکھا گیا۔ کاتب ابوسعید بن حسین تاجر مشہور بہ مال امیری، یہ نسخہ سلطان محمود شاہ بہمنی (م : ۹۲۴) کی خدمت میں نذر ہوا تھا۔

ہمایوں کی بیگم حمیدہ بانو بیگم کتابوں کی شائق تھی، چنانچہ میر علی خطاط کی مرتّب کردہ ایک بیاض جو نیشنل میوزیم دہلی میں محفوظ ہے اس کے پاس کچھ دنوں رہی تھی، اِس پر اس کی مُہر کندہ ہے۔ مُہر کی عبارت یہ ہے:

سطر اوّل   خامہ با توقیع

سطر دوم   حمیدہ بانو بیگم

سطر سوم   مہر او آئینۂ سپہرِ دولت باشد

سطر چہارم   ۹۶۸

مغل شاہزادگان میں داراشکوہ بڑا عالم و فاضل گذرا ہے۔ تصوّف سے اس کو خاص لگاؤ تھا۔ اِس بنا پر وہ قادری لکھتا تھا۔ اِس کی دونوں کتابیں "سفینۃ الاولیاء" اور "سکینۃ الاولیاء" اس کے عارفانہ رجحانات کی مظہر ہیں، وہ سنسکرت کا بھی عالم تھا۔ چنانچہ اس نے اپنشد کو فارسی کا جامہ پہنایا جو حال ہی میں ایران سے ڈاکٹر تاراچند اور جلالی نائینی کی شرکت میں "سرِّ اکبر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ داراشکوہ کا کتبخانہ بھی تھا، غالباً اسی کتابخانے میں اُسے دیوانِ حافظ کا وہ نسخہ ملا تھا جس میں ہمایوں اور جہانگیر کی تحریریں بھی تھیں۔ رضا لائبریری رام پور میں نفحات الانس کا ایک قیمتی مخطوطہ ہے، وہ ۱۰۳۸ھ میں داراشکوہ کے کتابخانے میں داخل ہوا تھا، جیسا کہ اس یادداشت سے ظاہر ہوتا ہے:

"ایں نفحات کہ بسیار صحیح است و ماخوذ در سخواندہ بہ تصحیح رسانیدہ ام

بتاریخ بیست و پنجم شہر رمضان المبارک سنہ ۱۰۳۸ھ داخل کتابخانۂ این نیازمند درگاہ شد ، حررہٗ داراشکوہ

" بتاریخ بیست و پنجم ماہ ذی قعدہ ۱۰۴۸ ہجری در مقام نوشہرہ توفیق اتمام یافت۔

—

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

" الحمد للہ کہ از ابتدا تا انتہام حبہ ثانی بشرط مطالعہ این کتاب مستطاب کہ از جملہ تصانیف تمام فائدہ .... دل این فقیر مستقیم .... الفقیر محمد (داراشکوہ) قادری "

داراشکوہ جامی کا معتقد تھا۔ چنانچہ سفینۃ الاولیاء میں جامی کے متعلق اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے :

" این فقیر ہمیشہ تصانیف نظم و نثر ایشان را مطالعہ می نماید و از برکت آن کلام حقیقت انتظام فائدہ ہا می ربایدء و این کتاب (سفینۃ الاولیاء) راکہ می نویسد ہمہ از تتبع و شاگردی ایشانست "

اِس عقیدت کی توثیق نفحات کے نسخے پر داراشکوہ کی یادداشتوں سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

مغل شاہزادیوں میں علمی اعتبار سے جہان آرا کا نام نہایت مشہور ہے۔ وہ دو کتابوں کی مؤلفہ ہے ، ایک " مونس الارواح " اور دوسری " صاحبیہ " اس کو کتابوں کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ کئی کتابوں پر اس کی یادداشتیں بھی پائی جاتی ہیں ، کم از کم دو مخطوطے خود اس کی کتابت کے اس وقت تک موجود ہیں ؛ بعض مخطوطے اس کی مُہر سے مزیّن ہیں ۔ ان میں قابلِ ذکر نسخے حسب ذیل ہیں :

(۱) بیاض فارسی ؛ یہ فارسی بیاض بنارس یونیورسٹی کے کلابھون میں محفوظ ہے ، اس میں جہان آرا کی حسب ذیل یادداشت موجود ہے :

" اللہ محمد علی

" این بیاض را بفرزند برخوردار قابل لائق بدرالنساء بیگم دادم۔

" رقمہ الحقیر الفقیر جہان آرا ، بنت شاہ جہان بادشاہ غازی "۔

شہزادی بدرالنساء اورنگ زیب کی بیٹی تھی، جو ۱۰۸۰ ہجری میں فوت ہوئی۔

(۲) رضا لائبریری رام پور میں ایک مجموعے میں پند لقمان اور رسالہ خواجہ عبداللہ انصاری شامل ہیں، جو میر علی خطاط کا مکتوبہ ہے۔ اس پر جہانگیر کی تحریر ہے پس شاہ جہاں کی یادداشت ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے دوسرے سال جلوس میں یہ نسخہ جہاں آرا کو عنایت کر دیا تھا۔ جہاں آرا کی بھی دو یادداشتیں اس پر موجود ہیں، اس کا ذکر قبلاً ہو چکا ہے۔

(۳) کتابخانہ مسلم یونیورسٹی، ذخیرہ حبیب گنج میں اوراد و وظائف کا ایک مجموعہ ہے، جو اپنے ابتدائی کلمات کی وجہ آیات بینات کے نام سے یاد ہوا ہے، اوراد عربی میں مع فارسی شرح کے ہیں اور پورا مجموعہ جہاں آرا، کے خط میں ہے۔ ایسا معلوم ہوا ہے کہ یہ مجموعہ خود جہاں آرا نے شاہ جہاں کے قلعہ آگرہ میں نظربندی کے موقع پر جمع کیا تھا، جیسا کہ سرورق کی اس عبارت سے ظاہر ہے:

> این آیات بینات و کلمات طیبات ریختۂ قلم مشکین رقم نواب احتجاب عصمت جناب مریم الزمانی بلقیس الدورانی جہان آرا بیگم، بنت پادشاہ عادل باذل مغفور حضرت شہاب الدین محمد شاہ جہان پادشاہ المخاطب بہ صاحبقران ثانی غازی است کہ ہنگام عزلت وانزوا با والد ماجد در قلعہ شہر بنیاد اکبر آباد، اوقات فرخندہ ساعات را بہ طاعت الہی و اطاعت قبلہ گاہی می گذرانید متوجہ تحریر آن گردیدہ اند۔"

خاتمے کی تحریر سے سال کتابت ۱۰۷۳ معلوم ہوتا ہے:

> کتبہ الخادم الفقیرا جہان آرا، بتاریخ سلخ شہر رجب سنہ یکہزار و ہفتاد و سہ ہجری تحریر یافت۔

اس مخطوطے کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عالمگیر (م: ۱۱۱۸)۔ بعد ازاں فرخ سیر کے کتابخانے میں شامل ہوتا ہے، پھر محمد شاہ بادشاہ غازی (م: ۱۱۶۱) اور پھر شاہ عالم ثانی (م: ۱۲۲۱) کے پاس پہنچتا ہے اور آخر میں شاہان اودھ کے کتابخانے میں پہنچا ہے جیسا کہ نصیرالدین حیدر (م: ۱۲۵۳) اور امجد علی شاہ (م: ۱۲۶۳) کی مہروں سے، جن میں یہ اشعار

کندہ ہیں، ظاہر ہوتا ہے :

خوش است مُہر کتب خانۂ سلیمان جاہ
بہر کتاب مزین چو نقش بسم اللہ

ناسخ ہر مُہر شد چون شد مزین بر کتاب
خاتم امجد علی شاہ زمان عالی جناب

کتابخانۂ شاہانِ اودھ سے یہ نسخہ ٹونک کے حافظ عبداللہ البصیر کے پاس پہنچا ہے جہاں سے ۱۹۳۹ء میں کتابخانۂ حبیب گنج میں منتقل ہوتا ہے۔

(۴) کتابخانۂ خدابخش میں حسینی کے شہنشاہ نامہ کا ایک نسخہ ہے، جس پر جہان آرا کی ایک مدور مُہر ہے، جس میں یہ الفاظ ہیں :

جہان آرا بیگم بنت شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی۔

یہ شاہی نسخہ ہے، جس پر مغل اُمراء کی تحریریں اور مُہریں ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ترکی میں تھا، وہاں سے عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آیا اور بالآخر جہان آرا کے استفادہ میں رہا۔

(۵) بیاض فارسی : یہ بیاض محمد اشرف صاحب انجینئر کے پاس تھی، اب کان پور میں ایک سندھی صاحب ذوق کی مِلک میں ہے ؛ اس میں آخری صفحے پر دو مُہریں ہیں، ایک میں جہان آرا بنت شاہ جہاں اور دوسری میں محمد احسن اللہ خاں ۱۱۶۳ درج ہے۔ بیاض پر ایک یادداشت ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خود جہان آرا کے ہاتھ کا نسخہ ہے :

"این بیاض با سواد سرکار دولت مدار نواب عصمت جناب بیگم صاحبہ زمان و ملکۂ جہان نواب جہان آرا بیگم بنت شاہ جہان پادشاہ غازی خلد اللہ مُلکہٗ و سلطنتہٗ، فی الواقع نادرۂ روزگار است، محفوظ ماند"

مغل امراء میں خان خاناں کے کتابخانے کے بعض نسخوں کا پتہ چلا ہے چنانچہ :

(۱) **شش رسالہ سعدی** کے نسخے پر اس کی یادداشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نسخہ اسی کے کتابخانہ میں تھا، جو بالآخر شاہ جہاں کی ملکیت ہوا اور جس پر اس نے اپنی تحریر ثبت کی' اس کا تعارف ہو چکا ہے۔

(۲) **مناجات عبداللہ انصاری** (رامپور ۸۵) جو جہانگیر اور شاہ جہاں کے کتابخانوں کی زینت رہی، وہ اولاً خان خاناں کے کتابخانے میں تھی چنانچہ ۹۹۸ ہجری کی یادداشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سنہ میں یہ نسخہ خان خاناں کے پاس آیا تھا۔

(۳) خان خاناں کے پاس میر علی الکاتب کے ہاتھ کا **یوسف زلیخا** کا ایک نفیس نسخہ تھا، جس کو اس نے ۱۰۱۹ ہجری میں جہانگیر کی خدمت میں پیشکش کر دیا تھا، جیسا کہ مآثر رحیمی کی حسب ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے :

> در روز دوشنبہ دوم محرم سنہ ہزار و نوزدہ دار الخلافۂ اکبر آباد بسایۂ چتر آسمان پایہ آرائش پذیرفت .... و درایں روز یوسف زلیخا بخط ملا میر علی مصور و مذہب کہ ہزار مُہر قیمت داشت و سپہ سالار خان خانان بطریق پیشکش ارسال داشتہ بود، معروض گردید۔

بانکی پور میں **یوسف زلیخای جامی** کا ایک عمدہ نسخہ میر علی کاتب کا لکھا ہوا ہے' اس کی تاریخ کتابت ۹۳۰ اور مقام کتابت ہرات ہے، یہ نسخہ بہت مذہب اور مزین نسخہ ہے، بانکی پور کتابخانے کے کیٹلاگر کا خیال ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے، جو صاحب مآثر رحیمی کے قول کے مطابق خان خانان نے جہانگیر کو پیش کیا تھا، لیکن خود نسخے سے اس سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں ہوتی۔

(۴) پٹیالہ میوزیم میں ایک بیاض ہے اس کا کاتب ہمام المنشی المرشدی اور سال کتابت ۹۴۸ ہے۔ خان خاناں کو یہ بیاض گووا سے ہاتھ آئی، جیسا کہ ذیل کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے :

> در تاریخ نہصد نود وسہ کہ در احمد آباد بود، بعضی از خدمتگاران را بجہت ابتیاع اسباب بہ گووہ فرستادہ بود، از گووہ جی جی ..... بطریق پیشکش

این کتاب را فرستادہ بود و استدعائی کہ نمودہ بود موافق ارادہ اسباب مایحتاج رسید۔ حررہٗ عبدالرحیم بن محمد بیرم عفی عنہ۔

اسی صفحے پر حسب ذیل یادداشت بھی مندرج ہے:

"در وقتی کہ جہانگیر بادشاہ این غریب را بخدمت دکن ہمراہ شاہزادہ پرویز فرستادہ من این کلیات نواب خانخانان بہ برخوردار الملقب خان عالم فرستاد۔"

اس پر اعتماد خان، عنبر، منصور، خان عالم وغیرہ کی مہریں اور عرض دیدے ہیں۔

دکن کے بہمنی خاندان کے اکثر بادشاہ و امرا بڑے علم دوست و فاضل ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض بادشاہوں کے کتابخانوں کی کتابیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ سلطان محمود شاہ بہمنی کے دور کی ایک کتاب ذخیرہ حبیب گنج مسلم یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کا نام "مشکوٰۃ المصابیح" ہے، یہ مخطوطہ ۸۷۷ ہجری میں بیدر میں لکھا ہے، کاتب کا نام ابوسعید بن حسین ہے۔

مغلوں کے معاصر دکنی سلاطین میں شاہانِ گولکنڈہ جو قطب شاہ اور شاہانِ بیجاپور جو عادل شاہ کے لقب سے ملقب تھے، علم و فضل، شعر و ادب کے لحاظ سے کافی نامور ہیں، ان بادشاہوں کی کتابخانوں اور کتابوں سے دلچسپی کا کافی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ قطب شاہی خاندان کے بعض مخطوطات ذخیرۂ حبیب گنج میں موجود ہیں۔ اِن میں سے ایک کاتبی کی مجمع البحرین کا نسخہ ہے۔ اس پر ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷-۹۸۸)، محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸-۱۰۲۰)، اور محمد قطب شاہ (۱۰۲۰-۱۰۳۵) کی مہریں ہیں، جن میں یہ عبارتیں درج ہیں:

شہے کہ نقش نگین ساخت مہر آل مقیم
بود سپہر کرم قطب شاہ ابراہیم (ابراہیم قطب شاہ)

ملکِ جہان مرا کہ بزیر نگین شدہ
از حکم پادشاہ جہان آفرین شدہ (محمد قلی قطب شاہ)

ملک سلیمان ز حق گشتہ میسر مرا
نقش نگین دل است حیدر صفدر مرا (محمد قطب شاہ)

دوسرا نسخہ دیوان شمس الدین طبسی کا ہے۔ جس کی کتابت کی تاریخ احدی وعشرین و سبعمائۃ (= ۷۲۱ھ) ہے، گویا شاعر کی وفات کے سو سال کے اندر اس کی کتابت ہوئی، اس بنا پر خاصہ قابل توجہ نسخہ ہے؛ علاوہ بریں یہ مندرجہ بالا تینوں قطب شاہی سلاطین کے کتابخانے میں شامل رہ چکا ہے۔ چنانچہ ابراہیم، محمد قلی اور محمد قطب شاہ تینوں کی مہریں اس پر ثبت ہیں۔ پہلی مہر دقت سے پڑھی جاتی ہے، دوسری صاف ہے، مگر تیسری مٹی ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ جس طرح مجمع البحرین کا نسخہ تینوں بادشاہوں کے کتابخانے میں رہ چکا ہے، دیوان شمس کا یہ نسخہ انہیں تینوں سے وابستہ رہا ہے لیکن چوتھے بادشاہ عبداللہ کی مہر نہ اس نسخہ پر ہے اور نہ مجمع البحرین پر، جو اس کے کتابخانے کے عدم شمول پر دال ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کی علم دوستی کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ محمد حسین تبریزی نے اپنی شہرۂ آفاق فرہنگ برہان قاطع اسی بادشاہ کے نام معنون کی ہے۔

تفسیر جلالین کا ایک مطلا و مذہب نسخہ ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ ہے، رضی الدین تفرشی نے ۱۰۷۹ھ میں حیدرآباد میں اس کی کتابت کی تھی، اس میں دو جگہ سلطان ابوالحسن قطب شاہ عرف تاناشاہ کے طلبیے ہیں۔

عادل شاہی خانوادے کا سب سے اہم رکن ابراہیم عادل شاہ ثانی ہے، وہ جامع حیثیات شخصیت کا مالک تھا، مختلف علوم و فنون میں دخیل تھا۔ موسیقی اس کا محبوب مشغلہ ہے اور اس کی کتاب نورس ہندوستانی موسیقی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے دربار میں ظہوری اور فرشتہ گذرے ہیں، اس کا کتابخانہ تھا، اس کی چند کتابوں کا واضح طور پر پتہ چلا ہے؛ اس کے دربار کا خطاط شاہ خلیل اللہ تھا، جو ایران میں شاہ عباس کا خطاطی میں استاد تھا، ابراہیم عادل شاہ کے دربار سے منسلک ہوا تو اس فن میں بڑی شہرت پائی۔ ظہوری نے اس دربار کی ممتاز مشہور ترین شخصیات میں اس کو شمار کیا ہے؛ شاہ خلیل اللہ سیاسی امور میں بھی دخیل تھا، چنانچہ عادل شاہی سفیر کی حیثیت سے ایران بھی گیا ہے اور مغلوں کے خلاف دکنی سلاطین کے معاملہ کی زبردست وکالت کی ہے۔

تذکرۂ خوشنویسان کے قول کے مطابق اس نے ابراہیم عادل شاہ کی کتاب "نورس"

کا ایک شاندار نسخہ تیار کیا۔ جس پر اس کو بادشاہ کی طرف سے بڑا انعام ملا۔ اتفاق سے اس کے
ہاتھ کے چھ منتشر ورق کا پتہ حیدرآباد میں چلا، جو بعد میں نیشنل میوزیم نے خرید لئے، یہ اوراق
خطاطی کا بہترین نمونہ ہیں اور اس کے حاشیہ کی تزئین سے واضح ہے کہ یہ شاہی نسخہ ہوگا، راقم
نے ان اوراق کا عکس شاہ خلیل اللہ کی زندگی کی تفصیل کے ساتھ "نذرِ ذاکر" (ص ۴۳۲-۴۳۸)
میں شائع کر دیا ہے۔ خیال ہے کہ خلیل اللہ کا یہ مکشوف اوراق اسی نسخے کے ہوں گے، جو
ابراہیم عادل شاہ کے لئے تیار ہوا تھا۔

(۱) آخری صفحہ موجود ہے، جس پر ترقیمہ یہ ہے:

"خلیل اللہ غفر اللہ ذنوبہ دستر عیوبہ"

(۲) ابراہیم عادل شاہ کے کتب خانے کا کتاب نورس کا دوسرا نسخہ عبداللطیف مصطفےٰ[1]
کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ خط نسخ ثلث میں ہے۔ اس کی خطاطی اور دوسرے اہتمام نسخے کی
نفاست پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ نسخہ سنٹرل ریکارڈس آف حیدرآباد میں تھا اور اس کے بہتر ورق
کا عکس راقم کے پاس موجود ہے۔ اس نسخے کی یادداشت سے ظاہر ہے کہ خود ابراہیم عادل شاہ
کے کتابخانے سے اس کا تعلق تھا۔

"کتاب نورس"، دو قلمی خط عبداللطیف جلد زرد با ترنج و زنجیرۂ طلا و لبتہ اوراقِ چہل
جمع کتابخانۂ عامرہ شدہ بتاریخ ۲ محرم ۱۰۲۲"۔ اس پر عادل شاہ کی مُہر ہے۔ جس میں حسب ذیل
فقرے درج ہیں: "عہد ابراہیم عادل شاہ مُہر تبدیل"

(۳) ابراہیم کے دور کا ایک اہم خطاط عبدالرشید ہے، اس کے ہاتھ کے کئی مرقعے مرقع
عادل شاہی میں موجود ہیں، ایک صفحہ میں کتاب "نورس" کی چار سطریں لکھی ہیں؛ اس نے نورس
کا ایک مکمل نسخہ تیار کیا تھا، جو ابراہیم عادل شاہ کے کتابخانے میں شامل تھا۔ جیسا کہ حسب ذیل

---

[1] ابراہیم عادل شاہ کے دور کے دو اور خطاطوں نے کتاب "نورس" لکھی تھی، ایک سلیمان تھا جس نے نور سپور
میں لکھا تھا (ایک صفحہ کا عکس نذرِ ذاکر (ص ۴۴۲) میں ملاحظہ فرمائیے۔ — دوسرا عبدالحلیم پسر مصطفےٰ، اس
وقت کے اور لوگوں کی طرح یہ دونوں اپنے کو بادشاہ کا شاگرد لکھتے تھے۔

تحریر سے واضح ہے :

"کتاب نورس خط ریحان کاتب عبدالرشید جلد سرخ با ترنج و زنجیرہ طلانوبستہ بابت جامدار خانہ جمع کتابخانہ عامرہ شد۔ بتاریخ ۱۷ ماہ جمادی الاول ۱۰۳۷ اوراق سی و دو۔"

(۴) ابراہیم عادل شاہ کے کتابخانے کا ایک اور اہم نسخہ کتابخانہ دیوان صاحب باغ مدارس میں راقم کی نظر سے گذرا، یہ خمسۂ امیر خسرو کا نہایت نفیس مصور نسخہ ہے جس پر ایک یادداشت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ابراہیم عادل شاہ کے کتابخانے کی زینت رہ چکا ہے، اس نسخے کی ایک بے نظیر خصوصیت یہ ہے کہ اس کی مصوری مغل دور سے قبل کی ہے۔ اور احتمال یہ ہے کہ شاید اس نسخہ کی کتابت اور تصویرکشی ہندوستان میں ہوئی ہو، چونکہ مغل دور سے قبل کے مصور نسخے نہیں ملتے۔ اس بنا پر اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، ابراہیم عادل شاہ خود بڑا صاحب نظر تھا، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ نسخہ یقیناً بہت قیمتی ہوگا۔

ابراہیم عادل شاہ خطاط بھی تھا، چنانچہ اس کی خطاطی کے کافی نمونے دستیاب ہوگئے ہیں، ۱۰۲۳ ہجری میں اس نے قرآن کریم کی دو سورتیں، سورۂ مائدہ، سورۂ انعام نقل کی تھیں، اس کا نسخہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے۔ اس کے ایک صفحہ کا عکس 'تذکرۂ ذاکر' (ص ۱۴۴) میں راقم الحروف کے توسط سے شائع ہوگیا ہے۔

(۵) صحیح بخاری جلد اول کا ایک نسخہ حبیب گنج کے ذخیرہ میں موجود ہے۔ وہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے کتابخانے کا ہے، جیسا کہ خاتمے کی تحریر سے ظاہر ہے :

"جلد اول صحیح بخاری بخط نسخ عرب در آخر کتاب خط حضرت شیخ المحدثین عفیف الدین گازرونی است۔ جلد سیاہ ترنج سرخ و جدول طلانوبستہ بابت فتح شہر محمد آباد المعروف بہ بیدر جمع کتابخانہ معمورہ عالم پناہ ابراہیم عادل شاہ خلد اللہ ملکہ، شدہ ۹ شعبان ۱۰۲۸"

کتابخانہ ٹیپو سلطان : میسور میں اٹھارہویں صدی میں ایک مشرقی کتابخانہ

کا پتہ چلتا ہے، جو ٹیپو سلطان کے کتابخانے کے نام سے معروف ہوا، اس کتابخانے کی ایک فہرست انگریزی زبان میں مسٹر اسٹی ورٹ نے تیار کر کے چھاپی۔ یہ مطبوعہ فہرست تو بعض کتابخانوں میں مل جاتی ہے، لیکن ٹیپو سلطان کے کتابخانے کے قلمی نسخے منتشر ہو گئے، ان میں بیشتر کتابیں یورپ کے کتابخانوں میں پہنچ گئیں، ممکن ہے کچھ مخطوطے ہندوستان کی بھی لائبریریوں میں مل جائیں، بہر حال میسور کا یہ قیمتی ذخیرہ اب ناپید ہے۔ گویا وہ خطہ ایک اہم علمی میراث سے محروم ہو گیا۔

کتابخانۂ اودھ: لکھنؤ میں شاہانِ اودھ کا کتابخانہ بہت معروف تھا، اس میں اہم قلمی نسخے موجود تھے۔ بڑا حصہ کتابخانہ موتی محل میں تھا۔ اس کی ایک جلد وضاحتی فہرست اسپرنگر نے غدر سے پہلے چھاپ دی تھی۔ لیکن بعد میں اس کی کتابیں منتشر ہو گئیں، اس کے متعدد نسخے ہندوستان اور یورپ کے کتابخانوں میں محفوظ ہیں۔ میرے خیال میں یہ منتشر نسخے اتنی تعداد میں ہیں کہ ایک چھوٹا سا کتابخانہ بن سکتا ہے، ذیل میں کچھ کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ اسولہ واجوبۂ رشیدی: رشید الدین فضل اللہ وزیر غازان خاں بڑا ذی علم وزیر تھا، اس کی تاریخ جامع التواریخ اپنی وسعت اطلاع کے لحاظ سے فارسی تاریخوں میں بے نظیر ہے، وہ کئی اور عربی و فارسی کتابوں کا مؤلف ہوا ہے، اس کی اواخر عہد کی کتاب "اسولہ واجوبہ رشیدی" ہے۔ جو علم و فن کا ایک طرح کا دائرۃ المعارف ہے، اس کا ایک فارسی نسخہ مسلم یونیورسٹی کے ذخیرہ اٹاوہ میں موجود ہے، اسولہ واجوبہ کا ایک فارسی نسخہ تہران اور دو ترکی میں ہیں، ترکی میں عربی روایت بھی موجود ہے۔ یہ نسخہ شاہان اودھ کے کتابخانے میں رہ چکا ہے اور اس پر حسب ذیل تین بادشاہوں کی شروع اور آخر کتاب میں مُہریں ہیں۔

نصیر الدین حیدر، مُہر کا سجع یہ ہے:

خوش است مُہر کتب خانۂ سلیمان جاہ
بہر کتاب مزین چو نقش بسم اللہ

امجد علی شاہ کی مُہر کا سجع یہ ہے:

ناسخ ہر مُہر شد چون شد مزین بر کتاب
خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب

واجد علی شاہ کی مُہر کی عبارت یہ ہے:

ثابت و پُر نور بادا تا فروغِ آفتاب
خاتمِ واجد علی سلطان عالم بر کتاب

(۲) **کتاب الصیدنہ نسخہ**: موزۂ برطانیہ کا یہ اہم نسخہ اودھ کے بادشاہوں کے کتابخانے کا ہے، چنانچہ شروع اور آخر میں نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی مندرجہ بالا مُہریں ہیں۔ کتاب الصیدنہ بیرونی کی عربی صیدنہ کی فارسی روایت ہے۔ مترجم ابوبکر بن عثمان بن علی کاشانی ہے، جس نے سلطان التتمش کے عہد میں اس کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ بیرونی کا اصل عربی نسخہ بروسہ ترکی کے کتابخانے میں ہے، یہ عربی نسخہ اور فارسی روایت دونوں زیرِ چاپ ہیں، برٹش میوزیم کے نسخہ کا عکس راقم کے ایک تفصیلی مقدمے کے ساتھ عنقریب شائع ہو جائے گا۔

(۳) **جواہر العلوم ہمایونی**: ایک شخص محمد فاضل بن محمد علی سمرقندی نے دائرۃ المعارف کے انداز کی یہ کتاب ہمایون بادشاہ کے عہد میں ہندوستان میں تالیف کی، اس کا ایک اعلیٰ درجہ کا نسخہ جو ۸۱۶ اوراق پر مشتمل ہے، مسلم یونیورسٹی کے کتابخانے میں موجود ہے۔ جو قبلاً شمس العلما، پروفیسر عبد الغنی صاحب کی مِلک میں تھا، اور ان کے پاس شاہانِ اودھ کے کتابخانے سے منتقل ہوتا ہوا پہنچا تھا، جیسا کہ شروع اور آخر کتاب میں نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی مُہروں سے ظاہر ہے۔ اس کے مندرجات کی تفصیل History of Persian at the Moghal Court کی جلد دوم میں پروفیسر موصوف نے درج کر دی ہے۔

(۴) **دیوان امیر شاہی سبزواری** کا ایک نسخہ حبیب گنج کے ذخیرے میں ہے، اس پر تین مہریں ہیں۔ ایک بخطِ سیاہ نواب آصف الدولہ بہادر کی جس کی عبارت یہ ہے:

"یحیٰ خان بہادر ہزبر جنگ آصف الدولہ"

دوسری مہر نصیر الدین حیدر کی اور تیسری امجد علی شاہ کی؛ یہ آخری دو مہریں حسب دستور شنگرفی ہیں اور ان کی وہی عبارتیں ہیں، جو اوپر درج ہو چکی ہیں۔

(۵) **بوستان شیخ سعدی** کا ایک خوشخط نسخہ، ذخیرۂ حبیب گنج میں ہے۔ جس پر نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی مہریں ہیں، جن کی عبارتیں وہی ہیں جو اوپر درج ہو چکی ہیں۔

(۶) **تاریخ فارس**، کاتب خانہ زاد بارگاہ آسمان جاہ سلطانی حسین علی، یہ ایک انگریزی سفرنامہ کا ترجمہ ہے، جو غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کے حکم سے ہوا۔ پورا ترجمہ بادشاہ کی اصلاح سے مزین ہے، اس نسخے پر شاہانِ اودھ کی چار مہریں ہیں۔ ایک نصیر الدین حیدر، دو امجد علی شاہ، چوتھی واجد علی شاہ کی۔

تفصیلات بالا سے ہندوستان کے قدیم کتابخانوں اور ان کی بعض اہم کتابوں کی بابت سرسری معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ یہاں کی بیشتر کتابیں برباد ہو گئیں۔ کچھ انگریزوں کے توسط سے ۱۸ ویں، ۱۹ ویں صدی میں یورپ منتقل ہوئیں اور وہاں اہم مشرقی کتابخانے وجود میں آئے، خصوصاً انڈیا آفس کا کتابخانہ یہیں کی گئی ہوئی کتابوں سے بھرا ہے۔ ہمارے ملک کے عظیم شاعر ڈاکٹر محمد اقبال ـــ ان کتابخانوں کی عربی و فارسی کی کثیر کتابوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور حیرت و حسرت کے جذبات سے لبریز ہو کر ایک نظم لکھی جس کی آخری دو بیت یہ ہیں:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی | جو ان کو دیکھئے یورپ میں دل ہوتا ہے سیپارہ

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشہ کن | کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

بہرحال نامساعد حالات کے باوجود ہندوستان میں بھی عربی و فارسی کے چند اہم کتابخانوں کی تشکیل ہوئی، جو عالمگیر شہرت کے حامل ہیں، ان میں حسب ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔
۲۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ۔
۳۔ بوہار نیشنل ۔ نیشنل لائبریری کلکتہ۔

۴- رضا لائبریری رام پور-

۵- کتابخانہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ-

۶- اسٹیٹ لائبریری، حیدرآباد-

۷- سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد-

۸- کتابخانۂ راجہ صاحب محمود آباد-

۹- سعیدیہ لائبریری (عربی) حیدرآباد

۱۰- عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد-

۱۱- دیوان صاحب باغ لائبریری، مدراس-

۱۲- گورنمنٹ اورینٹیل لائبریری برائے مخطوطات، مدراس-

۱۳- بمبئی یونیورسٹی لائبریری، بمبئی-

۱۴- کاما انسٹی ٹیوٹ لائبریری، بمبئی-

۱۵- حمیدیہ کالج لائبریری، بھوپال

۱۶- کتابخانۂ ندوۃ العلماء، لکھنؤ-

ان کے علاوہ ہزاروں چھوٹے بڑے شخصی کتابخانے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے پڑے ہیں، جن کے قیمتی خزانے کے بارے میں کوئی قابل وثوق اطلاع نہیں پائی جاتی، غرض ہندوستان کے عام کتابخانوں اور شخصی ذخیروں میں جو قلمی نسخے ہوں گے، وہ شاید ہزار کے ہندسے سے متجاوز ہو جائیں، جن میں نہ جانے کیا کیا انمول موتی ہوں گے، یہ کتابیں اپنی افادیت کے اعتبار سے نہایت درجہ اہم ہیں، کیونکہ جیسا کہ معلوم ہے ہر مخطوطہ اطلاع کے لحاظ سے دوسرے مخطوطے سے کچھ نہ کچھ متفاوت ضرور ہوتا ہے-

خلاصہ یہ کہ قلمی ذخائر اور قیمتی مخطوطات کے اعتبار سے ہمارا ملک کسی اور ملک سے پیچھے نہیں، اس کے ساتھ اگر ہم ملک کی جغرافیائی حالت پر نظر رکھیں، تو ان ذخائر کی وقعت اور زیادہ ہو جاتی ہے- یہاں کی بے پناہ گرمی، بارش کی شدت، کیڑوں مکوڑوں، دیمک، اور دوسرے ضرر رساں پتنگوں کی کثرت، عام کتابوں کی حفاظت میں بڑی دقت پیدا کرتے ہیں اور قلمی کتابیں

تو بہت جلد متاثر ہوتی ہیں اور ان کے تلف ہونے کے زیادہ امکان ہوتے ہیں۔ غالباً اسی وقت
کا ایک نتیجہ ہے کہ ہمارے ملک میں قدیم فارسی نسخے کم ملتے ہیں۔ جدید نسخوں کی تعداد بہت ہی
زیادہ ہے۔ پھر بھی کچھ قیمتی دستاویز جو موجود ہیں، ان سے ملک کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔
ذیل میں کچھ ایسے قیمتی مخطوطات کا تعارف کرایا جاتا ہے، جن کا تعلق براہ راست فارسی زبان
وادب سے ہے۔ اور جن کے بغیر اس سلسلے کی تحقیقات نامکمل رہتی ہیں۔ لیکن اس ضمن میں محض
وہ نسخے لئے جائیں گے، جو نویں صدی ہجری کے ربع اول تک لکھے گئے ہیں۔ البتہ یہ گذارش اس
لحاظ سے جامع نہیں کہ بہت سے ایسے مخطوطات جو راقم کی دسترس سے باہر ہیں۔ یا جن کے بارے
میں کوئی علم نہیں۔ ان کا تعارف قدرتاً ممکن نہیں۔

میرے علم کے مطابق پانچویں صدی ہجری سے قبل کا کوئی فارسی مخطوطہ دنیا میں موجود
نہیں۔ اس وقت تک کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم ترین فارسی مخطوطہ "کتاب الابنیہ
عن حقایق الادویہ" ہے جس کا ۴۴۷ھ کا مکتوبہ اسدی طوسی کے خط میں "ویانا"
میں موجود ہے۔ یہ خطِ نسخ شبیہ بہ کوفی میں لکھا گیا ہے۔ جس کا پڑھنا نہایت دشوار ہے۔
لیکن موسیو زلیگمان نے اس کا نہایت نفیس ایڈیشن ۶ میں شائع کیا تھا، دوبارہ
بنیاد فرہنگ ایران تہران نے اس کے زیادہ حصے کا عکس چھاپ دیا اور ایک سال ہوا
جب اس کا تنقیدی متن دانشگاہ تہران سے شائع ہوگیا ہے۔ ابھی تک "کتاب الابنیہ" کا صرف
یہی ایک نسخہ معلوم تھا، مگر اب اور قدیم نسخے کی دریافت ہوگئی ہے، جو قدرے ناقص الآخر
ہے۔ کتاب الابنیہ مفرداتِ طب پر ہے۔

دوسرا قدیم فارسی مخطوطہ "ہدایت المتعلمین فی الطب" ہے جو کتابخانہ
بادلی آکسفورڈ میں موجود ہے۔ اس کا مؤلف ابو بکر ربیع بن احمد لغوینی بخاری اور سال تالیف
۳۷۰ - ۱۷ ہجری ہے۔ طب کی یہ کتاب قدیم زمانے سے نہایت معروف رہی ہے۔ چنانچہ نظامی
عروضی سمرقندی نے ۵۵۱ ہجری کے قریب اس کا شمار ان کتابوں میں کیا ہے جس کا مطالعہ ہر
طبیب کے لئے نہایت ضروری ہے۔ آکسفورڈ کا نسخہ ۴۷۸ ہجری کا مکتوبہ ہے، اس کا
خط کتاب الابنیہ کے مشابہ ہے۔ ڈاکٹر جلال میتنی استاد دانشگاہ مشہد نے جو چوتھی پانچویں

صدی کے متون فارسی پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔ حال ہی میں اس کا ایک تنقیدی متن مرتب کر کے دانشگاہ مشہد کی طرف شائع کر چکے ہیں (انتشاراتِ دانشگاہ ، شمارہ ۹) بنیاد فرہنگ ایران کی طرف سے اس کا عکس بھی شائع ہو چکا ہے (فہرست انتشارات شمارہ ۱۱۱) ۔

تیسرا قدیم فارسی مخطوطہ ترجمان البلاغہ کا ہے ، یہ کتاب مدتوں فرخی سیستانی کی طرف منسوب رہی ۔ لیکن چند سال ہوئے ترکی عالم مرحوم احمد آتش نے اس کا ایک قدیم مخطوطہ ترکی میں کشف کیا ، جس کی کتابت ۵۰۷ ہجری میں ہوئی تھی ، اور جس کا کاتب محمد دیلمسپار شاعر ہے ۔ کاتب کی اہمیت اس اعتبار سے بہت زیادہ ہے کہ اسی کے شوق دلانے پر اسدی طوسی نے اپنی مشہور فرہنگ لغت فرس تالیف کی تھی ۔

یہ چوتھا قدیم مخطوطہ ابوبکر اخوینی کا کتابخانۂ فاتح استنبول شمارہ ۳۶۴۶ ہے ، یہ ۲۷۲ اوراق پر مشتمل نسخہ ۵۱۰ ہجری کا مکتوبہ ہے ۔

پانچویں اور اوائل چھٹی صدی ہجری کے یہ چار نسخے دنیا کے کتابخانوں میں محفوظ ہیں ۔ ان میں سے اتفاقاً کوئی بھی ایران میں نہیں ۔ ایک ویانا میں ، دوسرا آکسفورڈ میں اور آخری دونوں ترکی میں ہیں ، پانچویں اور اوائل چھٹی صدی ہجری کے تقریباً چار نسخے میرے علم کے مطابق صرف ہندوستان میں محفوظ ہیں ، ان میں سے تین پاکستان میں اور ایک رامپور میں ہے ، ذیل میں ان کے متعلق مختصر سی یادداشت درج کی جاتی ہے :

نسخہ شرح تعرف مکتوبہ ۴۷۳ ہجری : امام ابوابراہیم اسماعیل بن محمد عبداللہ البخاری نے ابوبکر کلاباذی کی عربی کتاب التعریف لمذہب التصوف کی شرح لکھی ، جو اس کتاب کی شروح میں سب سے قدیم ہے ، اس کتاب کا قدیم ترین مخطوطہ سید فضل صمدانی پشاوری کے کتابخانہ شہر پشاور میں ہے ، اس نسخے کا ترقیمہ یہ ہے :

" وقع الفراغ عند نصف النهار من يوم الرابع والعشرين من شوال سنه ثلث وسبعين واربع مائة ، انتسخته من نسخة قوبلت بنسخة الشيخ الامام ابي نعيم عبد الملك

البزدوی رحمہ اللہ و عارضالہ شرح تعریف الشیخ الکبیر
شیخ ابواسحاق الکلاباذی"

اس نسخے کا تفصیلی تعارف افغانی فاضل عبدالحی حبیبی ارمغان علمی میں ۱۹۵۵ میں تفصیلی طور پر کر چکے ہیں، وہ اس کی تاریخ کتابت کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کا خط، کاغذ، املا وغیرہ ساری جزئیات پانچویں صدی ہی کے ہیں۔ اس بنا پر وہ اس کو کتاب الابنیہ کے مکتوبے کے بعد فارسی کا سب سے قدیم مخطوطہ قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ چونکہ بعض ناقدین کو کتاب الابنیہ کے نسخے کے بارے میں شک ہے، اس لئے اس کو فارسی کا سب سے قدیم مخطوطہ شمار کرنا چاہیئے۔

"اما آنچہ در متن مقالہ راجع بہ اقدام مخطوطات پارسی نوشتیم کہ نسخۂ کتاب الابنیہ است، مخطوط ۴۴۷ ھ، چون برخی از محققین در آن بارہ اشتباہ دارند۔ بنابر اقدم نسخ مکشوفہ خط پارسی را در کتب خانہ بادلی آکسفورڈ انگلستان یافتہ اند کہ نام آن ہدایۃ المتعلمین است در طب و مؤلف آں ہم ابوبکر ربیع بن احمد از اہل بخارا است کہ در قرن ۴ھ تالیف شدہ و نسخۂ موجود آن در ۴۷۸ھ کتابت گردید۔

اگر نظر انتقادی دانشمندان دربارہ جرح قدمت کتاب الابنیہ مقرون بصحت و قبول باشد پس ہمین نسخہ ما نحن فیہ پشاور را کہ در ۴۷۳ھ نوشتہ شدہ میتوان اقدم نسخ پارسی خطی مکشوفہ جہان شمرد زیرا مدت ۵ سال از تاریخ نوشتہ ہدایت المتعلمین نیز اسبق است"

راقم الحروف کے پیش نظر ان دانشمندوں کے دلائل نہیں جو کتاب الابنیہ کے نسخۂ ویانا کی تاریخ کتابت کے بارے میں مشکوک ہیں۔ البتہ خود اس کتاب کی "تاریخ تالیف" کے بارے میں دو روائتیں ہیں، بعض لوگ اسے منصور بن نوح (۳۵۰ - ۳۶۵ھ) کے عہد کی تالیف قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض دانشوروں کے نزدیک یہ منصور کوئی دوسرا بادشاہ ہے۔ سامانی خاندان کا بادشاہ نہیں۔ کتاب الابنیہ کا مولف اس کتاب کی کتابت کے وقت یعنی ۴۴۷ھ میں

زندہ تھا، جیسا کہ خود اس نسخے میں مصنف کتاب کے لئے "حرسہ اللہ" کے دعائیہ فقرے سے ظاہر ہے
میرزا محمد قزوینی نے بیست مقالۂ قزوینی کی جلد اوّل میں شامل ایک مقالے میں اس کو چوتھی صدی
کی تالیف اور اسی کتاب کی جلد دوم میں چوتھی صدی کی تالیف کو مشکوک اور پانچویں صدی کی
تالیف ہونے کو زیادہ قرین قیاس سمجھا ہے؛ آقای مجتبیٰ مینوی صراحتہً پانچویں صدی کے اواسط
کی تالیف قرار دیتے ہیں۔ راقم نے اس کتاب پر ایک مقالہ طبّیہ کالج میگزین، مسلم یونیورسٹی میں حال
میں شائع کیا ہے جس میں ان سارے امور پر مفصّل بحث کی ہے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ کتاب الأبنیہ کے مکتوبے کے بارے میں شک نہیں، یہ
۴۴۷ ہجری کا مکتوبہ ہے اور اسدی طوسی کا خط ہے، اس بنا پر اس کو فارسی کا قدیم ترین مخطوطہ
قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں۔ اسی لئے میرے نزدیک پشاور کا شرح تعرف کا نسخہ دوسرا
سب سے قدیم تاریخ دار فارسی مخطوطہ سمجھنا چاہیئے۔

تفسیر قرآن پاک: ایک گمنام مفسر کی تفسیر کے ۲۴۶ ورق دانشگاہ
لاہور میں موجود ہیں، تفسیر سورۂ بقرہ کی آیت ۶۵ تا ۱۵۱ کی تفسیر ہے، ان اوراق کی سال
کتابت معلوم نہیں، لیکن ناقدین کے نزدیک اس کی تاریخ کتابت ۴۵۰ ہجری کے حدود کی معلوم
ہوتی ہے، اس کا عکسی چھاپہ بنیاد فرہنگ ایران تہران کی جانب سے سات سال قبل شائع ہوا
تھا۔ (شمارہ ۱)، کچھ دنوں قبل اسی مکتبے کی طرف سے یہ کتاب ٹائپ میں چھاپ کر عام کر دی گئی
ہے (شمارہ ۵۷)۔

چونکہ اس کتابت کی کوئی قطعی تاریخ نہیں ہے۔ اس لئے قدامت کے لحاظ سے اس کا
کونسا درجہ ہے، وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ اتنا مسلّم ہے کہ پانچویں صدی کا مکتوبہ
ہے اور اس لحاظ سے کتاب الابنیہ سے شاید موخر ہو، لیکن شرح تعرف اور ہدایۃ المتعلمین کا
ہم عصر ہوگا۔ بہر حال یہ قدیم نسخہ بھی ہندوستان ہی میں موجود ہے۔

تیسرا قدیم نسخہ وامق و عذرای عنصری کا ہے؛ محمود غزنوی کے ملک الشعراء کی یہ
مثنوی مدت سے نایاب تھی، اس کے کچھ اوراق پروفیسر محمد شفیع کے ذریعے مکشوف ہوئے
جو فی الحقیقت اس دور کی بہت بڑی دریافت ہے، پروفیسر موصوف کو ایک نامعلوم مصنف

کی کتاب اوقاف القرآن کا ایک پرانا مخطوطہ ہاتھ لگا، مخطوطہ کی چرمی جلد اندر کی جانب کاغذ چپکا کر مضبوط بنائی گئی تھی، جب شفیع صاحب کی دقیقہ رس نظر ان کاغذوں پر پڑی تو ان کی رگِ تجسس پھڑک اٹھی، ان اوراق کی تحریر خطِ نسخ میں تھی۔ جس میں کوفی خط کی جھلک موجود تھی۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے ان اوراق کو علٰحدہ کیا اور یوں ایک تحقیقی رومان کی ابتدا ہوگئی، یہ بائیس[۲۲] اوراق تھے، جو عنصری کے وامق و عذرا کے اشعار کے حامل تھے۔ موصوف نے مسودہ کی عبارت کو پڑھا، سیاق وسباق کے لحاظ سے انہیں ترتیب دیا اور ایک محققانہ مقدمے کے ساتھ اس کو مرتب کر دیا، مگر اس کی اشاعت کا کام ان کی وفات کے بعد ۱۹۶۷ء میں انجام پاسکا۔

اگرچہ ان اوراق کی کتابت کی تاریخ معلوم نہیں۔ لیکن پانچویں صدی ہجری کا خط قرار دینے میں بظاہر کوئی امر مانع نہیں۔ بہرحال اس کو نہایت اقدم فارسی مخطوطات میں شمار کرنا چاہیئے۔

چوتھا قدیم نسخہ امام محمد غزالی کے بھائی احمد غزالی کے ایک نثری رسالے رسالۃ العشقیہ کا ہے، جو رامپور کے کتابخانے میں محفوظ ہے۔ اس کی کتابت کی تاریخ اوائل چھٹی صدی ہجری ہے۔ اور رامپور کا نسخہ نہ صرف قدیم ہے، بلکہ غالباً مؤلف کی زندگی کا ہو اس لئے کہ احمد غزالی کا انتقال بقول جامی ۵۱۷ھ میں اور بقول ابن خلکان و ابن الاثیر ۵۲۰ھ میں واقع ہوا تھا۔

تفصیلات بالا سے واضح ہے کہ چوتھی اور اوائل پانچویں صدی کے کم از کم چار نسخے صرف ہندوستان میں موجود ہیں، جب کہ ساری دنیا میں صرف چار ہی ایسے قدیم نسخوں کی موجودگی کا علم ہے، جیسا کہ شروع میں عرض ہو چکا ہے۔ مخطوطات کی نگرانی کا کام یہاں جتنا مشکل ہے، سرد ملکوں میں اتنا مشکل نہیں، اس کے پیش نظر مخطوطات کی حفاظت کے سلسلے کی ہمارے ملک کی خدمت نہایت وقیع قرار پاتی ہے۔

ان چار قدیم ترین نسخوں کے علاوہ خاصی تعداد میں ایسے قدیم نسخے ہیں، جن کا فارسی زبان و ادب سے گہرا تعلق ہے، یہ نسخے یا تو منحصر بفرد ہیں، یا کسی اور طور سے قابل توجہ۔ ان کی تعداد کافی ہے اور ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہے، جو نویں صدی کے ربع اول

لکھے گئے ہیں۔ اِن میں کچھ راقم حروف کی دسترس میں ہیں۔ لیکن ان سب کا احاطہ اس وقت ممکن نہیں۔ صرف چند کا ذکر بطور نمونہ کیا جاتا ہے اور وہ بھی ایسے جو نویں صدی کے ربع اول کے ہیں:

۱۔ کاما انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں شاہنامہ فردوسی کا ایک مصور نسخہ ہے۔ اس پر کتابت کا سنہ درج نہیں۔ لیکن آقائے مجتبیٰ مینوی نے گذشتہ سال اس سے استفادہ کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ شاہنامہ کے مصور نسخوں میں یہ سب سے قدیم ہے۔ ان کے قیاس کے مطابق یہ حملۂ منگول سے قبل کے نسخوں میں ہے اور اس بنا پر برٹش میوزیم کے نسخے سے بھی جو ۶۷۵ کا مکتوبہ ہے، قدیم ہے۔ دارالکتب قاہرہ (قسمت تاریخ فارسی شمارہ ۷۳) کا نسخہ جو ۷۰۵ ہجری کا ہے اور توپ قاپو استنبول کا نسخہ جس کی کتابت ۷۳۱ھ کی ہے، ان دونوں سے بھی قدیم ہے۔ اسی نسخے کے بارے میں ایک مختصر سی یادداشت مع دو صفحات کے عکس کے مجلہ ہنر و مردم تہران، شمارہ ۱۳۵ میں ڈاکٹر مہدی غروی معاون رایزن شائع کر چکے ہیں۔

۲۔ کشف المحجوب کا ایک نادر نسخہ پروفیسر محمد شفیع کے ذاتی کتابخانے میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے ہاتھ کا ہے جس کی کتابت کی تاریخ ۶۶۵ ہجری ہے۔ اس نسخہ کی بنیاد پر پروفیسر محمد شفیع کے بیٹے احمد ربانی نے ۱۹۶۸ء میں لاہور سے اس کا ایک ایڈیشن شائع کیا ہے۔ مگر یہ عکسی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کی افادیت میں کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ اس کتاب میں اصل نسخے کے دو ورق کے عکس بھی شامل ہیں۔ ایک چیز جو راقم کو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت بہاء الدین کے املا میں "ء" کے بجائے "و" ہے۔ بہرحال کاتب کا نام اور اصل کتاب سب ایک ہی خط میں ہیں۔ جو نسخہ کی قدامت پر دلالت کرتے ہیں۔ علاوہ بریں اس پر قیمتی یادداشتیں ہیں، جن سے نسخے کی اہمیت بھی پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بہاء الدین زکریا کی تحریر کا کوئی نمونہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔

۳۔ سیف الدین باخرزی (م: بعد ۶۵۹) کی رباعیات کا واحد نسخہ بانکی پور کے کتابخانے میں محفوظ ہے۔ اسی نسخہ کو پروفیسر نفیسی مرحوم نے ۱۳۳۴ شمسی میں مجلۂ دانشکدۂ ادبیات، سال ۲، شمارہ ۴ میں شائع کر دیا ہے۔

۴ - ترجمہ تاریخ طبری : تاریخ طبری کا ترجمہ نول کشور پریس میں چھپا تھا، دوبارہ تہران میں طبع ہوا، اس ترجمے کے قلمی نسخے مل جاتے ہیں۔ لیکن رامپور میں ایک نہایت قدیم نسخہ موجود ہے، اس کے مطالعہ کے بغیر اس تاریخ کا انتقادی متن وقیع نہیں ہو سکتا۔

۵ - مکاتیب سنائی جو راقم کے اعتنا سے چھپ چکی ہے، اس کے نسخے کمیاب ہیں، ایران میں ایک بھی نہیں، برٹش میوزیم میں ایک نسخہ ہے اور ہندوستان میں دو، ایک عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری اور دوسرا مسلم یونیورسٹی لائبریری ذخیرۂ حبیب گنج میں۔ آخر الذکر نسخہ خاصہ قدیم ہے۔

۶ - سراجی دہلی سلطنت کا سب سے قدیم شاعر ہے جس کا دیوان ملا ہے اور جو راقم کی توجہ سے شائع ہوا ہے اس کے دو نسخے ملے ہیں، ایک مسلم یونیورسٹی کے کتابخانے ذخیرۂ حبیب گنج میں دوسرا آقائے سعید نفیسی کے مجموعے تہران میں۔ سراجی قطب الدین ایبک کے دور سے قبل مکران (بلوچستان حالیہ) میں رہ چکا تھا اور اس کے اشعار سے وہاں کی سیاسی تاریخ کا ایک نیا باب تیار ہوتا ہے۔ بہر حال یہ قیمتی مسودہ ہے۔

۷ - دیوان عمید لوبکی : عمید لوبکی سنامی التتمش کے بیٹے ناصر الدین محمود کے دور کا ایک شاعر ہے۔ اس کے اشعار منتخب التواریخ، مونس الاحرار، عرفات عاشقین وغیرہ میں شامل ہیں۔ اس پر ایک باب ڈاکٹر اقبال حسین صاحب کی تاریخ شعرائے قدیم ہندوستان میں ہے۔ اس شاعر کے اشعار ہمارے یہاں کی ایک طالبہ نے جمع کر لئے تھے، جو ایک ہزار سے زیادہ ہو چکے تھے۔ حال میں راقم حروف نے اس کا ایک مختصر سا دیوان دریافت کیا، جو اب یونیورسٹی کے کتابخانے کی ملک ہے۔ اس نسخے کی وجہ سے اس دور کی سیاسی وادبی تاریخ میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہر حال امیر خسرو کے قبل کے سراجی و عمید دو صاحب دیوان شاعروں کے دواوین کی دریافت سے ہندوستان کے قبل مغل دور کی فارسی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

۸ - غزالی کی احیاء علوم الدین کا فارسی ترجمہ التتمش کے دور میں ہندوستان میں ہوا، لیکن اس کے کامل نسخے مفقود ہیں، البتہ جلد اول برٹش میوزیم میں موجود ہے، جو حال ہی میں بنیاد فرہنگ ایران کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس میں مترجم مؤید الدین جاجرمی

کی وطنی نسبت خوارزمی بتائی گئی ہے۔ خوارزمی غلط ہے۔ دراصل مترجم کی نسبت سے جاجرمی ہے۔ مخطوطے کے علاوہ امیر خسرو کے رسائل اعجاز میں اس مؤلف کا ذکر جاجرمی نسبت سے ہوا ہے۔

اس ترجمے کا بیشتر حصہ لاہور میں موجود ہے، شیرانی مرحوم کے پاس جو حصہ تھا، وہ نایاب ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم مکتوبہ ہے؛ پروفیسر محمد شفیع نے اس ترجمے پر ایک مفصل یادداشت ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین میں شائع کی ہے جس سے لاہور میں موجود ترجمے کے حصے، جو ہزاروں صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے، کی پوری کیفیت واضح ہوتی ہے۔

۹- ترجمۂ عوارف المعارف: عوارف کا سب سے قدیم فارسی ترجمہ ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریا کے ایما پر قاسم داؤد خطیب نے ۶۳۹ھ کے قبل کیا، اس ترجمے کے دو نسخے راقم کے توسط سے مکشوف ہوئے۔ ایک کتابخانۂ آصفیہ حیدرآباد اور دوسرا بیکس اکبرآبادی صاحب کے پاس۔ یہ آخر الذکر نسخہ اب مسلم یونیورسٹی کے کتبخانے میں ہے۔ یہ ترجمہ سلطان تاج الدین ابوبکر بن ایاز کے نام معنون ہے جو ۶۳۴ سے ۶۳۹ تک ملتان، اچہ اور سندھ کے علاقے کا حکمراں تھا۔ یہ اہم تاریخی انکشاف اسی مخطوطے کا رہین ہے۔ تاج الدین کی مدح میں عمید لویکی کے دو قصیدے بھی ملتے ہیں۔ راقم نے ۱۹۶۳ء میں فکر و نظر میں اور پھر سال گذشتہ انڈو ایرانیکا میں اسی موضوع پر مقالے لکھے ہیں۔

۱۰- فرہنگ قواس: یہ فرہنگ خلجی دور کی یادگار ہے۔ مؤلف فخر الدین قواس بالکمانگر ہے؛ فارسی- فارسی لغت ہے اور قدامت کے لحاظ سے فارسی کے مکشوف لغات میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اپنے بعد کے بیشتر فرہنگ نگاروں کا ماخذ رہا ہے۔ اس کا ایک ناقص الاوّل والآخر نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتابخانے میں ہے، اس کے علاوہ کسی اور نسخے کا پتہ نہیں چل سکا ہے، راقم نے عرصہ ہوا ایک تنقیدی متن تیار کر کے تہران میں بغرض اشاعت بھیج دیا ہے، بعض وجوہ سے اس کی اشاعت میں تعویق ہوئی۔ بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب کی طرف یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔

۱۱- فرہنگ دستور الافاضل: یہ محمد تغلق کے دور میں ۷۴۳ء میں لکھی گئی،

مولف حاجب خیرات دہلوی ہے جس نے استاد آباد میں اس کو مکمل کر لیا، استاد آباد گوگی کا پرانا نام ہے، جو اس وقت استان میسور میں ایک چھوٹا سا قریہ ہے، اس کا واحد نسخہ جس کے چند اوراق درمیان سے غائب ہیں، ایشیاٹک سوسایٹی میں موجود ہے۔ راقم نے اس کا تنقیدی متن تیار کر کے بنیاد فرہنگ ایران کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔

۱۲۔ آٹھویں صدی ہجری کا حافظ کا معاصر شاعر رکن الدین صائن ہے؛ اس کے دیوان کے صرف تین نسخے معلوم ہیں، ان میں سے دو ہندوستان میں اور ایک انگلستان (انڈیا آفس) میں ہے۔ ہندوستان کے نسخوں میں سے ایک بانکی پور اور دوسرا کلکتہ نیشنل میوزیم میں ہے؛ پروفیسر سید حسن صاحب نے ان نسخوں کی مدد سے اس کا ایک انتقادی متن شائع کیا ہے؛ البتہ اس کا ایک منظومہ "دہ نامہ" ایران میں ہے؛ غرض یہ ایرانی شاعر ہندوستان میں محفوظ مخطوطات اور ایک ہندوستانی دانشمند کی کوشش سے زندہ ہوا۔

۱۳۔ فرہنگ زفان گویا: بدر ابراہیم کی یہ فرہنگ فارسی ۔ فارسی ہے۔ اس کی بھی تالیف ہندوستان میں ہوئی، بعد کے فرہنگ نگاروں نے اس سے بہت استفادہ کیا ہے خصوصاً صاحب موید الفضلا نے، اس فرہنگ کے دو نسخے معلوم ہیں۔ ایک بانکی پور پٹنہ میں اور دوسرا لینن گراڈ میں۔ راقم حروف اس کو ترتیب دے رہا ہے۔

۱۴۔ دیوان حافظ: کتابخانۂ آصفیہ حیدرآباد میں دیوان حافظ کا قدیم مخطوطہ ہے۔ اس کی کتابت ۸۱۸ ہجری میں ہوئی، گویا باعتبار قدامت اب تک کے دریافت شدہ نسخوں میں دوسرے یا تیسرے نمبر پر ہے، آیا صوفیہ کا نسخہ، جو بظاہر خلاصہ ہے، ۸۱۳ھ کا ہے۔ قونیہ کا نسخہ ۸۱۹ کا مکتوبہ اس کے چھ سال بعد کا ہے۔ یہ نسخہ ایک مجموعے میں ہے جس کے متن میں کلیلہ و دمنہ (۱۔ ۴۶۲) اور حاشیہ میں (۱۔۲۷۲) تن الطیر اور ۲۷۳۔ ۴۶۲ دیوان حافظ ہے۔ کتابت کی تاریخ کلیلہ و دمنہ کے خاتمے پر (ص ۴۶۲ متن) اس طرح درج ہے:

وفرغ من کتابته یوم الثلثاثانی عشر شهر ربیع الاوّل
سنه ثمان عشرو ثمانمائة والحمد لولیّ الحمد

دیوان حافظ کے اس نسخے کی دریافت سے فارسی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا اس وقت تک سب سے متداول نسخہ، نسخۂ قزوینی ہے، اس کی بنیاد نسخۂ خلخالی ہے، جو ۸۲۷ کا مکتوبہ ہے میرزا محمد قزوینی نے خلخالی کے نسخہ کے علاوہ جتنی اور دوسری غزلیں اور قطعے وغیرہ ہیں ان کو دیوان حافظ میں الحاقی قرار دے کر اپنے مرتبہ نسخے سے خارج کر دیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”چون نسخۂ خلخالی کہ در سنہ ۸۲۷ کتابت شدہ عجالۃً تا نسخۂ قدیم ترین از آن بدست نیامدہ آن را باید قدیمترین نسخ موجودۂ تاریخ دار دیوان حافظ در دنیا محسوب داشت لہذا من خود را ملتزم و مقید کردم کہ در خصوص کمیت اشعار یعنی از لحاظ عدۂ غزلیات و عدۂ ابیات ہر غزل از ابتدا تا انتہای کتاب فقط و منحصراً ہمان نسخہ را اساس کار خود قرار دہم و ہرچہ در آن نسخہ موجود است از غزلیات و مقطعات و مثنویات و رباعیات تماماً بدون زیادہ و نقصان آنہا را چاپ کنم و ہرچہ در آن نسخہ موجود نیست خواہ غزلیات مستقل خواہ ابیات متفرقہ بعضی غزلہا یا غیر ذٰلک آنہارا مطلقاً کالعدم انگاشتہ بکلی از آن صرف نظر نمایم زیرا کہ چون این نسخہ نسخۂ کامل تمامی است پس ہرچہ درین نسخہ نیست با احتمال بسیار قوی بلکہ تقریباً بنحو قطع و یقین الحاقی و اشعار دیگر النست کہ بعدہا در دیوان خواجہ داخل کردہ اند“

قابل ذکر بات یہ ہے کہ نسخۂ آصفیہ منتخب ہے، کامل نہیں۔ اس لئے کہ اس میں صرف ۳۵۷ غزلیں ہیں، جبکہ نسخۂ خلخالی میں ۴۹۵ غزلیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود اس کی ۹ غزلیں، ۵ قطعے اور تین رباعیاں نسخۂ خلخالی میں شامل نہیں، گویا میرزا محمد قزوینی کے نزدیک الحاقی تھیں اس لئے نسخۂ قزوینی سے خارج ہیں۔ لیکن چونکہ نسخۂ خلخالی سے ۹ سال پرانا ہے۔ اس لئے اس کو الحاقی قرار دینے کا سوال ہی نہیں، بنابریں میرزا قزوینی کا مندرجہ بالا

قول غلط پاتا ہے؛ آصفیہ کے علاوہ بعض اور قدیم نسخوں میں میرزا محمد قزوینی کے خارج کئے ہوئے اشعار شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ نسخۂ آصفیہ دیوان حافظ کے مطالعے کے سلسلے کی اہم کڑی اور سلسلۂ حافظیات میں قابل توجہ اضافہ ہے۔

۱۵- دیوان حافظ: گورکھپور کے خانوادۂ سبز پوش کے یہاں دیوان حافظ کا ایک مخطوطہ ہے، جو ۸۲۴ کا مکتوبہ ہے، یہ نسخہ اس لحاظ سے نہایت ہی اہم ہے کہ اس میں مقدمۂ جامع دیوان بھی شامل ہے، جو دسویں صدی کے بعض نسخوں میں ہے۔ اس سے قبل کے کسی نسخے میں نہیں، گویا حافظ کی زندگی اور کلام کے بارے میں ایک ماخذ کی نشاندہی ہوئی، جو شاعر کی وفات کے ۳۲ سال کے اندر کا ہے، اس نسخے کی دریافت سے نسخۂ قزوینی کے تمام و کامل ہونے کی روایت باطل ہو گئی۔ اس میں بھی ۱۳ غزلیں، ۷ قطعے ۴ رباعیاں اور ۲ مفرد ابیات نسخۂ خلخالی سے زیادہ ہیں۔ اگرچہ بحیثیت مجموعی نسخۂ آخر الذکر زیادہ ضخیم اور زیادہ اشعار کو حاوی ہے۔ نسخۂ آصفیہ اور نسخۂ گورکھپور دونوں میں نسخۂ خلخالی سے ۱۹ غزلیں، ۱۱ قطعے، ۷ رباعیاں اور دو فرد زیادہ ہیں۔ نسخۂ گورکھپور سے مزید جو فائدہ ہوا، وہ یہ ہے کہ میرزا محمد کا یہ قیاس کہ اصل مقدمہ میں جامع دیوان کا نام شامل نہیں، محمد گلندام جعلی شخص ہے۔ گورکھپور کے نسخے کے مقدمے میں محمد گل اندام کا نام سرے سے نہیں آیا، لہٰذا اس کے جعلی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ البتہ بعض امور میں میرزا صاحب نے نسبتہً "قدیم تر نسخوں کو زیادہ قابل ترجیح دیا ہے؛ مثلاً جدید نسخوں کی یہ روایت کہ حافظ بادشاہ کو درس دیتے تھے۔ میرزا محمد کے نزدیک بعد کا اضافہ ہے؛ لیکن یہ قیاس صحت سے دور ہے، اس لئے نسخۂ گورکھپو سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ "شغل تعلیم سلطانی" میں مشغول رہتے تھے؛ اسی طرح متاخر نسخوں میں حافظ کی طرف دو حاشیے منسوب ہیں "تحشیہ مطالع و کشاف"۔ میرزا محمد اس کے بجائے "مطالعۂ کشاف و مطالع" زیادہ صحیح قرار دیتے ہیں، مگر اس نسخے کے مقدمے سے ظاہر ہے کہ متاخر نسخوں کی روایت درست ہے۔ اسی طرح میرزا محمد کا خیال ہے کہ متاخر نسخوں میں حافظ کی وفات ۷۹۱ بتائی گئی ہے، اس کے لئے کوئی قدیم اور معتبر روایت نہیں، اس مقدمے سے واضح ہے کہ ۷۹۱ قدیم روایت ہے، اس میں ۷۹۱ اور ۷۹۲ دونوں تاریخیں ملتی ہیں۔ بخوبی ممکن ہے کہ حافظ کی تاریخ وفات

کے بارے میں اختلاف کی بنیاد اسی طرح کے نسخے کی روایت ہو۔

مختصر یہ کہ نسخۂ گورکھپور کی دریافت حافظیات کے سلسلے کی نہایت اہم کڑی ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر راقم نے تہران کے مجلّہ ایران شناسی میں اوّل ایک مضمون لکھا، بعداً اس نسخے پر مبنی دیوان کا ایک انتقادی متن کیا گیا، یہ دیوان آستانۂ قدس مشہد سے شائع ہوا، کاغذ و طباعت وغیرہ کی نفاست قابلِ دید ہے۔

۱۶- **حافظیات** کے سلسلے کا اہم ترین اضافہ بانکی پور کا شاہی نسخہ ہے، جو ہمایون اور جہانگیر کی تحریروں سے مزیّن ہے۔ ایران کا کیا ذکر دنیا میں اس اہمیت کا کوئی نسخہ کہیں بھی نہیں موجود ہے۔

۱۷- **مونس الاحرار**: اس کا واحد نسخہ ذخیرۂ حبیب گنج میں موجود ہے۔ یہ قدیم فارسی شعرا کی ایک اہم بیاض ہے، مولّف احمد بن محمد کلاتی اصفہانی ہے۔ اس نے حدائق السحر تالیف رشید وطواط (م: ۵۷۳) کی پیروی میں یہ مجموعہ تیار کیا تھا، حدایق السحر نے ہر صنعت کی وضاحت کے لئے اساتذہ کے کلام سے صنائع وبدائع کے ہزاروں اشعار منتخب کرکے ایک ضخیم مجموعہ تیار کیا، جو تیس ابواب میں منقسم ہے؛ تاریخِ ترتیب ربیع الآخر ۷۰۲ ہجری قرار دی ہے۔ لیکن اس تاریخ کے بعد کے بھی اشعار اس میں شامل ہیں۔ اس سے امکان یہ ہوتا ہے کہ شاید یہ مجموعہ ایک طویل مدت میں تیار ہوا ہو اور شروع کرنے کی تاریخ ۷۰۲ ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ دہائی کا ہندسہ شامل ہونے سے رہ گیا ہو۔ گو تاریخ لفظوں میں اس طرح درج ہے: "سنہ اثنی وسبع مائۃ"۔

ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ محمد بن بدر الدین جاجرمی نے ۷۴۱ میں ایک مجموعۂ شعر تیس ابواب پر مشتمل تیار کیا تھا، یہ مجموعہ نہایت مشہور ہے۔ چنانچہ اس کے چند اہم نسخے ملے جن کی بنیاد پر آقای صالح طبیبی کی ترتیب سے تہران سے دو جلدوں میں چھپ گیا ہے۔ جلد دوم آثار ملی کی جانب سے شائع ہوئی ہے، اس لئے عمدہ چھپی ہے۔

ایک قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ جاجرمی کا مقدمہ وہی ہے، جو کلاتی کا، اور کلاتی کے ۸۵ شعرا میں سے ۵۸ وہی ہیں، جو جاجرمی کے یہاں موجود ہیں۔ غرض ان وجوہ سے کلاتی کی ترتیب

کی تاریخ شبہ سے خالی نہیں اور اسی بنا پر اس کے متقدم ہونے کا معاملہ بھی قطعی قرار نہیں پا سکتا، محمد بن جاجرمی نہ صرف ایک معروف شخصیت ہے، بلکہ اس کے مجموعے کے کئی قدیم نسخے پائے جاتے ہیں اور بعض تذکروں میں اس کا ذکر بھی ہے۔ اس لئے اس کی صداقت مشتبہ نہیں۔

بہر حال کلاتی کا شعری مجموعہ اپنی جگہ پر خاصہ اہم ہے۔ اس میں چند شعراء ایسے ہیں جن کا کلام کسی اور ذریعے نہیں ملتا، اس اعتبار سے فارسی تاریخ ادب میں اس کی وجہ سے اضافہ متصور ہے، آقای صالح طبیبی نے راقم کے توجہ دلانے پر اس کو چھاپنے کا ارادہ کیا ہے۔ جیسا کہ جلد دوم کے مقدمے میں لکھا ہے۔ راقم نے اس پر ایک تنقیدی مقالہ لکھا ہے، جو میرے مجموعہ "تاریخی و ادبی مطالعے" میں شامل ہے۔

۱۸- بیاض محمد بن یغمور: یہ مجموعہ محمد بن یغمور کے توسط سے ترمذ میں مرتب ہوا، اس کا واحد نسخہ گورنمنٹ اورینٹل لائبریری (مخطوطات شامل کتابخانہ دانش گاہ مدراس) میں ہے، مرتب نے ایک معزز شخص کے لئے مرتب کیا ہے جس کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

"یمین الامرا مقوی الفرباً معین اللہ ولہ لختیار الحضرۃ شرف المھندسین مجد الملّۃ والدّین شمس الاسلام و المسلمین انیس الملوک والخواقین حرس اللہ مجدہ"

یہ مجموعہ سات "قسم" میں منقسم ہے۔ جو اصناف شعر پر مبنی ہیں۔ ساتویں قسم رباعیات پر ہے۔ پروفیسر سعید نفیسی نے مونس الاحرار کلاتی اور مجموعہ 'محمد بن یغمور' کا ذکر اپنے ایک مضمون (شامل نذر علمی) میں کیا ہے۔ انہوں نے اس مجموعہ کی تاریخ ترتیب قرن ہفتم اور اوائل قرن ہشتم قرار دی ہے، جو محل نظر ہے۔ اس میں بعض ایسے شاعروں کا کلام شامل ہے جو اس عہد کے بعد گذرے ہیں۔ بہر حال یہ مجموعہ اہم شعری مواد کا حامل ہے اور اسی بنا پر نہایت اہم ہے۔ شاید اس کی ضخامت اس کی اشاعت میں حائل ہو۔

۱۹- مجموعہ لطایف وسفینۂ ظرائف: یہ مجموعہ اس لحاظ سے ہماری بحث میں نہیں آتا کہ اس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں موجود نہیں۔ چونکہ اس کی ترتیب ہندوستان میں دی گئی، مولف فیروز شاہ تغلق (م: ۷۹۰) اور شاہ مبارک شرقی (م: ۸۰۳)

دونوں کو "خلد اللہ ملکہ" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے، واضح ہے کہ یہ مجموعہ ایک طویل عرصے میں تیار ہوا، اسی بنا پر اس کا مختصر سا ذکر یہاں کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مؤلف سیف جام ہروی ہے۔ یہ نہایت ضخیم بیاض ہے، جو کئی ہزار صفحوں پر مشتمل ہے اور اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس میں ہندوستان کے مغلوں کے دور کے قبل کے بیسیوں ایسے شاعروں کا ذکر ہے، جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہ تھا، پھر ایسے شعرا جن کے کم اشعار ملتے ہیں، ان کا بھی کلام اس میں شامل ہے۔ راقم نے اس کی مدد سے غلام، خلجی، تغلق اور شاہان مشرقی کے بعض گمنام شاعروں کا تعارف مختلف مقالات کے ذریعے کرایا ہے۔ اس مجموعے کے دو نسخے ہیں۔ ایک کابل یونیورسٹی میں، دوسرا برٹش میوزیم میں، راقم حروف کے پاس ان دونوں نسخوں کا اوٹوگراف موجود ہے، پروفیسر نفیسی کے علم میں نسخہ کابل تھا۔ چنانچہ اس کا ذکر انہوں نے نذر علمی والے مقالات میں کیا ہے۔

اس گزارش سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہندوستان کے ذخائر میں ایسے اہم مخطوطے ہیں جن کے مطالعے اور جن سے بجا طور پر استفادے کے بغیر ایرانی تاریخ ادب ناقص رہے گی۔ میری گزارش صرف چند مخطوطوں تک محدود ہے، نہ جانے کتنے اہم اور نادر مخطوطے یہاں کے عام کتابخانوں اور شخصی ذخیروں میں موجود ہیں، جن تک ہماری رسائی نہیں، چند مخطوطات جو یہاں مذکور ہیں، وہ بطور نمونہ مشتے از خروارے ہیں۔ "مشتے از خروارے" مثل نہ خیال فرمایئے، دراصل ہزاروں نادر مخطوطات میں دس پندرہ مخطوطات وہی حیثیت رکھتے ہیں، جو مٹھی بھر دانہ کو پورے "کھلیان" سے ہوتا ہے۔

ہندوستان کے کونے کونے میں یہ ذخائر پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی طرف ترا واقعی توجہ نہ ہونے کی وجہ سے روز بروز برباد ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے جمع کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے مواقع کے بارے میں منصوبہ بنانا چاہیئے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ فارسی ادب کی ہندوستان نے کیا خدمت کی ہے! اس ملک نے نہ صرف ہزاروں شاعر و ادیب پیدا کئے، بلکہ فارسی کے علمی ذخائر کو محفوظ کر کے فارسی ادب و تاریخ کے دامن کو وسیع کر دیا ہے۔

افسر الدوله فیاض الدّین حیدر

غزالی مشهدی
و
مثنوی اش نقش بدیع

غزالی مشهدی از شعرای عهد طهماسبی بود، درباره احوال زندگانیش اطلاعات مفصلی در دست نیست - حتّیٰ اینکه مؤلفین تذکره ها نام اصلیش را هم ضبط ننموده اند مگر صاحب تذکره مخزن الغرائب که نام وی را علی رضا نوشته است[1] - بیل در کتاب ترجمه احوال شعرای فارسی نقل می کند که غزالی در یکی از قصاید خود که روضة الصفا عنوان دارد تاریخ تولد خودش را سنه ۹۳۰ ھ، مطابق سنه ۱۵۲۴ء میلادی بنظم آورده است[2] ولی آنچه از مندرجات تذکره ها بر می آید مشعر بر آنست که غزالی بنا بر تهمت ارتداد و الحاد ایران را ترک گفته سر بدکن کشید، آنجا هم بقدر شایسته از او تقدیر و تمجید بعمل نیامد - و در آن آوان جونپور که آن را "شیراز هند" هم می نامند تحت فرمانفرمائی علی قلی بیگ سیستانی ملقب به خانزمان قرار داشت، خانزمان یکی از امرای فوق العاده، ذی نفوذ و از ابطال و شداد عسکری دولت اکبری بود، او خود شاعر بود و سلطان تخلص می کرد و هم ادبا و شعرا را سر پرستی

۱- نسخه خطی نمره ورق ۲۸۴ تا ۵۸۶ کتابخانه خدابخش

۲- BEALE'S BIOGRAPHICAL DICTIONARY. P. 144. LONDON 1894

می نمود چون آوازهٔ شعر غزالی بگوشش رسید او را بدربار خود دعوت نمود و قطعه ای که حاکی از این مطلب واز قرار ذیل ست :-

ای غزالی بحق شاه نجف　　که سوی بندگان بیچون آی
چونکه بیقدر گشته ای آنجا　　سر خود را بگیر و بیرون آی

بنظم آورده با یکهزار روپیه و چند راس اسپ بر سبیل خرج راه بدو فرستاد، غزالی آن را تقبل نموده بجونپور آمد و زمانی در خدمت خانزمان و برادرش بهادر خان بسر برد، تا اینکه خانزمان با غرای دشمنان خود بجرم یاغیگری در ۹۷۵ھ مطابق ۱۵۶۸ میلادی) بقتل رسید

فیضی قریحه و نبوغ غزالی را قائل بود و در شعر گوئی از وی تلمذ داشت[1]. و شاید بوسیلهٔ او بدربار اکبری راه یافته بود و اولین شاعری بود که بمقام ملک الشعرای نایل آمد غزالی در دستگاه شاهی بتنعم و ناز زندگانی خود را می گذرانید و ثروت هنگفتی را دارا بود و وقتی که در رکاب شاهی بگجرات رفته بود، ناگهان مرگش فرا رسید و بساط عمرش را در نوردید و همانجا در سرخج (که مقبرهٔ مشایخ کبار و سلاطین) سلف بود، بخاک سپرده شد چون وارثی نداشت ثروت و مکنت که نهصد هزار روپیه علاوه بر اثاثیه بعنوان مرده ریگ بخزانهٔ شاهی در آمد و بقول مؤلف عرفات العاشقین "از نقدش هزار تومان سرخ و سپید مانده بود[2]".

فیضی قطعه ای در تاریخ وفاتش بنظم آورده است که موثق ترین مدرکی راجع به تاریخ وفات غزالی در دست ست چنانکه می گوید:

قدوهٔ نظم غزالی که سخن　　همه از نظم خدا داد نوشت
نامهٔ زندگی او ناگاه　　آسمان بر ورق باد نوشت
عقل تاریخ وفاتش بسر طور　　سنه نهصد و هشتاد نوشت

درباره تاریخ وفاتش هم اختلاف ست. بعضی هفتصد و پنجاه و هفت نوشته اند ولی موثق ترین تاریخ همان سرودهٔ فیضی است.

این قطعه گذشته از تاریخ وفات، فیضی بکمال جزالت بصلاحیت شاعرانهٔ غزالی

---

1 خلاصة الکلام، نسخهٔ خطی نمره ۲۱۹، ورق ، کتابخانهٔ خدابخش
۲- عرفات العاشقین، نسخهٔ خطی جلد دوم، نمره ۲۲۸، ورق ۵۲۰ [illegible] خدابخش

وسبک وی نظریات خود را آرایه داده ست، رفعت فکرش را خداداد، و در نظم سخن وی را مخترع سبک خاصی شناخته است۔

بنا بر قول صاحب عرفات العاشقین[1] غزالی به قاسم کوہی ارادت داشت ولی معلوم نیست که چرا در میان شان شکر آبی شد۔ زیرا که از قاسم کوہی تاریخ وفاتش نقل کرده اند که در آن غزالی را سگ ملعون و ملحد دونی گفته است:

دوش غزالی آن سگ ملعون | مست و جنب شد بسوی جہنّم
کاہی سال وفاتش بنوشت | ملحد دونی رفت ز عالم

غزالی شاعر پرگو بوده است و در سایر فنون شاعری، قصیده، غزل، مثنوی، و رباعی طبع آزمائی نموده است۔ تعداد ابیاتش را مؤلفین تاریخ و تذکره باختلاف نوشته اند صاحب طبقات اکبری[2] تعداد ابیاتش را یک لک نوشته است۔ ولی مؤلفین ریاض العارفین، عرفات العاشقین و خلاصۃ الافکار تعداد اشعارش را ھفتاد ہزار ذکر نموده اند، علاوه بر آثار منظوم و منثور، غزالی مثنوی بنام "نقش بدیع" دارد که ذکرش در تذکره ہا بکرات آمده ولی تا حالا اثری از آن پیدا نبود۔ در نسخہ ی خطی دیوان غزالی که در کتابخانہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ وجود دارد و آقای ایوانکو IVONHOW در فہرست خود از آن نام برده در آن ہم "نقش بدیع" یافت نمی شود۔

ولی چندی پیش پژوہشگری از دانشگاه لکھنؤ آقای سلمان عباسی این مثنوی را از نسخہ بیاض خطی "مجموعہ عاشقین" نمره ۱۹۹۶ منحصر بکتابخانہ خدابخش، پٹنہ سراغ گرفته اند۔ مثنوی نقش بدیع را غزالی در مدح خانزمان سروده است و می گویند که در ازای ہر بیتی یک اشرفی طلائی بطور جایزه و انعام از ممدوح خود بگرفت ولی در مثنوی حاضر که مشتمل بر یک صد و پانزده بیت می باشد ہیچ جای سخنی از خانزمان نرفته و مطالبی دیگر ہم که حائز اہمیت باشد در آن یافت نمی شود۔ ممکن ست که مکمل نباشد و اشعار دیگر ہم

---

[1] عرفات العاشقین نسخہ خطی جلد دوم نمره ۲۲۸، ۵۲۰ ورق) کتابخانہ خدابخش

[2] طبقات اکبری ص ۳۹۶ مطبوعہ نولکشور پریس ۱۸۷۵ء

داشته باشد که الآن در دسترس نیست۔

شالوده این مثنوی عشق عارفانه است دمود از شور و شوق خود شاعر می باشد با اینکه غزالی در محیطی زندگانی می کرد که سبک هندی داشت نضج می گرفت ولی طرز بیان او نشان می دهد که در شعر گوئی از قوانین شیوای و رسای کهن پیروی می کرد و احساسات و عواطف خود را به بهترین وجهی به تعبیرات بسیار لطیف و نازک جلوه گر ساخته است و این ادعای غزالی به نحوه کلام وی صدق می نماید:-

بحریست ضمیر من که گوهر دارد　　تیغست زبان من که جوهر دارد

اینک شور قلم نغمه محشر دارد　　مرغ ملکوتم سخن پر دارد

مثنوی "نقش بدیع" برای استحضار قارئین در ذیل نقل می گردد:-

(۱) خاک دل آن روز که می بیختند　　شبنمی از عشق برو ریختند

(۲) دل چه بآن رشحه غم اندود شد　　بود کبابی که نمک سود شد

(۳) اینهمه شوری که کنون در دلست　　اشک ز شور ابر آن حاصل است

(۴) دیده عاشق که دهد خون ناب　　هست همان خون که چکد از کباب

(۵) بی اثر مهر چه آب و چه گل　　بی نمک عشق چه سنگ و چه دل

(۶) چند زنی قلب سیه بر محک　　سنگ بود آنکه ندارد نمک

(۷) دل گهر مرسله زندگیست　　خاشی عشق در و زندگیست

(۸) هر که می عشق ازین جام خورد　　زندگی یافت که هرگز نمرد

(۹) آئینه دوست دل دشمن است　　دل که نه چون موم بود آهن است

(۱۰) نازکی دل سبب قرب تست　　گر شکند کار تو گردد درست

(۱۱) آئینه شیشه چو یابد شکست　　هر قدرش آئینه دیگر است

(۱۲) حسن قدم را همه کسر است کار　　کسر چه خواهد صفت انکسار

(۱۳) آنکه نه جانش بغم عشق زیست　　نقد و فنا را چه شناسد که چیست

(۱۴) ذوق جنون از سر دیوانه پرس — لذت سوز از دل پروانه پرس

(۱۵) آنکه شجر تخمه نجاتش دهد — شعله به از آب حیاتش دهد

(۱۶) کاسه چه داند که می ناب چیست — خاک سیه را چه خبر کاب چیست

(۱۷) باد که او میکشد از غنچه پوست — در گذرد غنچه چه داند چه بوست

(۱۸) آئینه کامد ز بتان روشنیش — نرم نه گردد دل آهنیش

(۱۹) ناله ز بیداد نباشد پسند — چند دل و دل چو نه درد مند

(۲۰) دل که ز عشق آتش سودا در وست — قطرهٔ خونیست که دریا در وست

(۲۱) سبحه شماران ثریا گسل — مهرهٔ دل را نشمارند دل

(۲۲) غفلت دل تیرگی جوهر است — خاک بر آن لعل که بدگوهر است

(۲۳) نیست دل آن دل که بر آن داغ نیست — لالهٔ بیداغ درین باغ نیست

(۲۴) دل که هوا پیش بود خرم است — غنچه که بی باد کشاید کم است

(۲۵) بر دل صد پاره مگو گریه کن — دل که نه خونست برد گریه کن

(۲۶) آتش خونست گل باغ دل — تا نرود جان نرود داغ دل

(۲۷) دور لقا رفت و فزون شد هوس — وا آرزوی سینه نفس بر نفس

(۲۸) آهن و سنگی که شراری در وست — بهتر از آن دل که نه ناری در وست

(۲۹) موم گدازنده بود دل نه سنگ — شعلهٔ سوزنده رخ لاله رنگ

(۳۰) راه دل آنها که نشان داده اند — روی نکو دیده و جان داده اند

(۳۱) از رخ زیبا که جفای ندید — کیست که آن دید و بلای ندید

(۳۲) حسن بیک لمحه دگرگون شود — بر سر آتش نگنی چون شود

(۳۳) یا منگر سوی بتان تیز تیز — یا قدم دل بکش از رستخیز

(۳۴) ایکه بنظاره شدی دیده باز — سهل مبین در مژه های دراز

(۳۵) آن مژه در سینه چو کاوش کند — خون دل از دیده تراوش کند

(۳۶) چهرهٔ گل گرچه تر و دلکش است — بلبل دل سوخته را آتش است

(۳۷) دل که خراب رخ گلرنگ نیست — سوخته اولی که کم از سنگ نیست

(۳۸) نی غرض از عشق ملامت خوش است — چاشنی عشق ملامت کش است

(۳۹) خرمی ما غم عشق است و بس — شادی دل ماتم عشق است و بس

(۴۰) غم دل افروخته داند که چیست — قدر ستم سوخته داند که چیست

(۴۱) بهر وفا جان بجفا میدهم — دل بجفا جان بوفا میدهم

(۴۲) روی بتان گرچه سراسر خوش است — کشتهٔ آنیم که عاشق کش است

(۴۳) هر بت رعنا که جفاکیش تر — میل دل ما سوی او بیشتر

(۴۴) گرمی نیروز بنوشی رواست — شعله که سوزنده نباشد هباست

(۴۵) لاله عذاری که جفاجوی نیست — همچو گلی دان که در او بوی نیست

(۴۶) یار گرفتم که بخوبی پریست — سوختن دل نمک دلبریست

(۴۷) در رخ بی فتنه چو گیسو مپیچ — نافهٔ بی مشک نیرزد به هیچ

(۴۸) شورش تلخیست غرض از شراب — ورنه بشیرینی ازو بهتر آب

(۴۹) ناله زبیداد نکویان دولیست — جور و جفا لازمهٔ نیکوئیست

(۵۰) تا نه رهِ عشق تمام طی کنند — بر تو بقصد گو نه جفا کی کنند

(۵۱) دل نه بهر چشم سیه مبتلاست — تیز نگه کردن خوبان بلاست

(۵۲) جانب هر سوخته دیدن بناز — وز دل پاره خریدن نیاز

(۵۳) خندهٔ پنهان لب میفروش — دیدن دزدیده بتاراج هوش

(۵۴) کرده بهر جور جفای دگر — قصد دل و دیده بجای دگر

(۵۵) غمزه ستمگار و نگه فتنه جو — لب بفسون مهر خموشی درو

(۵۶) حسن ز رخساره برافروختن — شور ز ملاحت بجهان سوختن

(۵۷) لعل دلاویز می حسرت است — روی نکو آیینهٔ حیرت است

(۵۸) حسن چه دل بود که دادش نداد — عشق چه تقوی که بیادش نداد

(۵۹) در شکن زلف چه سودا که نیست — در خم ابرو چه بلاها که نیست

(۶۰) گره جان شکل شمائل زنند | خال کمین کرده که بر دل زنند

(۶۱) غمزه بجاسوسی دل آگهیست | چاه ذقن نیز بلای رهیست

(۶۲) گر بفسون دست ببابل بری | زآفت این چاه چسان دل بری

(۶۳) لاله رخان گرچه که داغ دلند | روشنی چشم و چراغ دلند

(۶۴) مویه عاشق ز جوانان خوش است | نیک و بد موی میانان خوش است

(۶۵) نازکیان چون مژه بر هم زنند | شعله ز هر موی بعالم زنند

(۶۶) مه خجل از جبهه سیمین شان | تلخ می از خنده شیرین شان

(۶۷) لب چو به پیمانه و ساغر برند | تلخی ازان زهر بشکر برند

(۶۸) از نظر اشک فشانان ملاک | کز لب شان قطره نغلتد بخاک

(۶۹) چون عرق آرند زنی بر جبین | مرغ هوس گردد ازان دانه چین

(۷۰) دیدنشان جنت آدم فریب | عقل ز نادیدنشان باشکیب

(۷۱) بنشینند ز ملامت شود | ور بخرامند قیامت شود

(۷۲) مهر و جفا کاریشان دلفروز | دیدن و نادیدنشان سینه سوز

(۷۳) گر نگری جانب ایشان بلاست | ور سوی دل دست بری مبتلاست

(۷۴) چشم یکایک ستم انگیز تر | غمزه بخون تیز و نظر تیز تر

(۷۵) تیز نظر باش که مردان راه | تیز نگردند درین سان نگاه

(۷۶) دامن از اندیشهٔ باطل بکش | دست از آلودگی دل بکش

(۷۷) در نظر کج نظران خاک به | دامن پاک و نظر پاک به

(۷۸) قدر خود آنها که قوی یافتند | از قدم پاک روی یافتند

(۷۹) کار چنان کن که درین تیره خاک | دامن عصمت نکنی چاک چاک

(۸۰) روی بتان آینه کبریاست | دیدن آن دیدهٔ دل را ضیاست

(۸۱) هر که گشوده است بمعنی نظر | دیده از آن آینه روی دگر

(۸۲) وانکه گرفتار بصورت شده | آینه را گرد کدورت شده

(۸۳) پاک شو از خود که مرادت دهند — گرد مکن ورنه ببادت دهند

(۸۴) عشق بلند آمد و دلبر غیور — در ادب آویز و رها کن غرور

(۸۵) در پس این پردهٔ گوهر نگار — هست یکی پردگی پرده دار

(۸۶) فتنه و غوغای جهان زان یکیست — ورنه کجا این همه هر کو و کیست

(۸۷) پرده گشا همچو بصر نیستی — حیف که از اهل نظر نیستی

(۸۸) هر که رخش از نظر ما ندید — هیچ از آن چهرهٔ زیبا ندید

(۸۹) هست نهان آینه ات زیر پوست — بلکه جهان آینهٔ روی اوست

(۹۰) هر چه بعالم ز کهن یا نوست — چیست که آن[1]

(۹۱) حسن چه گوییم بمردم که چیست — قطره چه داند همهٔ قلزم که چیست

(۹۲) دیدن او دل چه تمنا کند — هم خودش آن به که تماشا کند

(۹۳) عقل و خرد محرم او نیستند — لیک دمی بی غم او نیستند

(۹۴) وای بر آن کس غمش از دل شود — کش ببرد گریه چه غافل شود

(۹۵) گر بشگافی دل هر ذره خاک — ریزد از آن رشحهٔ این جان پاک

(۹۶) چرخ درین سلسله پا در گلست — عقل درین میکده لایعقل است

(۹۷) جان و جسد خستهٔ این برهمند — ملک و ملک سوختهٔ این غمند

(۹۸) گرمی گیرند که دارد نفس — قطرهٔ از ساغر عشق است و بس

(۹۹) هفت فلک پردهٔ یک راز اوست — جنبش نه دائره یک ساز اوست

(۱۰۰) طفل چه داند که چه راز است این — خفته چه آگه که چه ساز است این

(۱۰۱) هیچ بگوشت نرساند سروش — تا نکشی پنبهٔ غفلت ز گوش

(۱۰۲) هیچ بچشمت ننماید ز غیب — تا نکشی پرده کش حرف غیب

(۱۰۳) عیب مکن گر ز خط مشکبار — آینهٔ حسن بر آرد غبار

(۱۰۴) غالیهٔ خط رقم مشکساست — صورت دیباچهٔ صنع خداست

۱- کذا: بیاض

(۱۰۵) سادگی چهره چه گر دل برد — طرّهٔ خود را بسلاسل برد

(۱۰۶) حُسن به پیرایه چو دلکش ترست — طرّهٔ مشکین خوش و خط خوشتر است

(۱۰۷) دیدن هر ساده نشاید بسی — صفحهٔ ننوشته نخواند کسی

(۱۰۸) گرچه رخ ساده بهاریست هم — سبزه و سنبل پی کاریست هم

(۱۰۹) خوب بود ساده دلی در نظر — از خط نورسته شود خوبتر

(۱۱۰) سلسله بندد ز خط عنبرین — بر ورق آهوی چین مشک چین

(۱۱۱) خط چو شود رسته شود رستخیز — غایت حسنست خط مشک بیز

(۱۱۲) خوش پسرانی که سمن غبغب اند — چون خطشان نیست تنک مشرب اند

(۱۱۳) باری اگر نوخط و گر ساده اند — هستی ما را بفنا داده اند

(۱۱۴) هرکس و اندیشهٔ کاری دگر — باد ازین باده خماری دگر

(۱۱۵) سوخته جانیم بداغ هوس — کشتهٔ این ساده رخانیم و بس

فالنامۂ حافظِ شیراز

مؤلفہ عنایت خانِ راسخ

پیشگفتار

لطف اللہ خان صادق کہ ناظم دہلی بود زمانیکہ نادرشاہ در ۱۱۵۱ھ ۳۹-۱۷۳۸ع دہلی را تاراج کرد، عنایت خان راسخ یکی از شش فرزندان اوست۔

واین خانہ ہمہ آفتابست۔ از فرزندان خانِ صادق عنایت خان راسخ و شاکر خان ہر دو بہ تصنیف و تالیف شغف داشتند۔ از خانِ راسخ: "رسالہ مغنّیانِ ہندوستان بہشت نشان[1]" و (۲) "عنایت نامہ" یا "رقعات عنایت خانی[2]" (نامہ ہا از طرف یا بنام سلاطین تیموریہ از ہمایون تا بہادر شاہ اول)، و (۳) "عنایت نامۂ" دیگر کہ مشتمل بر انتخاب اشعار مکتوبی استادان است و سال تالیفش ۱۱۵۳[3]۔ واخیراً این رسالہ بابت (۴) "فالنامۂ حافظ شیراز" کہ با رسالہ بابت مغنّیان ہندوستان مجلدست و از دست ہمان کاتب مکتوب شدہ است ــــ یادگار ماندہ۔

و از شاکر خان چند کتب بصورت نسخہای خطی یافتہ شوند از آنجملہ (۱) "تاریخ شاکر خانی" یا "تذکرہ شاکر خانی[4]" کہ سال تالیفش ۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۵ع است، و (۲) "گلشن صادق[5]" کہ بطور مجمع العلوم است در ۱۱۸۷ھ تصنیف شدہ۔

و فرزند سیوم، ہدایت اللہ خان را خودش تصنیفی نبود، امّا فرزندش محمد علی انصاری چندیک کتب تاریخ تالیف نمودہ۔ کتابخانہ خدابخش دارای این چہار مخطوطات است کہ یادگار از وست:۔

۱- نسخۂ خطی کتابخانہ خدابخش، پتنہ کہ بعنایت و اہتمام دکتر علی حیدر نیّر بسال ۱۹۶۱م چاپ شدہ۔

۲- نسخۂ در موزۂ بریتانیہ و نسخۂ دیگر در کتابخانہ دانشگاہ پتنہ یافتہ شود۔

۳- نسخۂ خطی در کتابخانۂ خدابخش محفوظ است و نسخۂ دیگر در کتابخانۂ رضا یافتہ شود۔

۴- نسخۂ در موزۂ بریتانیہ محفوظ است و نسخۂ دیگر کہ آن منقول است از نسخۂ کہ اغلباً در کتابخانۂ آصفیہ یافتہ شود، در کتابخانہ خدابخش محفوظ است۔

۵- مجلد اول گلشن صادق کہ دارای نصف اول باشد در کتابخانۂ خدابخش محفوظ است، واین تا خیابان پنجم است۔

(۱) تاریخ مظفری (۲) بحر المواج یا اخبار السلاطین جلد دوم از اوائل ست جگ تاکل جگ تا آخر سال ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء (۳) بحر المواج جلد سوم از ذکر سلطنت شاہ عالم تا رمضان ۱۲۰۰ھ۔
(۴) تاریخ اسرائیلیہ کہ در احوال افاغنہ است۔

اسلاف ۔ واز نسخہ خطی تذکرہ شاکر خان نسب نامہ عنایت خان راسخ ہم مستفاد میشود بدین طور کہ کاتب آن نسخہ نسب نامۂ مذکور از خیابان دہم من کتاب "گلشن صادق" کہ در کتابخانہ یافتہ نقل نمودہ فہو ہٰذا:
ابو ایوب انصاری رض (صحابی رسول ص) ← ... امیر شیخ ابو اسحاق (ممدوح حافظ) ← ... خواجہ ملک علی (وارد از ہرات، بعہد غیاث الدین بلبن، بہند: پانی پت) ← ... خواجہ عبد السلام صوفی ← خواجہ عبد الرزاق انصاری (معروف بہ خواجہ بزرگ) ← . شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق نیک نام مشہور جنگ۔

خانِ صادق
- عنایت خان راسخ
- ہدایت اللہ خان
  - محمد جعفر راغب
  - محمد علی انصاری
- فاخر خان
- شاکر خان
- محمد ابراہیم
- ناصر الدین خان

اخلاف : وبعنایت آقای نقی احمد ارشاد نبیرۂ شاد عظیم آبادی شاعر معروف زبان اردو تفصیل اخلاف خان راسخ و برادرش شاکر خان تفصیل ذیل حاصل شدہ:

عنایت خانِ راسخ
↓
عزت اللہ خان
- باقر علی خان (و این شاخ خاندان از سونی پت بلاہور ہجرت نمودہ و آخرین نام درین سلسلہ نظیر احمد خان یافتہ شود)
- جعفر علی خان ← مہدی علی خان ← عارفہ بیگم (مادر شاد عظیم آبادی)

شاکر خان
↓
امتیاز خان
↓
عیسیٰ خان رفعت
↓
فاطمہ بیگم زوجہ سید محمد محسن عم شاد
↓
نوروز حسین خان
↓
نصیر حسین خان خیال (خواہر زادہ شاد)

آقای نقی احمد ارشاد میگوید که خان راسخ در مقام سونی پت اقامت گزین شده و مدفنش نیز دران شهر است۔

پدر بزرگوارِ عنایت خانِ راسخ، لطف الله خان صادق از شیخ زاد های انصاری پانی پت بود که بعهد بهادر شاه اول به دربار منسلک شده۔ در عهد جهاں دار شاه چشم حاکم برگشته از نظر افتاده خانه اش ضبط شده۔ خانِ صادق بدین سبب با فرخ سیر ساز کرده، د بعد کامرانی او به نظامتِ دهلی (مع سید عبدالله خان) سرافراز گشته ...... و در عهد محمد شاه، خان صادق به عهده خانسامانی مامور شده و منصب شش هزاری و خطاب شمس الدوله بهادر شهور جنگ یافته۔ و دورانِ فتنهٔ نادر شاهی کارهای چنین از خان صادق بظهور آمده که از نظر عنایت افتاده۔ و وفاتش بعهد احمد شاه واقع شد[1] ....

از فرزندانش عنایت خانِ راسخ و شاکر خان قدری ترقی کردند۔

سال پیدائش : و هرچه او در عنایت نامهٔ نثر نوشته، سال پیدائشِ خانِ راسخ پس یا پیش ۱۱۱۴ھ مستفاد میشود۔ میگوید : "بندهٔ عاصی عنایت خانِ راسخ .... درین سنه ۱۱۶۳ھ به چهل و نهم مرحله از مسلک زندگانی طے نموده[2] "۔

احوال۔ و از احوالش چندان که معلوم هست احوالیست که مشترک برادرش شاکر خان در تذکرهٔ خود بیان نموده۔ و هرچند که سوای داستانِ تنگی و عسرت بعد وفاتِ پدرشانِ خانِ صادق (۱۱۶۶ھ) چیزی دیگر از جملهٔ تفصیل بدست نمی آید، امّا بصورتی که هیچ آثار دیگر یافته نمی شود این هم غنیمت شمرده از تذکره شاکر خان منقول شود :

"چون علیه الرحمة والا رحلت فرمود احمد شاه بهادر ما هر شش برادر را بحضور طلب فرموده بعنایت خلاع .... سرافراز نموده ... مغلانیها فرستاده مذر ماتم داری ارشاد کرد، تا سه روز بهم خاصه باز از عنایت نمود که در باره هیچ خانه زاد این قسم بعمل نیامده بود۔ بعد ازین، از تنگ شدن

۱۔ مآثر الامرا۔ و پروفیسور سید حسن عسکری ایزاد میکند که مورخ خوش حال چند خان صادق را با الفاظ خوش یاد نمی کند بل قدح میکند۔

۲۔ دکتر علی حیدر نیز جوئیندهٔ یابندهٔ این نکته هست که بذیلِ احوالِ خان راسخ در مقدمهٔ "مغنیان هندوستان" نوشته۔

خود کہ از دستِ روہیل نونگہداشت کہ برای جنگ صفدر جنگ منسلک فرمودہ بود، امر کرد کہ ما بدولت شما ہر شش را جدا جدا مثل خان صادق می نمائیم … الحال شما با بجای او میشوید آنچہ مقدور باشد مدد ما نمائید کہ در خزائن زری نماندہ …. اگرچہ از نادر شاہ باقی داشتیم و ہمہ فروخت حویلی ہا و دامہا قرض تا جائیکہ دست رسید یک لک و سی ہزار روپیہ سرانجام کردہ داخل خزانۂ والا نمودیم۔

نقل سیاہہ … یادداشت آنکہ فرد بمہر عنایت خانِ راسخ بہادر وغیرہ رسیدہ کہ … حقیقت این ست کہ بتاریخ ۱۸ رمضان سنہ ۶ بجہت وصول تا ادای مبلغ یک لک و سی ہزار روپیہ بابت پیشکش عطای جاگیرات والتمغای پانی پت و عظیم آباد وغیرہ بر حویلی لطف اللہ خان مرحوم تورہ شدہ بود بعد آن ۲۶ شہر صدر عرضی عنایت خان راسخ وغیرہ … رسیدہ کہ خانہ زادان پسران لطف اللہ خان صادق در جناب والا عرض می نمایند کہ بر کوٹھ ہای خان مرحوم و خانہ زادان تا ادای پیشکش ھبینہ کہ بمنزلۂ جاگیرات والتمغای پانی پت و عظیم آباد وغیرہ است مہر فدوی درگاہ والا شدہ امیدوارند بنام فدوی درگاہ بدستخط مزین شود کہ مہر تورہ بریدہ مردم چوکی طلب نماید۔ مبلغ بست و پنج ہزار داخل شدہ و باقی برداشتن چوکی و بریدہ شدن تورہ زود سرانجام می باید یا بدیر … تورہ از کوٹھ ہا برداشتہ شدہ و وکیل پسران خان مرحوم داخلای یک لک و سی ہزار روپیہ بابت پیشکش عوض قیمت جاگیرات …… مزید بعباد خاص بدست دارد …… وازان واز دست قرضداران ہنوز آلودگی نشدہ بود کہ قضای آسمانی و تقدیر ربانی نوع دیگر پیش آمد کہ ماندنِ وطن و جاہای بہشت نشان غنیمت نمی شمردیم … چہ از خاندان تیموریہ و از وزارت گورگانیہ این قسم گاہی نشدہ بود کہ بی وجہ معوز امال احدی شوند۔ مارا بادشاہ غارت کرد و بادشاہ را وزیر، تا در تاریخ ۲۰ شہر ربیع الثانی روز پنجشنبہ لشکر مخذولی ابدالی …. استیلا یافت بر دارالخلافہ! …… عاقبت چون تنگی و عسرت بغایت رسید …. متعلقان ضروری را ہمراہ گرفتن و حملہ را ترک گفتن …. و عزیزان را وداع کردن روی داد این فقیر از شہر کہ مالوف بود دلکھو کھ را ۲۰ شہر شعبان المعظم دوعرض خط … از راہ بریلی و لکھنو بتاریخ ۲۰ شوال المکرم در بلدۂ بنارس رسید …. چون امید از وطن مشغوف مسکن مالوف منقطع شد صلاح دولت و دین دران دید کہ مسکن در دیاری سازد کہ اہل آن شہر برادران و اخلاصمندان و دوستان خود باشند …. و نواب

دین پناه بنده پرور هم ظل گستر باشد ..... بی توقف رو بدین خط (خطِ علی وردیخان) نهاد ....
خوبی برادران و نواب از چند فقره جات و ابیات معلوم میشود : سگ گنڈا کوچۂ بازار، مادر پدر آزار،
واه زادۂ نابکار، ملعون صوبہ بهار، کجرفتار، بداطوار، راندۂ کردگار، نگونسار، خرسوار، سرمار،
دوستندار غدار، مکار ..... قاسم ظالم که نواب بود باوجود شقۂ خاص حضرت ظلّ الٰهی عالی
گوهر .... و سفارش میجر کنگ بهادر و میجر ولسن ٹین متوفی .... جاگیر ضبط نمود، توفیق طعام
یک روز نیافت، تا برعایت دیگر چه رسد .....

باقی سلوک آدمیانه از سیدان عالی جناب ... مهدی علی خان بهادر غضنفر جنگ و
احترام الدوله بهادر ظفر جنگ دیده و حلقۂ بندگی ازاں بگوش حق نیوش کشیده۔[1]

نسخۂ فالنامه ۔ نسخۂ خطی فالنامۂ حافظ شیراز مکتوبہ محمد واسع الدین انصاری[2]
بلا تاریخ، بخط شکسته ۔ کاتب کم سواد است و هم غلط نویس ۔ و تاریخ کتابت در حیات مولف
قرار یابد چنانکه سطر آخرین مولف اشاره کند ۔ مهری که تاریخ دارد و نام عبدالحکیم قادری ازان
پیدا شود که این نسخه قبل از ۱۱۹۹ھ نوشته شده ۔

د نسخۂ فالنامۂ بصورت موجوده بر چهارده اوراق مشتمل است ۔ و بعد ورق نهم یک
دو اوراق ندارد و هم بدین طور بعد از ورق سیزدهم اوراقی چند ضائع شده ۔

د نسخۂ دیوانِ حافظ کرخانِ راسخ در آغاز مقاله خودش اشاره کرده که جهانگیر
ازان تفاؤل نموده و از ثقات مسموع شد که در کتابخانۂ بادشاهی موجود است،" حالا در
کتابخانۂ خدابخش است و چنانکه دارای خط جهانگیر و همایون پادشاه است د نسخۂ خیلی خوش خط
ومزیّن و قدیم است، کتابخانۂ خدابخش اهتمام کرده است که برای حافظ شناسان آن نسخه
را در چاپ عکسی پیشکش نماید۔

۱۔ تذکرۂ شاکرخان : ۱۳۸ — ۱۴۵

۲۔ لاحقۂ انصاری مشیر است که منجملۂ قرابت دارانِ مولف باشد۔

قرائت اشعار حافظ

متن اشعار حافظ که درین رساله وارد شده قدری اختلاف دارد از قرأت نسخۂ که شاہانِ تیموریہ، ہمایون و جہانگیر ازان تفاؤل کردہ ؛ وہم از نسخہای دیگر۔ تفصیل اختلاف باین طور ست :

دیوان حافظ	فالنامہ
۱۔ خاقان شرق و غرب کہ در شرق و غرب اوست	است
۲۔ بر چرخ علم ماہی و بر فرق مہر تاج	مہری و بر فرق عقل
۳۔ علم از تو با کرامت و فضل از تو باشکوہ	عقل
۴۔ دولت کشادہ رخت بقا زیر کند لان	نہادہ
۵۔ بعد از کیان بملک سلیمان نداد کس	کسی نداشت
۶۔ یعنی کہ من کیم براد خودم بران	مرکبم
۷۔ شاہ عالم بخش در دور طرب ایہام گو	شاہ عالم گنج بخش و نکتہ دان و تیز فہم
۸۔ حافظ شیرین کلام بذلہ گو حاضر جواب	حافظ شیرین کلام و بذلہ گو حاضر جواب
۹۔ اگر میل دل ہر کس بسوییست	بجایست
۱۰۔ صوفی از بادہ باندازہ خورد نوشش باد	ساقی
۱۱۔ سرمست در قبای زرافشان چو بگذری	با
۱۲۔ این بیت در نسخہای کلام حافظ دیدہ نمی شود :۔	گفتہ بودی الخ

—— از افادات : آقای قاضی عبد الودود

ترتیب : عابد رضا بیدار

●●

فالنامهٔ حافظ شیراز

حضرت جنت مکانی جهانگیر بادشاه که در ایام بادشاهزادگی معروف بسلطان سلیم بودند بنابر بعض عوارض از والد ماجد خود انحراف ورزیده در اله آباد می گذرانیدند. حضرت عرش آشیانی بمقتضای شفقت یعقوبی مکرر از شوق مواصلت مرقوم فرمودند لیکن ایشان را ارکان دولت و ارباب مشورت پابند وسواس ساخته از تحصیل این سعادت سرمدی باز می داشتند. سلطان سلیم بنابر خلجانی که از تذبذب بخاطر بود تفاؤل بدیوان خواجه حافظ نمودند، غزلیکه سه بیت از آن درین جا ثبت شده و شعر ثالث بیت الفال است بر آمد:

چرا نه در پی عزم دیار خود باشم — چرا نه خاک کف پای یار خود باشم
ز محرمان سراپردهٔ وصال شوم — ز بندگان خداوندگار خود باشم
غم غریبی و غربت چو بر نمی تابم — بشهر خود روم و شهریار خود باشم

طبع ایشان هم چون میل تمام و رغبت مالا کلام بحصول این مرام داشت، خلاف همه محض برای خود عمل فرمود، احرام کعبهٔ مقصود بسته بملازمت پدر بزرگوار مستعد گردیدند و در اندک زمانی بمصداق خبر لسان الغیب بوالا پایه شهریاری فائز گشتند. این حکایت بر حاشیهٔ دیوان حافظی که بعد جلوس متصل غزل مذکور بخط خاص قلمی فرموده بودند، از ثقات مسموع شد که در کتاب خانهٔ بادشاهی موجود است.

بیدار دلان هوشمند و خرد پروران حقیقت پیوند بیقین دانند که این ویرانهٔ دیر سست بنیاد معموره نما که روزی چند مسکن و موطن آدمی گشته جاودان جای اقامت جان پاک. و مقر این گوهر تابناک نتواند بود بلکه منزلیست در ره گذر واردان غیبی که چون بتجرد نژادان ارواح و نفوس بر وفق تقدیر قادر ذو الجلال بعزم تحصیل معرفت و کمال از نزهت آباد کشور قدس و دار الملک اقلیم جبروت در اهتزاز آیند و بمصلحت حکمت بالغه بر مراکب قوالب هیولانی و مطایای هیاکل جسمانی راکب گشته آهنگ سیر صحرای شهود و میل وادی نمود نمایند بدان خطهٔ عاریت اساس رسیده برسم مسافران انبساط نزول اندازند، و بضرورت طیلسان تعلقات نشاء کون بر دوش فطرت گرفته روزی چند بمقتضیات و احکام آن در سازند تا بدستیاری قوی و مددگاری حواس که گزین اسباب معرفت رب الارباب ست مشاهدهٔ غرایب صنع بیچون و عجایب کارگاه کن فیکون نموده بقدر مهلت و استعداد در شناخت و پرستش ایزد جهان آفرین که مقصود آفرینش همین است

کوشش نمایند که دست آویز رجوع بوطن اصلی و سرمایهٔ سرور نشاط حقیقی بدست آرند. و پس از سامان برگ
و ساز بازگشت بخشنودی و رضاپذیرائی فرمان طلب و حکم نافذ قضا گشته باهنگ کعبهٔ وصال و عزیمت بارگاه
اتصال از فنا این دار فنا و ساحت این مرحلهٔ پر خوف و عنا رخت اقامت برگیرند و دگر باره بنشاط آباد
شهرستان انس و کشور روح پروری قدس رسیده بشمول فیض رحمت و غفران ایزدی کامیاب بسرور ابدی
و بهره مند حضور سرمدی شوند. بناءً علیه روز یکشنبه بست و هشتم صفر سنه هزار و سی هفت هجری مورد
جلایل توفیقات ربانی مشمول انظار تاییدات سبحانی حضرت جنت مکانی که از کشمیر متوجه لاهور بودند، در منزل
چنگزهتی دل ازین کدورت سرای فانی برگرفته ندای اِرجعی الی ربّکِ راضیةً مرضیةً را کشاده
پیشانی اجابت کرده به بهشت برین و جوار رحمت ربّ العلمین پیوستند بدرجهٔ بهجت و سرور موبد و ایصال
و حضور مخلد فائز گشتند.

از آنجا که زمان جهان افروزی اجلال شاه جهانی و هنگام فروغ افزای اقبال صاحبقران ثانی
نزدیک رسیده بود و پیوسته یمین الدوله امین الملت آصفخان در رصد و ابقای این دولت و نظام کارخانه
سلطنت مساعی جمیله و کوشش جزیله مینمود و قطع رشتهٔ طول امل توز محل و کفایت کار شهریار و بیباقی
حساب عمر ملاقی و تدارک گرم عنانی بایسنغر زیاده سر بر ذمت همت والانهمت خود حواله داشته همانروز
بنارسی را که در تیز روی گوی سبقت از همگنان میربود بطریق داوکچی بخدمت شاهجهان رخصت خیر فرمود.
و چون فرصت نوشتن عرضداشت و تفصیل احوال نبود مهر خود را حواله نمود که بنظر اشرف در آورد تا محل اعتماد
گردد، و التماس نماید که بدولت و اقبال بر جناح استعجال متوجه اورنگ خلافت شوند. بالجمله بنارسی در عرض
هشت روز قطع مسافت نمود و روز یکشنبه نوزدهم ربیع الاول سنه مذکور صبحی بجنیر پیوست، و از گرد راه نخست
بمنزل مهابت خان زمانه بیگ که بسبب شوخی که ازو سرزده بود از جناب جنت مکانی جدائی گزیده خود را
بخدمت شاهجهان رسانده بود رفته این حقیقت را ظاهر ساخت و او فی الفور سوار شده بملازمت ایشان
آورد. گویند درین وقت شاهجهان بسیر دیوان سخنور سحر پرداز خواجه حافظ شیراز اشتغال داشتند.
بعد وقوف برین ماجرا نظر به بیسامانی خود که شکسته حال و بال محض شده بودند و خیره سری و خودرائی
خانجهان لودی که بغرور حشمت و جاه و وفور حشم و سپاه خود را سنگ راه ایشان می شمرد و آن یوسف مصر
سلطنت بچاه تأمل و تفکر فرو رفت. بزبان حال این ابیات فردوسی برخوانده:

ببینیم تا کارساز جهان | درین آشکارا چه دارد نهان
ببینیم تا مهر و کین (کذا) | نواز د کرا خوار ساز د کرا
ببینیم کز ما بلندی کراست | درین کار فیروزمندی کراست

تفاؤل بلسان الغیب نمود. قصیده که پاره ازان ایراد یافته در اوّل صفحه یمین بر آمد، موجب تاکید در جزم عزم و عزم جزم گردید:

شد عرصهٔ زمین چو بساط ارم جوان | از پرتو سعادت شاه جهانیان
خاقان شرق و غرب که در شرق و غرب است | صاحبقران و خسرو شاه و خدایگان
دارای دهر شاه شجاع آفتاب ملک | خاقان کامگار و شهنشاه نوجوان
اعظم جلال دنیا و دین آنکه رفعتش | دارد همیشه توسن ایام زیر ران
ای صورت تو ملک جمال و جمال ملک | وی طلعت تو جان جهان و جهان جان
تو آفتاب ملکی و دهر حبا که میردی | چون سایه از قفای تو دولت بود روان
بر چرخ علم مهری و بر فرق عقل تاج | در چشم فضل نوری و در جسم ملک جان
علم از تو با کرامت و عقل از تو با شکوه | شرع از تو در حمایت و دین از تو در امان
ای خسرو منیع جناب و رفیع قدر | وی داور عدیم مثال و عظیم شان
عصمت نهفته رخ بسرا پرده ات مقیم | دولت نهاده رخت بقا زیر کندلان
بعد از کیان بملک سلیمان کسی نداشت | این قدر این خزانه و این لشکر گران
داده فلک عنان ارادت بدست تو | یعنی که مرکبم براد خودم بران

سبحان الله در حقیقت لسان الغیب نظم این کلام معجز نظام بحسب حال و مآل آن شاه جهان عزّ و جلال که اشاره خیر و برکت و اجازهٔ عزیمت و حرکت و بشارت تسلّط و استیلا بر آمده و ذکر اسمار اولاد موجود و تسمیه احفاد که بعد ازان بشهود آمده ازان مستنبط و مستفاد می شود پیشتر فرمود، آری:

مردان خدا، خدا نباشند | لیکن ز خدا جدا نه باشند

بر واقفان اسرار و اخبار و آگهان اسمار و آثار عادت کهنه سوار معرکه گیر و دار روزگار و خصلت حقه باز نیرنگ خانه بیدار لیل و نهار پوشیده نیست که یکی را از یاد در آرد و دیگری را بجای او بردارد، یکی را ئل حشمت و شکوه بخشد و دیگر برادر در حسرت و اندوه دهد، یکی را نگهای عشرت و غنا زنگار رنگ

جیب و دامن پرساز د و دیگر یرا خار جفا و عنا زیر پا انداز د - مهرش بهانه جوست و لطفش کریم خو، مصداق این مقال و نظر این تقریر سانحهٔ بینش افروز حیرت فزا و واقعه بصیرت اند وز عبرت پیر است که در انجام عهد واختتام ایام سلطنت اعلی حضرت صاحبقران ثانی و طلوع کواکب اقبال و اجلال حضرت عالمگیر ظل سبحانی رو داده بشرح شمه ازان صانحه بدیعه : آنکه هفتم ذی الحجه سال هزار شصت و هفت هجری مرضی بر پیکر مقدس و عنصر همایون اعلی حضرت طاری شد، مزاج از منهج صحت و قانون اعتدال که مناظ سلامت احوال و استقامت افعال است منحرف گشت - و چون ایام کوفت امتداد یافته حقیقت قویٰ روز بروز بتضاعف و اشتداد کشید، انواع قصور و فتور در امور ملکی و مالی بهم رسید - و مهین پور سلطنت محمد داراشکوه که خود را ولیعهد میدانست و خلعت استحقاق امر جلیل القدر خلافت به مقراض طمع بر قامت استعداد خود می برید و پیوسته سودای این تمنا در سر داشته از باب سریر عرش نظیر جدائی نمی گزید - درین وقت انتهاز فرصت نموده زمام اختیار سلطنت بقبضهٔ اقتدار خود در آورد و دست استقلال آنحضرت از مراتب ملک و مال نظم امور دولت و اقبال کوتاه ساخته باقتضای رای و وفق تمنای خود در جمیع کارها عمل می نمود - باین سبب خلل عظیم باحوال ملک راه یافته - سرکشانِ هر گوشه و کنار و متمردان هر صوبه و سرکار سر بفتنه و فساد بر داشتند، رعایای واقعه طلب هرجا که بودند ترک مالگذاری نموده تخم بغی و طغیان در زمین تمرد و عصیان کاشتند - و اعلی حضرت باستیلای محبت واولاد در اکثر امور سلوک طریق مداهنت و مسامحه با وی می نمودند و چشم از صلاح دولت خویش پوشیده از جای عنان می فرمودند و بحکم شفقت یعقوبی خاطر آن یوسف مصر تمنا را عزیز داشته در انجاح مطالب و ملتمساتش میکوشیدند - حضرت اورنگزیب عالمگیر را بعد خلاصی یافته رسیدن عیسٰی بیگ که در دربار جهان مدار بخدمت وکالت قیام داشت و شاه بلند اقبال بصدور جرمی محبوس ساخته بودند و تافتن پرتو آگاهی کماهی بر قضا های حضور پرنور آتش خشم زبانه کشید - زیاده بر آن شاهد مقصود عشقیه مراد را زیر نقاب فانی و در رنگ مخفی و محجوب داشتن خلاف قانون مشورت مهین آئین خرد و صلاح دولت دیده نظر بوفور شوکت و حشمت و کثرت و همت و منزلت مهین پور خلافت شاهی پیش رفت کار بر اتفاق برادران کامگار شاه شجاع و محمد مراد بخش که ایالت بنگاله و گجرات داشتند و پیشتر این مراتب تمهید یافته بود گذاشته در باب تصمیم این عزیمت عظیم تفاؤل بدیوان خواجه شیراز نمودند این بیت بر آمد :

حسنت باتفاق ملاحت جهان گرفت — آری باتفاق جهان می توان گرفت

ملخص که آن هر دو برادر والاقدر از بنگاله و گجرات بایمای صواب نمای آن برگزیده جناب کبریا رایات مقاومت و مجادلت برافراشته بر دفق فال خواجه آن زیب اورنگ و سریر بدرستی تدبیر موافق تقدیر گوی مراد از میانه اعدای مادرزاد بود ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ.

روز جمعه بست و هشتم شهر ذی قعده سنه یک هزار و یک صد و هژدهم که حضرت خلد مکان محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاه غازی دل ازین کدورت سرای فانی برگرفته در جوار رحمتِ غفار بگلگشت نزهت گاه جاودانی انتقال فرمودند شخصی از نمک پروردهای این دولت ابد طراز تفاؤل بدیوان حافظ شیراز نمود که آیا نوبت سلطنت بکدام یکی از اخلاف آن فخر دودمان اسلاف که هر یک در عالم خود باوصاف حمیده سروری و صفات پسندیده دادگستری کامل و شامل است رسد این بیت برآمد:

شاه عالم گنج بخش و نکته دان و تیز فهم   حافظ شیرین کلام و بذله گو حاضر جواب

حقا که حضرت شاه عالم خلد منزل بشتر بهمین صفات فرخنده سمات گنج معنی و نکته دانی و تیز فهمی و حفظ کلام الٰهی که بسروش لسان الغیب خبردار و اختصاص و اتصاف داشتند علیهم الرحمة والغفران. و بمصداق این حکایت سراسر سعادت روایتی مستند بقید کتابت من در آید که چون امر خطیری که انتظام سلسله عالمی بآن متوسل و مربوط شده در ملک رو میدهد هر یکی جهت رفاه خلق اللّٰه با هواداری و دولت خواهی سلاطین جمجاه که فلاح همگنان در ضمیر آنست ناگزیر رجوع بفقرای صاحب حال باستخاره و فال می نماید، بناءً علیه عزیزی از اجلّه که حلقه بندگی سلاله کرام تیموریه در گوش و حاشیه اطاعت دودمان عظام گورگانیه اباً عن جد بر دوش داشته مهین استکشاف کرامت نشان که از اخلاف حضرت خلد مکان وجود معظم که این پور خلافت اورنگ آرای سلطنت خواهد شد، دیوان خواجه را گشود این بیت که علاوه معنی فال مرقومة الصدر است برآمد:

شاه عالم را بقا و عز و ناز   باد هر چیزی که خواهد زین قبیل

بحکم اذا جاء اجلهم لا یستاخرون ساعة و لا یستقدمون، بیستم ماه محرم الحرام روز یکشنبه سنه هزار و یکصد و بیست و چهار هجری که تجلی جلال رحمت ایزدی مجوف اعضای حکمت سرمدی خسرو گیتی پناه خلد منزل شاه عالم بهادر شاه لباس حیات مستعار از بر کشیده و دامان تعلقات از شهرستان وجود دنیدار برچیده بگلگشت نزهت گاه جاودانی خرامید در ماه ربیع الاول سنه مذکور بدار السلطنة لاهور جنابه

خطبای شریعت مسلوک و روانی دنانیر و نقود مسکوک بنام نامی شاه انجم سپاه محمد معز الدین ابوالفتح
غازی جهاندارشاه مانند زر و سیم آفتاب و ماهتاب سر مباهات بافلاک کرد و همان سال در عظیم آباد فرحت
بنیاد شهید مرحوم همایون نثار برگزیده دودمان افتخار بادشاه بحر و بر محمد فرخ السیر خلف الصدق نور
حدقهٔ خلافت و جهانبانی پور حدیقهٔ صاحبقرانی جرعه کش آب تیغ و رضا و تسلیم سرخرامنده روضات نعیم
سلطان والاشان محمد عظیم الشان اعلام نصرت انجام فتح توام و الویه فیروزی فرجام ظفر پرچم افراخته
باب سریر خلافت مصیر را ارجمند و چتر آسمان فرسای مهر تنویر را سربلند ساخت و دبدبهٔ ادعای فرمانروائی و
طنطنهٔ عزیمت کشورکشائی آن عالی همم مسامع عالم و عالمیان رسیده غلغلهٔ شوکت جبروت شعار و دولهٔ
حشمت گیرودارش باکناف ممالک کشید، بزرگی در استظهار این معنی که کدامین ازین دو شاه باز
اوج عز و جلال در مرغزار امانی و آمال گیرای صید بخت و اقبال خواهد شد دیوان معجز بیان لسان الغیب
را کشوده این بیت فرخ فال صراحةً مشیر فام آن بحر جود و افضال بر آمد:

اگر میل دل هرکس بجاییست بود میل دل ما سوی فرخ

آیینه ضمیر منیر دانشوران صاحب نظر و مرآت باطن تجلّی موطن روشندلان دیده ور عکس پذیر
صورت این معنی است که هرچند صحایف خواطر قدسیه از نقش علایق دنیوی مصفّا است و الواح از تباح ارواح
طیبه از رقش عوایق صوری معرا لیکن گاهی برای تسکین و تسلّی ارباب اضطرار شاهد محجوب اسرار را به تلمیح
و اشاره جلوهٔ شهود میدهند و عقدهٔ خاطر فاتر اصحاب افتقار با تامّل فال بشارت کشود می بخشند. مصداق
این مقال فالی است که از دیوان حافظ شیراز بر آمد یعنی در ایام سر بشورش برداشتن احمد افغان ابدالی
بداعیهٔ تسخیر هندوستان جنت نشان که با چهل و پنجاه هزار سوار جرار تا سهرند رسیده بود و حضرت محمد شاه فردوس
آرامگاه نیر اعظم خلافت ابوالنصر مجاهد الدین احمد شاه بهادر غازی را که در آن زمان فقط باسم گرامی احمد
شاهی نامور بودند برای دفع و تنبیه ابدالی مذکور رخصت فرمودند، لکن آنحضرت تا دمیدن صبح فتح و فیروزی
هر صباح و مسا جبین نیاز بجهة ظفر و نصرت بادشاهزاده کامگار و مخذولی ابدالی می سودند. در همان ایام
روزی اختر سعد فلک حشمت نیر اعظم سپهر شوکت ضیاء الدوله سعد الدین خان بهادر خانسامان شرف حضور
اختصاص داشتند که آنحضرت فردوس آرامگاه از دیوان سراپا اعجاز حافظ شیراز تفاؤل نمودند، این
غزل که املاء باطن از آن ظاهر می شود بر آمد:

گرچه ما بندگانِ بادشاهیم[1] ....

کہ شاه عباس علیه الرحمة بتقریب شیر و شکار مازندران را که فی الحقیقت عزیمت یلغار بجهت استخلاص آذربایجان که تبریز پای تخت آنست و شروان از دست دمکنون خاطر عاطر داشت توجه فرمود - باین کنگاش سوای چیتاخان شاملو واله قلی بیگ قورچی باشی قاجار احدی پی برده بود - از غرایب حالات آنست روزیکه در اصفهان این مقدمه تمهید یافت مولانا صبوحی منجم تبریزی با وکیل پاشا که در قلعه تبریز مانده بود ملاقات می نماید - وکیل از و تفحص می کند که خبر آمدن شاه به تبریز در شهر برچه نهج مذکور میگردد - چون خبر نداشت می گوید غلط است - لحظه این گفتگو درمیان بود باطناً مولانا چون دولت خواهی آن دودمان عالیشان در تخمیر داشت تفاؤل به دیوان حافظ نمود در اوّل صفحه یمین این مقطع برآمد :

عراق و فارس گرفتی بشعر خوش حافظ بیا که نوبت بغداد و وقت تبریز است

حاصل که در اندک زمانی مطابق نوید آن زنده جاوید شاهد مقصود که در حجله ضمیر خورشید منظیر بود با حسن وجهی چهره شهود نمود -

بر نکته سنجان حقیقت آشنا و خرده بینان معنی پیرا گرم و سرد آزمایان زمانه خراب آباد و نیک و بد دیدگان عالم کون و فساد مبرهن و لایح است که گاهی انتقال گردش فلکی و ارتحال سعد و نحس کواکب رصدی در هر عنصری از اعصار و قرنی از قرون چرخ دوار و با نقلاب سیر و سکون سبع سیاره فساد شورش اشرار معموره اقالیم سبعه رو بخرابی می آرد و وقتی خرابه بزمین بعد انقضای امتداد سنین از قهرمان فرمان روایان جهان په دره فرمان قضا جریان سلاطین دادگستر آباد می گردد - چنانکه او اخر سلطنت بادشاه مظلوم محمد فرخ سیر شهید مرحوم که تاریخ سال تحسر اتصال تودیع جهان فانی و رحلت شهرستان جاودانی آن خسرو شهید بعید از فحوای :

دل با سر حیف گفت تاریخ تجدید فساد کربلا شد

که اوّل اورنگ آرائی فردوس آرامگاه محمد شاه باشد ، مفهوم می افتد نور الله مرقدهما - درخطه کشمیر جنت نظیر فضیلت نشان محتوی خان لسبی با اجماع بلوای عام کالانعام بل هم اضل باکوره دشمن ملل

ا۔ ورق چند بعد ازینجا در نسخۂ فالنامہ مفقود شدہ۔

کارفرمای کریم فَاقْتُلُوهُمْ حَیْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ گشته غارت اقمشه و امتعه آنهار ابمقتضای مَنْ قَتَلَ قَتِیلاً فَلَهُ سَلَبُهُ غنیمت شمرد - چون اشتعال این نائره خرابی روز افزون و زبانه آتش مفسده جهان سوز از بیرون گروه هنود را خاکستر نشین گردانید میر احمد خان نائب ناظم جنود جلادت آمود به تسخیر و احضار سر منشار فساد و تنبیه لشکر ظلمه و بیداد تعین فرمود - حسب الاتفاق منصور نگشته ناچار هزیمت و فرار از ان دیار اختیار نمود - بعد از ان شاه پور خان بخشی و متصدیان دیگر بمصلحت تزویر آمیز تدبیری انگیخته و بهیپائی اهل تشیع کر اکثری از آنها صاحب شمشیر و تدبیر اند بخیال استصلاح ملک قتل خان مذکور شگون بخشی دانستند - محمد تخان لیسرش و قاضی شهر و اعزه عمر طوغاد گرها با همان غارت گران جبار آثار و یغمائیان بیباک خسارت مناظر بقتل و تاراج شیعیان و هدم و انهدام بنیان ایشان اجماع نموده شتافت - فصاحت خان راضی بنظم مثنوی این داستان فتنه نشان ابواب معانی بلند بر روی ارباب سخن کشاده مانند انوری داد سخنوری داده جهت ازدیاد لطف کلام پاره از اشعار آبدارش درین مقام انتظام یافت -

بحکم نافذ خانِ معلّی ... متاع خانها کردند یغما

رسد از حربه اش گرمی بنار سیت ... دعای سبعیش در تعداد سیت (کذا)

ز بس شد تیر باران بی تفاوت ... نشان میداد از سنگ ندامت (کذا)

بنای کفر کنده قوتِ دین ... نباشد گرچه جنگ خندق است این

چنان از زنده پوشان اجتماع است ... که گوئی غزدهٔ ذات الرقاع است

ز هر بامی همی سرگرم کین است ... بلی معنی جنگ بدر این است

بخاک افتاده اند از بسکه شیران ... زمین پهلو زند با شیر میدان (کذا)

چو بود از زمرهٔ اتراک بخشی ... شگون در قتل خان دانست بخشی

بشیون شد بدل آواز چینی ... کباب امروز نبود جز حسینی (کذا)

عراقی زادها از بس تب و تاب ... اجل خود چون و زرع افگنده در آب

چنان تاراج بر روی زمین است ... که گوئی پیش عاشوره همین است

بکس ستری نماند از بی نوائی ... مگر ز دار شهید را رضائی

سزد گر تا بمحشر داغ باقی | بود بر نطقهٔ شمس عراقی
پی اصلاح آن عبدالصمد خان | بحکم نافذ شاه جهانیان
رسیده از دفور فوج مقهور | تل اللہ اکبر گشت خاپور (کذا)
سر صدتن ز اہل لبغی یکدست | چو تار سبحہ با یک ریسمان بست
بفرمانش خصم است بردار | عیان بر خلق شد معنی سردار

مدعا آنکہ دران ایام فرات توام خواطر وضیع و شریف لگن خطر والم گردید و دیدہ عبرت دیدگان اولوالابصار ازین کشت وخون چپ وچاپ ترسید۔ روزی حقایق ومعارف آگاہ سید شاہ ابوالبقا قادری وسالک شوارع ارجمندی خواجہ عبدالغفور نقش بندی ارتباط معنوی واختلاط حقیقی باہم داشتند۔ در استبشار رفع اشرار دیوان سراپا اعجاز خواجہ حافظ شیراز تفاؤل نمود سر صفحہ یمین این بیت بر آمد:

شد لشکر غم بیعدد از بخت می خواہم مدد
تا فخر دین عبدالصمد باشد کہ غم خواری کند

مردم متحیر ومتفکر این فال خیر مآل بودند کہ در سنہ احد فردوس آرامگاہی نواب عبدالصمد خان دلیر جنگ بہادر محمد شاہی برای رفع مفسدہ وقلع وقمع مفسدان از پیشگاہ خلافت مرکوز الصیانت مامور شدہ بند و بست ملک بآئین شائستہ وروش بایستہ فرمود۔

غریق بحر رحمت الٰہی سیادت خان نیشاپوری محمد شاہی نقل میکردند کہ بتقریبی رفتن ایشان بشیراز اتفاق افتادہ بود روز پنجشنبہ باتفاق بعضی از احباب برای فاتحہ سخنگوی دلنواز خواجہ حافظ شیراز وسیر گلزمین مصلا رفتند۔ ہنوز فراغ از زیارت حاصل نشدہ بود کہ پسر مقبولی از دولت مند زادہای آنجا در کمال جمال وحسن بالامال مست شراب با پیرایہ مکلف ویاران موافق نیز در رسید۔ یکی از ہمدمانش درمقام شوخی گفت کہ بوسہ بہ تربت حافظ بدہد۔ آن مہر سپہر رعنائی وزیبائی محجوب شد واقدام بانیرام نکرد۔ ہم مشربانش ابرام کہ شیوہ مدام می خواران است ازحد بردند۔ آخر باہوا قرار بران گرفت کہ از دیوان حافظ تفاؤل کنند، آنچہ خواجہ فرماید بران عمل نماید چنین کردند، این بیت بر آمد:

سرمست با قبای زرافشان چو بگذری | یک بوسہ نذر حافظ پشمینہ پوش کن

ازین لطیفهٔ غیبی بابتهاج و انشراح آمده بیشتر از پیشتر بر جد و کد افزودند. آن سرخوش نشهٔ حیا شرمگین نشده قرار کرد که پنجشنبهٔ آینده بیاید و بتضاعف آواز نذر نماید. ملخص که روز موعود اقل این حکایت هم بشوق تماشای وفای عهد دران مکان فیض نشان حاضر شد و آنجماعه عشرت کیش نیز در رسیدند. این مرتبه هم بدستور سابق آن عزیز را که یوسف مصر جمال بود خود رائی که از خصائل خاص محبوبانست در گرفت: بعد گفت و شنود بسیار قرار یافت که باز همان طور تفاؤل نمایند. حاصل که مرتبهٔ ثانی این شعر بر آمده:

گفته بودی که بیاییم و دو بوسه بدهیم   وعده از حد بشد و آمد و دیدیم و نه یک

طرفه غریوی از حلقهٔ می گساران برخاست و خسرو مملکت شیرین ادائی زیاده تر پا بدامن حیا کشیده در مقام خودداری نشست. آخر آن جرگهٔ بیباک از گردنش گرفته دو بارش را که در حلاوت رونق قند مکرر می شکست بر قد آن زندهٔ جاوید سودند.

مغفور محل رحمت نامتناهی الهی نواب برهان الملک نیشاپوری محمد شاهی چند قطعه زمین متصل کابلی دروازهٔ شاهجهان آباد داشتند. خواستند که دیگر قطعات حوالی آن را خرید نموده محلی عظیم الشان و منزل رفیع المکان ....

.... تابعان بعد رحلت بر طبق وصیتش خواستند که عمل نمایند. موالی خواجه ممانعت پیش آمده گفتگوی فیما بین واقع شد. بزرگان و رؤسای آن شهر فیض بهر درمیان آمده مقرر نمودند که طرفین تفاؤل بدیوان هر دو گویای صاحب حال نمایند. هرچه برآید بفحوای آن عمل نمایند. اول دیوان خواجه کشودند این بیت بر آمد:

رواق منظر چشم من آشیانهٔ تست   کرم نما و فرود آ که خانه خانهٔ تست

پس دیوان ملا اهلی کشودند این بیت بر آمد:

جایم بروز واقعه پهلوی او کنید   او قبلهٔ من است رخم سوی او کنید

از وقوع این لطیفهٔ غیبی نزاع برطرف نموده راضی شدند و در پهلوی خواجه بزرگوار بنیت گذاشتند رحمهما الله تعالیٰ.

---

۱. بعد ازین یک دو ورق نداریم.

مولانا سیاوش از اعیان فضلای زمانی بود۔ در خدمت سلطان حسین میرزای بایقرا قرب و منزلت عظیم داشت۔ وقتی در ہرات برفض متهم گشت۔ علمای آنجا بمبالغہ تمام قتل اورا قصد نمودند۔ سلطان حسین میرزا فرمود بدیوان حافظ تفاؤل کنیم۔ ہرچہ برآید برآن عمل نمائیم۔ پس فرمود کہ دیوان حافظ بکشایند و تفاؤل نمایند۔ چنان کردند۔ این غزل برآمد:

ساقی از بادہ باندازہ خورد نوشش باد ۔۔۔ ورنہ اندیشۂ این کار فراموشش باد

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت ۔۔۔ آفرین بر نظر پاک خطا پوشش باد

شاہ ترکان سخن مدعیان می شنود ۔۔۔ شرمی از مظلمۂ خون سیاوشش باد

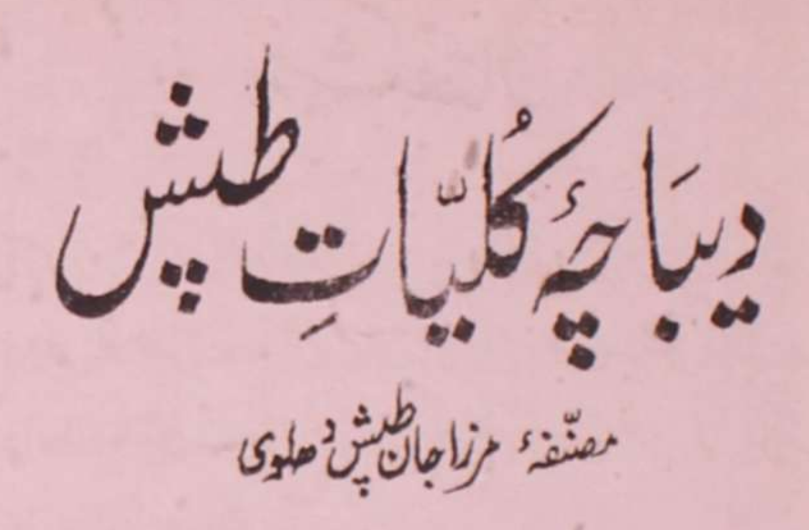
حسین مرزا از جای در آمد و اورا اطلاق فرمود و زر و خلعت بخشید۔

این حکایات را بندۂ عاصی عنایت خان راسخ بن لطف اللہ خان صادق مغفور فراہم آورد۔

راقمہ

خلیفہ محمد واسع الدین انصاری

غفر اللہ ذنوبہ



اُردو زبان کے ارتقا کے بارے میں قدیم ترین نثری دستاویز جو ہم تک پہنچی ہے شاہ حاتم کے قلم سے ہے ـــــ اِس کے بعد یہ دوسری اہم دستاویز کلیاتِ طپش کا دیباچہ ہے، جو دیوان زادہ کے دیباچہ کے تیس ۳۰ سال بعد کا ہے۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر اسے تمام و کمال شائع کیا جا رہا ہے۔

پیشگفتار

احوالِ طپش : مرزا محمد اسمٰعیل عرف مرزا جان طپش دہلی میں پیدا ہوئے[1]۔ باپ مرزا یوسف بیگ بخاری سپاہی پیشہ تھے۔ طپش نے دہلی میں پرورش پائی۔ فنِ بلاغت مرزا محمد یار بیگ سائل سے اور فنِ شعر خواجہ میر درد اور شاہ ہدایت سے حاصل کیا۔ خوش نویسی بھی بطور فن سیکھی۔ خاندانی سپاہی تھے اس لئے فنونِ سپہگری سے بھی واقف تھے۔

بیاضِ طپش میں کچھ ہندی کلام بھی ملتا ہے، جس میں شاعر اپنا تخلص سدا اخیر استعمال کرتا ہے اگرچہ کلام طپش کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا ہے تو بھی اس سے ان کی ہندی سے دلچسپی اور واقفیت ضرور ظاہر ہوتی ہے۔

علوم رسمیہ کی تکمیل کے بعد شاہ عالم ثانی کے ولی عہد مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کی ملازمت اختیار کرلی۔ جن کی سپاہ میں وہ افسری کا عہدہ رکھتے تھے۔ شاہزادے نے جب لکھنؤ کا سفر اختیار کیا، تو یہ اس کے ساتھ تھے اور اس کے بعد پھر بنارس بھی ساتھ گئے۔ بنارس میں یہ شاہزادے کے انتقال ۱۲۰۱ھ تک مقیم رہے علی ابراہیم خاں سے بھی یہیں بنارس میں ملاقات ہوئی۔ شعر گو اور شعر فہم شاہزادے کے انتقال کے بعد یہ بنارس سے روزی کی تلاش میں نکلے اور مرشد آباد/ ڈھاکہ پہنچ کر نواب امیر الملک شمس الدولہ مرزا احمد علی خاں بہادر ذوالفقار جنگ کے متوسّلین میں شامل ہو گئے۔ یہاں کے قیام میں ۱۲۰۷ھ میں انہوں نے اپنی اولین تصنیف "شمس البیان فی مصطلحاتِ ہندوستان" لکھی۔

---

[1] **ماخذ:**۔ شعرائے اُردو کے مشہور تذکروں 'تذکرہ ہندی (مصحفی)' 'مجموعۂ نغز (قاسم)' 'عمدۂ منتخبہ (سرور)' 'گلشن بے خار (شیفتہ)'، 'طبقات الشعرائے ہند (فیلن۔ کریم الدین)' 'سخن شعرا'، 'قطعۂ منتخب (نساخ)' 'معیار الشعرا (ذکا)' 'تذکرۂ عشقی'، 'دیوان جہاں (بینی نرائن جہاں)'۔۔ اور بعد کی کتابوں 'سیر المصنفین (تنہا)'، 'ارباب نثر اُردو (سید محمد)' 'داستانِ تاریخ اُردو (قادری)' میں طپش کا تذکرہ ملتا ہے

علاوہ ازیں اشپرنگر کے "اودھ کیٹلاگ" اور گارساں دی تاسی کی "ہندی اور ہندوستانی ادبیات کی تاریخ" اور بلوم ہارٹ کے برٹش میوزیم کیٹلاگ میں بھی مذکرہ ہے۔

اس طرف بنگال میں اُردو (اقبال عظیم)، مقدمۂ بہار دانش (خلیل الرحمٰن داؤدی) اور بیاضِ طپش کا تعارف (نجم الاسلام) قابلِ ذکر ہیں۔

بغاوت اور اسیری : ۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کے انتقال کے بعد، وزیر علی خاں اور انگریزوں کی نہ بنی۔ طپش کے مربی شمس الدولہ نے وزیر علی کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ وزیر علی کے ساتھ انہیں بھی وزیر علی کی شکست کے بعد فورٹ ولیم میں انگریزوں کی قید میں رہنا پڑا۔ شمس الدولہ کے قریبی رفیقوں میں طپش بھی ان کے ساتھ ہی قید ہوئے جہاں سے ۱۲۲۱ھ میں رہائی پائی۔ رہائی کے بعد شمس الدولہ کی رفاقت اختیار کرنے کے بجائے وہ کلکتہ میں مقیم ہو گئے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے وقت طپش قید میں تھے اور قید کا تعلق 'بغاوت' سے تھا۔ اس لئے گلکرسٹ کے عہد میں فورٹ ولیم کالج سے طپش کی وابستگی بعید از قیاس ہے۔ بہار دانش عہد گلکرسٹ کی تصنیف ضرور ہے (۱۲۱۷ھ) لیکن یہ کام بطور خود اور کالج سے باہر کا کیا ہوا ہے۔ آغاز داستان سے قبل انگریز حکام کی تعریف میں جو اشعار ہیں، جو بعد کا اضافہ ہو سکتے ہیں اور یہ اضافہ طپش نے ۱۲۲۱ھ میں قید سے رہائی کے بعد کیا ہوگا۔ فورٹ ولیم کالج اور کپتان ٹیلر کی مدح میں ایک ایک منظوم پیراگراف صرف اتنا ظاہر کرتا ہے کہ طپش کسی طور سے ۱۲۲۱ھ کے بعد یا تو کالج سے وابستہ ہو گئے یا ہونے کے امیدوار تھے یا کم سے کم بہار دانش کو کالج سے چھپا دیکھنا چاہتے ہوں جو خواہش پوری نہیں ہوئی۔ کالج نے ان کا دیوان شائع کیا، یہ بیان بھی ابھی[1] تک ثبوت کا محتاج رہا ہے۔

کلکتہ، پٹنہ، بنارس :- بیاض کی یادداشتوں کے بموجب کلکتہ میں وہ ۱۲۲۵ھ تک موجود تھے۔ ۲۷ شوال ۱۲۲۷ھ اور اس کے آس پاس عظیم آباد میں تھے اور ۲ ربیع الثانی ۱۲۲۸ھ کو اور اس کے آس پاس بنارس میں۔

وفات : تذکرہ بینی نرائن جہاں کی تالیف '۱۲۲۷ھ تا ۱۲۲۹ھ' کے وقت وہ زندہ تھے جیسا کہ اوپر کی یادداشتوں سے بھی ظاہر ہے۔ مزید برآں بیاض طپش میں آخری یادداشت جو طپش نے بقید تاریخ تحریر کی ہے ۸ شعبان ۱۲۲۹ھ ہے: "بتاریخ ہشتم شعبان ۱۲۲۹ھ روز شنبہ یک پہر و سہ گھڑی از بطن پیاری بیگم پسر تولد شد"

ریاض الوفاق کے نام سے ذوالفقار علی مست کا ایک تذکرہ شعرائے کلکتہ و بنارس[2] اشپرنگر کو اودھ ذخیرہ میں ملا تھا جس کے مطالعہ کے بعد اشپرنگر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ۱۲۲۹ سے قبل طپش وفات پا چکے تھے۔ اس نتیجہ کی بنیاد مذکورہ تذکرہ کا قطعہ تاریخ تالیف ہے جس سے ۱۲۲۹ھ نکلتی ہے۔ اس امکان کو پیش نظر رکھ کر کہ تذکرہ قطعہ تاریخی کے بعد بھی تکمیل پاتا رہا ہوگا اور شعبان ۱۲۲۹ھ کی بیاض طپش میں موجود ایک یادداشت کی شہادت

۱- صرف یہ بات صحیح ہے کہ ۱۲ ستمبر ۱۸۱۲ء کو فورٹ ولیم کالج کی گیارہویں سالانہ تقریب میں کلیات طپش کو انعام سے نوازا گیا۔ روبک کی توقیت ص ۲۹ میں اس کا ذکر ہے۔ (البوم ہارٹ / مخطوطہ نمبر ۳۷)۔

۲- یہ تذکرہ ڈاکٹر خیامپور نے ۱۹۶۳ء میں تبریز سے شائع کیا اور پروفیسر حسن و پروفیسر عطا کاکوی نے ۱۹۶۷ء میں پٹنہ سے۔

بھی ہے' یہ کہا جاسکتا ہے کہ شعبان ۱۲۲۹ھ کے کچھ عرصے کے بعد کلکتہ میں ان کا انتقال ہوا۔

سلسلہ و اخلاف: طپش کے ایک بیٹے مرزا اثر کا ذکر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ ڈھاکہ میں ان کے داماد کے ذریعہ قائم شدہ سلسلہ شاعری پر "مشرقی بنگال میں اردو" (مصنفہ اقبال عظیم) نامی کتاب سے روشنی پڑتی ہے:

"مشرقی بنگال (اب بنگلہ دیش) کو اس بات پر فخر ہے کہ مرزا جان طپش جیسا معروف صاحب کمال اس کے دارالحکومت ڈھاکہ میں ایک مدّت تک مقیم رہ چکا ہے اور ان کے سلسلہ سے کچھ ہی دنوں پہلے تک خواجہ میر درد کا خانوادہ شاعری اس شہر میں زندہ تھا۔ چنانچہ مرزا غلام حسین آتش ولد مرزا کریم اللہ بیگ وکیل عدالت دیوانی جو یہیں ڈھاکہ کے باشندے تھے، طپش دہلوی کے داماد اور شاگرد تھے اور آتش کے سلسلے میں مولوی فرجام علی بجود باشندہ بنیاچوک ضلع سلہٹ، شیخ احمد جان عطش ساکن ڈھاکہ، مولوی رحمن علی طیش، مصنّف 'تواریخ ڈھاکہ' اور مرزا لطیف گستاخ باشندۂ ڈھاکہ سب کے سب بالواسطہ اسی خانوادہ سے متعلق ہیں۔"

تصانیف: شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان[1]، قصہ یوسف زلیخا[2]، بہار دانش[3]، کلیات طپش[4]، بیاض طپش[5]۔

افادات: قاضی عبدالودود، نجم الاسلام، اکشیر نگر، اور داؤدی

مرتّب: عابد رضا بیدار

۱۔ مطبوعہ نسخہ اور ایک مخطوطہ رام پور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ مطبوعہ نسخہ قدیم تر ہے جسکی نقل خدابخش کے لئے حاصل کر لی گئی ہے۔ لائبریری جرنل کے کسی اگلے شمارہ میں اسے تمام و کمال دیا جارہا ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل یہاں لاحاصل ہے۔

۲۔ تنہا عشقی عظیم آبادی کی اطلاع ہے کہ بنام 'قید رختہ' میں 'یوسف و زلیخا' لکھی۔ اس کی موجودگی کی اطلاع کہیں سے نہیں ملی۔

۳۔ ۱۲۵۵ھ اور اس کے بعد کی دو اشاعتیں' ۱۲۸۹ھ اور ۱۳۱۲ھ کی' خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب کو دستیاب ہوئیں۔ رجن کے ایک سیر حاصل مقدمہ اور تصحیح و ترتیب کے ساتھ بہار دانش کا ایک معتبر ایڈیشن مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔

۴۔ دو نسخے خدابخش لائبریری میں محفوظ ہیں؛ ایک میں صرف دیوان ہے اور دوسرا کلیات۔ کلیات کا ایک نسخہ 'بنگال میں اردو' کے مصنف کی اطلاع کے مطابق حکیم حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم سے ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کو پہنچا اور ان سے پروفیسر طاہر فاروقی کو۔ یہ کتاب 'بنگال میں اردو' مولفہ اقبال عظیم ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب نے بہار دانش ۱۹۶۳ء میں ترتیب دی۔ لیکن اس نسخہ کی پاکستان میں موجودگی کی انہیں اس وقت بھی اطلاع نہ تھی۔ ممکن ہے اس وقت تک ضائع ہو چکا ہو!

کلیات کا تفصیلی تعارف 'جرنل' کے کسی اگلے شمارہ میں کرایا جائے گا۔ اس لئے یہاں تفصیل سے گریز کیا جارہا ہے۔

۵۔ بیاض کا ذکر تصانیف میں بہت زیادہ موزوں تو نہیں ہے' لیکن ان کی نوشتہ چیز ہے' اس لئے اسی ذیل میں تذکرہ ہوا۔ غزالی کالج حیدرآباد سندھ میں مخطوطات و نوادر کی ایک نمائش مورخہ مئی ۱۹۶۷ء میں بیاض نجم الاسلام صاحب کو دیکھنے کو ملی جس کا تفصیلی تعارف انہوں نے 'نقوش' ستمبر ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں کرایا ہے۔

●●●

دیباچۂ کلیات طپش

بعد حمد خدای سخن آفرین و نعت رسول موید بکتاب مبین خاکپای سخن سنجان متخلص بطپش مدعو بمیرزا جان حقیقت حال به پیرایه صدق مقال عرضه می دہد که :-

روزی که حضرت استاد این ابجد خوان لوح نادانی را به رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَیَسِّرْ لِی اَمْرِی وَ احْلُلْ عُقْدَۃً مِنْ لِّسَانِی یَفْقَهُوا قَوْلِی تلقین فرموده بشناسایہ مفردات نمود. اوّل بسم اللّٰہ و الف قامت سہی قدان بحرف نخستین دیدم و نقطه ہای موعده نیز خال زیرلب نوشین فہمیدم آری دبستان عشق را اینست دیباچۂ کتاب حسن تا حرفاً حرفاً رقم ازلی بنماید، و بلطائف براعت استہلال انجام را در آغاز تقسیم فرماید دہمین است که ہرچند دران اوقات تمیز نظم از نثر کمتر بود، و تفریق موزون از ناموزون نمی توانست نمود مع ہذا دل را نکات درد آمیز از جا بردی، و خاطر را مضامین نمکریز بدرد آوردی، گاہی چون طفل اشک بگریہ دبکا می گذشت و زمانی این شعر عرفی:

عشق میخوانم و میگریم زار طفل نادانم و اول سبق است

بر زبان می گشت، تا آنکه فیضان روح اقدس را کار گرد. بہنگام خویش بود وقت خاص رسید، و خاطر سرگرم نکته دانی آئینه دار فیض رحمانی گردید۔

پس رعنا غزالان معانی بلباس غزل جلوه گری فرمودند، و شاہدان برجسته مضامین بحلیۂ الفاظ رنگین و عبارات متین از کتاب انتخاب رخ نمودند۔ آب سخن از نوک قلم چکیدن

گرفت، وخورشید الهام بر خلوت کدهٔ ضمیر دمیدن آورد، نظم طبعی سرمایه اندوخت وشمع شهرت در محافل سخن سرائی افروخت، ورفته رفته این ترانه های دلکش عاشقان سخن را چندان محو ترنم نمود که در افراد عالم یکی از دیگری اشنود، بجدی که قال قال این تذکار بگوش حقیقت نیوش گوهر هفت دریا شرف بخش سلسلهٔ چغتا وارث تاج وافسر قاآنی فر رافع لوای گورگانی شمع تابان ودر بزم فروغ بخش آل تیمور همای سمای ملند پروازی صاحب عالم میرزا جهاندار شاه ولی عهد شاه عالم بادشاه غازی که دارای دیگر جمعیت فنون وفضایل از حد افزون در نظم ونثر هم وحید روزگار ومتخلص بجهاندار است، رسید، وشایق دیدنهای این نادیدنی گردید پس بهادر بیگ خان غالب تخلص بن طالب جنگ بدخشی را که راقم آثم در آن هنگام بجز متش گذرانیدی، اشارت عالی رفت تا این بی مقدار را ببارگاه عالم پناه که هنرمندان را معیار علم وعمل است رساند، ودر عداد حضوریان شامل گرداند وچون از مادهٔ ازلی همچنین بود بطرفة العین جلوهٔ ظهور نمود۔

باری عندلیب خوشنوا در تخت گاه چمن حضور شاهنشهٔ گل رسید وذرهٔ خشید ابر پیشگاه ادب کورنش یاب سلطان خاور گردید۔

ای خدا قربان احسانت شوم　　　این چه احسانست قربانت شوم

ومزیدی بر الطاف غیبیه اینکه بهمدران هنگام کی این نیر عالمتاب سپهر جناب را بمعمورهٔ دلکشای لکهنو که فی زماننا غیرت گلزار نعیم وگلگونهٔ رخسار هفت اقلیم است، چون تحویل شمس به برج حمل گذر افتاد ونواب عالی جناب انیس وجلیس مجلس خاص محرم ودمساز خلوت سرای اخلاص مرتبه سنج آداب حضور سلطانی اعلم وعلام مزاج دانی اعظم الامرا اشرف الوزرا عمدة الملک وزیر اعظم دستور مفخم آصف الدوله بهادر در تکلفات استقبال وسامان نزول اجلال داد سلیقهٔ وزارت بداد اعنی روز ورود مسعود چندان تزئین شوکت شاهانه وتجمل خسروانه را کار فرمود که چشم فلک از بدو نظام آفرینش در هیچ عید ونوروز ندیده بود از مخیم سراوقات اقبال تا دولت سرای جاه وجلال رفت وروب کوچه وبازار بر صفای صحن گلزار طعنه زدی ونقش ونگار بر در ودیوار به آرایش پرده های زرنار در لمعانی ودرخشانی حجلهٔ عروس فتنه انگیز گردی،

مغنیانِ جادو نوا بر ہر رنگ نغمات دلکش می خوانند، و مطربان دلستان سرا بہر مقام عالم دعالمیان را بوجد می آوردند، بخور منقل ہای زرین وعود سوز ہای عنبر آگین بمرتبہ ارض و سما را معطر ساختہ بود کہ نشر روایح از موج باد بہاری گوی سبقت می ربود، عطایای بیزہ از نذر و نثار بدامن امید بدمستانِ روزگار آں قدر رسید کہ عالمی مستغنی و بی نیاز گردید۔ بخت غنودہ ہر جا بود، بصدای حی علی المراد بیدارش فرمود، نقارچیان عشرت اندوز آواز کوس تہنیت، بگوش زہرہ و ناہید رسانیدند، و نائیان گلو سوز دلہای جہانیان بباده شوق مست و مدہوش گردانیدند:

دوران بہ بہار رنگ و بو داد	گلدستہ بدست آرزو داد
جنبید صبا بہ گل فشانی	برخاست زمیں بآسمانی
گل امرزو د بوستاں برافروخت	شمع آمد و دودمان برافروخت
بستند بروزگار آئین	اقلیم شدہ بہار آئین

ہرگاہ سواری مبارک باچنیں فرو ت دم میمنت لزوم کہ دولت داقبال پیش طرقو طرقو بود بمہمان خانہ منتہی شد، بارگاہی نظر افتاد کہ بشکوہ و رفعت و علو وعظمت ستونش عصای دست افلاک تواند بود دایوان و کشایش نزہت گاہ فریدونی و عشرت سرای لیومرثی از خاطر جہان پیر محو می نمود" مسندی کہ در ایوان آرزو از سالہای دراز انتظار ایں مقدم می کشید بشرف جلوس رشک افزای تخت کاؤسی گردید۔ پس مہوشان دلفریب و تاراجیان صبر و شکیب، و نازنیناں خورشید لقا وجادو نگاہان ہوش ربا، اعنی طوائف دعاگو یان کہ بالاتفاق ہمچو گلدستہ نرگس نگہدار و منتظر این زمان خجستہ وساعت فرخندہ بودند، یکبار بعشوہ و ناز برخاستہ طاؤس وار برقص در آمدند، و در عرض مبارک، باد مستورہ و معمولات جشن ہر دو دست دعا بر داشتند، و مطربان سازندگان موسیقار را تار بر بستند و بصدای بشکن بشکن دلہای اعدا شکستند و ظرفای لطیف البیان نیز اہل بزم را بلطائف و ظرائف از خود بردند و ندمای بذلہ گو مجلسیان را بشغف و انبساط در آوردند، ہمدریں حالی نواب وزیر اعظم تحایف پیشکش را جلوہ آرا گردید، گونا گون طبق جواہر و خوانِ اقمشہ و نفائس بہ اقبال دا فراس دلوازم بے قیاس چناں کہ

شان سلطنت را سزد. بنظر اقدس گذرانید. و من بعد بخلعت چار قب که مخصوص منصب
جلیل وزارت است بر دوش خود پیراستہ بار رامگاه معاودت فرمود از امرای اعظم نیز هر یکی
علی قدر مرتبت بتبرکات سلطانی قدر خویش افزود. و المنت للہ که از آن تاریخ تا زمان
تسطیر که تخمیناً دو سال بران منقضی گردید چشم بد دور اختلاط آصف و سلیمان بدستور و از
اولیای دولت هر کس دل شاد و مسرور است هر صبح نو بنشید و ترانہ صبح عیدی می دمد، هر
شام تازه شبستان عشرت را تمهید میگردد -- و هر چند خاطر شاه و وزیر بعد انجاح مرام صغیر
و کبیر و ادای طاعت و عبادات در فراغ اوقات حسب تجویز عقلا و حکما بنا بر شغل طبیعت
اقسام مشاغل و انواع ملاعب را زمان زمان بطرز گوناگون جلوه فرمائی را ابداع است
اما شغلی که بیشتر بال استلذاذ افتاده خاص لذت سخن است. و چرا نبود که خدای سخن آفرین
جانبین را این استعداد موهبت فرمود و درین عطیه گرامی ممتاز نموده، و درین مقام چون خوب
غور کردیم متحقق شد که این هم بهر جانب از نسبت ستارنیست، اعنی مطالعه کنندگان تاریخ و
سیر نیکو دانند که ظهیر الدین بابر گیتی ستانی را درین فن ارجمند تا بچه حد دستگاه عالی و کمال قدرت
و نسبت با اهل این فن بچه مثابه معاشرت و عنایت بوده است که در حضور آن حضرت
از سخنوران پای تخت هفتاد شاعر جلیل القدر به کرسی می نشست، و بشرف تخاطب می پیو
رست و همچنین از حضرت همایون جهانبانی تا حضرت نورالدین جهانگیر جنت مکانی و در طبقات
شاهزادگان ولیعهد اعلی حضرت دارا شکوه شهید قادری تخلص و نوزحدقه سلطنت
اورنگ زیب عالمگیر محمد اعظم شاه ملقب بعالی جاه متخلص باعظم باین وادی چگونه التفات
داشتند -- و فی زماننا درین عصر حضرت اولوالامر جهان پناه شاه عالم بادشاه که سریر سلطنت
از وجود مقدس آن حضرت گاهی خالی مباد هم بجهه فرط شوق مصروف هر شام و سحر است که
کلام معجز نظامش باعتبار آفتاب تخلص در افاضت نور معانی رشک افزای سلطان خاور
و هم ملبین نمط دودمان وزارت نیز در اسلاف این نسبت لازمی خالی نمانده که از نواب
عماد الملک تا خانخانان منعم و نواب اسد خان اسد اسلام خان والا و آصف خان جعفر و
بیرم خان بیرم مهر وزیر روشن تدبیر را بعد فرصت و فراغ از مهام سلطنت تفننًا باین جانب

هم میلان خاطر مانده، و اکتفا باین اسمای معدود، محض بالتزام سلسلهٔ رفیعه وزرای دودمان تیموریه است، دگر وزرای سلاطین صفویه و سلاجقه و دیالمه را در استدلال برشمارم که یک تن ازین نسبت بیرون نتوانست بود۔

بالجمله آن انجمن دلکشا که دریای معنیت، هیچگاه خالی از تذکرهٔ شعر و سخن نیست، و نسبت به نظم فارسی بیشتر نظم ریختهٔ مطبوع و کلام میر و میرزا مرغوب و اعتقادی که بمصنفات استادی و مقتدائی درویش پادشاه منش و بادشاه درویش روش قبلهٔ لفظ و کعبهٔ معانی رب النوع سخن و سخندانی سرخوش انشار اسرار ابدی و ازلی لذت یاب کیفیات علمی و عملی اجلهٔ عرفای منزوی زاویهٔ فقر و فنا مظهر کرامات مصدر انعامات و منبع اساس حقیقت شناس مجسم باشک گرم و آه سرد جناب مستطاب حضرت خواجه میر درد دارند، ورای آن معتقدات است چه آن هر دو بزرگ اگر پیغمبر سخن اند، ذات عرش کمالش خدای سخن بلا اغراق رباعیش ماهیت ارکان اربع سخن را ناطق و مطلع غزلش در شعشعهٔ نور معنی نسبت بعقول ده اذہان عزیزان بر مطلع خورشید فایق، حواس خمسه را دولت پنج گنج از مخمس حاصل، و پنجهٔ حنائی آفتاب مقابل هر بندش در رنگینی شرمسار و منفعل، و در رنگِ تصوف در مایدهٔ کلام شور انگیزش چندان همه جا مانده که جای سررشتهٔ توحید از دست نرفته بلا اغراق هر ایما و اشارت که در فصوص الحکم شیخ ابن عربیست صاحب ذوق و رموز فهم را در ریخته اش حاصل، و مگا از درد معنی دست بردل، و چون راقم حقیر منتسب بتربیت و افاضت همین جناب است، لهذا بیشتر مسئول و مخاطب می باشد و در فصیح و غیر فصیح و تحقیقات جائز و ممنوع جواب معروض می دارد، و باین مشرف همزبانی خویش از کمترین مقربین و مخصوصین می شمارد، و همین است که وقتی از اوقات این بے مقدار حاضر بود، و ذره وار اقتباس انوار فیوضات می نمود که نواب وزیر الممالک آصف دوران بفرط عنایت و التفات بے پایان ارشاد فرمود که آیا آنچه گفته هم دف است یا هنوز آن معانی باریک چون تار زلف مهوشان پریشان داری عرض کردم، بلی همچنین است که قیاس فرمودند، پس بحضرت مرشد زاده استدعا نمودند که میخواهم کلام شوریده این طپش تفسیده را از کثرت

بیاض .... باسم اگر بجہت تردیف ایں را از حضور تاکید شود، منتہای تفضلات است۔ عرض کردن ہماں بود، وارشاد بلب آمدن ہماں، پس سمعاً وطاعتہً بتالیف مسودات پریشان پرداختم و بعد تردیف وترتیب بگلزار مضامینش موسوم ساختم کہ فقرہ گلزار مضامین ہم دیوان را نام است وہم تاریخ اتمام وہوا ہذا :

بحکم صاحب عالم جواں بخت ... ولیعہد خدیو حامی دیں

از ارشاد وزیر اعظم ہند ... وزارت کو ہے جس سے عظم وتمکیں

مرتب از الف تا یا ہوئی جب ... یہ نظم سوزناک و درد آگیں

طپش نے بہر ضبط سال تاریخ ... رکھا نام اس کا گلزار مضامیں

۱۱۹۹ھ

(۲)

وازآنجا کہ ایں نسخہ در زبان اُردو است و زبان اُردو مرکب است بچندیں نحت، وتخلص نیز ہر سخن گو را بعہد خویش بطرز خاص بودہ لہٰذا تشریح ابتدای این زبان وہم چگونگی مستعملات گذشتگان کہ اوایل چہ بودہ و بازدر اواسط و اواخر چہ صورت پیدا نمودہ بنابر معلومات عزیزان علی الترتیب می طرازد، تا کسانی کہ بشرح و بسط آگاہ نبوند، بر آنہا حالی سازد۔

پس باید دانست کہ زبان اردو عبارت از روزمرہ دہلیست داں معمورہ ۱۵۔ نیست عظیم از امصار قدیم بقول بعضی مورخین آباد کردہ راجہ دہلو، کہ معاصر اسکندر رومی گذشتہ ودر سالف ایام دارالحکومت رایان ہند بودہ، وزبانی کہ دراں عہد رواج داشت ہندی الاصل بود، ہرگاہ بمشیت مالک الملوک آنکہ :

یکی را بسر برنہد تاج بخت ... یکی را بخاک اندر آرد ز تخت

سلطان معز الدین سام بر فتوح ہند وغالب آمد وکار رائے پتھورا تمام کرد، ریاست آں دارالملک منتقل بسلاطین غور گردید وبمرور ایام انفاس مبارک اہل اسلام آں زبان را تغیر بخشید، وکم کم الفاظ عربی وفارسی را در کلام ہا ہمگنان اختلاط بہم رسید ومروّج گردید،

۱۔ کرم خوردہ بقدر یک لفظ

چنانکہ امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمہ کہ اواخر عمر متوسّل سلطان تغلق شاہ خلجی بود، وطوطی شکر مقال تاریخ وفات اوست و دراں ایام فرمودہ:

زحالِ مسکیں، مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم ایجاں نلیہو کاہے لگائے چھتیاں
یکایک از دل بچشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
شباں ہجرش دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
چو ذرہ حیراں چو شمع سوزاں بعشق آں ماہ گشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ ہی آوے نہ بھیجے پتیاں

چوں سلطان محمد شاہ بن تغلق شاہ بر سریر فرماندہی نشست و بظلم و ستم جلاوطن سکنۂ آں شہر روا داشتہ ہمہ را بدیوگیر معروف بدولت آباد فرستاد، و بعد مدتی قبل از زوال دولت خود باز برگردانید، بایں نقل و حرکت الفاظ دکھنی ہم در زبان اہل دہلی خلط پیدا کردند- و ایں طرز گفتگو تا اواخر عہد جہانگیری ہمچناں بود، بعد ازیں چوں وارث سریر گورگانی اعلحضرت شاہجہاں صاحب قران ثانی در سال دوازدہم از جلوس میمنت مانوس گل زمینی بر ساحل دریای جون متصل ..... شمال رویہ انتخاب فرمودہ قلعۂ مبارک حادث و شہر را موسوم بہ شاہجہاں آباد گردانید، و ہم بدہلی نو نامید-

آن دہلی قدیم کہ پہلوی اندرپت از آثار قدیمہ مستقر خلافت سلاطین پیشین بود و بعضی مؤرخین دہلی تجمش نوشتہ اند، دیگر معطل افتادہ ملقب بشہر کہنہ و قلعہ کہنہ گردید- و ایں شہر جدید باندک زمانی گلزار نعیم و رشک افزای ہفت اقلیم شد- خوبان ہر شہر و بلاد بدین معمورۂ خجستہ بنیاد روی امید آوردند و ممتازان ہر شہر و دیار متجاوز از حد و شمار جمع آمدند، چنانچہ شاعری درین باب گفتہ:

صد جہاں ویران شد تا یک جہان آباد شد

۲- آب زدہ بقدر دو لفظ

و تاریخ تکمیل و تتمیم عمارات و بساطتش عبارت ۲. شد شاه جہان آباد، از شاہ جہان آباد یافتہ اند۔ ۱۰۵۶ھ

پس با جماع این ہمہ اصناف مردم و اقسام عالم یوماً فیوماً محاورہ آن دیار نسبت بماضیات فرق بیّن پیدا میکرد، و ہندی قدیم متروک می شد، مگر الفاظ دکھنی ہمچنان بودند، و باعث ۲. فقدان آن الفاظ محض تخلیط لسانی بود کہ در آن وقت ہم کاب سلاطین بممالک دکھن آمد و نیز کلام شعرای دکھن کہ سعدی و لطفی و فضلی و خوشنود و احمد و محمود و سالک و ہاشم و اشرف، و جعفر و عزیز اللہ و احسن باشند، بشاہجہان آباد متواتر میرسید۔ و بر السنہ عزیزان باعث رواج میگردید، چنانچہ یک یک دو دوبیت ازین صاحبان چون مشتی از خرداری می نویسد، سعدی دکھنی فرماید:

ہمنا تُمن کو دل دیا تم نے لیا اور دُکھ دیا
تم یہ کیا ہم وہ کیا، یہ ہی جگت کی ریت ہے
دو نین کے کھپرؔ کروں، رو رو نخون دل بھروں
پتیش سگ کویت دھروں، پیا سانہ جاوے میت ہے
سعدی غزل انگیختہ، شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ دُر ریختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

لطفی گوید:-

تجھ عشق کی اگن سے شعلہ ہو جل اٹھا جیو
دل موم کے نمونے گل گل پگھل گیا ہے
جی کا چمن جلا کر، سب جلتے انگارے کر
اکلا کے آگ دینے ٹیسو جنگل گیا ہے
میں عشق کی گلی میں گھائل پڑا تھا تس پر
جوبن کا ماتا آ کر مجھ کو کھندل گیا ہے

۲- بیاض بقدر یک لفظ۔ ۴- آب زدہ بقدر یک لفظ۔

فضلی گوید : رکھا ہوں نیم جان جانان تصدق تجھ پہ کرنے کو
کیا سب تن کو میں درپن اجھوں درسن بنائے ہوں
تیری آنکھاں و زلف سے کافر ہوا سارا جہاں ✤ اسلام اور تقویٰ کہاں زہد اور مسلمانی کدھر

خوشنود راست : سب رین جاگے سیج پر تو بھی سجن (آیا) نہیں
چپ چپ کے دیکھی باٹ میں درسن کو دکھلایا نہیں

احمد راست : بھریا (دو نین کی) چھگلاں صبوری سا تھ لے توشہ
کمر ہمت سے باندھے اور پہ کی باٹ پر نکلے
نین کے ہاتھ لے کھپر بھریا درسن کی بھکھیاں کو
بنائے ایک در پر بھی، بھکھاری در بدر نکلے

محمود راست : محمود تجھ میں پورا دستا ہنر وفا کا ✤ ہے کیا عجب جو بھاوے تو پی کو اس ہنر سے

سالک راست : پھر دل بیہوش ہو کر میں بو ہنہ (یا بدول) ترے ✤ یقین بوجھو تمن پیالے کہ سالک کو لبھاتا ہے

ہاشم راست : دکھن اور ہند کے دلبر ہمن سے بے حجاب اچھے
کہ مکھڑے چاند سے پر جن کے خط کے پیچ و تاب اچھے

اشرف راست : پیا بن میرے تئیں براگ بھایا ہے، جو ہونی ہو سو ہو جاوے
بھبھوت اب جوگیوں کا رنگ لایا ہے، جو ہونی ہو سو ہو جاوے

(جعفر) راست : غمزاں سے دیکھو شوخ مجھے مار کر چلے ✤ مجروح لس بہ راہ کو نثار کر چلے

عزیز اللہ گوید : مجھ نیم جاں میں کیا سکت، بولوں جو ولیاں کی صفت
عاجز عزیز اللہ اوپر دکھن کے سب پیراں مدد

احسن راست : ....۶ آوارہ ہوں ✤ یا بیگ پی آنا کرو یا مجھ کو (ہیں) بلوایئے

(۳)

گرد آوریم بر احوال ولی دکنی این است کہ این مرد سر آمد اقران و امثال خود بودہ است۔

---

۵ - آب زدہ و کرم خوردہ

بلکہ واضع ریختہ ہم اگر بگوییم من وجہ توانیم گفت چہ در تنظیمش غزلیست پیدا ن
و فصاحت نیز نسبت بدیگران فی الجملہ از کلامش ہویدا و دولت و شہرت قبول خاطر ہم درا ن
عہلہ مخصوص نصیب حال او گردیدہ، و ایں چند بیت از وست:-

ولی: غرورِ حسن نے تجھ کو کیا ہے اس قدر سرکش
کہ خاطر میں نہ لاوے تو اگر تجھ گھر ولی آوے

جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا
ہر ذرہ تجھ جھلک سے جوں آفتاب ہوگا
مت جا چمن میں مالن بلبل پہ مت ستم کر
گرمی سے تجھ نگہ کی گل گل گلاب ہوگا

سُن ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق
کوچۂ زلف ہے، یا گوشۂ تنہائی ہے

و او در اواخر عہد اورنگ زیب عالمگیر از اورنگ آباد، بہ شاہجہان آباد آمد،
و شرفِ صحبت حضرت شاہ گلشن صاحب قدس سرہٗ کہ "جای گلشن بہ بہشت ابدی" تاریخ ۱۱۴۳ھ
وفات آن (حضرت) است، دریافت۔ و از کلام خود بطریق حصول میمنت داستفاضت
برخی معروض داشت آنجناب نظر بمناسبت طبعش اختلاط فرمودند کہ ایں ہمہ مضامین فارسی
بیکار افتادہ اند، در ریختہ خود بکار ببری، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔
بالجملہ رواج شعر ہندی در شاہجہان آباد ہم از ان عہد کہ از عالمگیر بود می توان گفت،
چہ بیشتر میلان طبایع بایں طرف از ہمان عہد است، علی کہ مرزا موسوی خان فطرت ہم کہ از
سادات موسوی تم است و باجیہ شاہ نواز خاں صفوی کہ پیوند از دواج در عہد عالمگیر
بخدمت دیوانی تن و ہم دیوانی بلدہ پٹنہ سرفرازی داشت، در ملک دکن بسال ہزار

وصد و یک بہ رحمت حق پیوست - ایں دو بیت بسبیل ندرت تفنناً فرمودہ :

بیت

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانہ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

دیگر

دو چیز ہندمرا برد موسوی در گور ۔۔۔ صدای ہنگری دہیر پا پروں گی پھور

و ہمچنیں جناب مستطاب حضرت مرزا عبد القادر بیدل نیز ایں دو بیت فرمودہ اند:

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

دیگر میر جعفر زٹلی نیز از شعرای آں عہد است کہ ایں مثنوی در حسرت عہد شباب گفتہ :-

نظم

دریغا کہ جوبن چلا دوس کر ۔۔۔ اللّے تللّے کا گھر موس کر
گیا جو بنا پھر کہاں پائیے ۔۔۔ اگر کانو رو دیس بھی جائیے

و میر مذکور اگرچہ سلیقۂ فکر و فارسی ہم درست داشت ، چنانچہ سجع نگیں بادشاہزادہ محمد اعظم شاہ ایں بیت یافتہ :

نگین سلیماں کہ تابندہ بود ۔۔۔ ہمیں اسم اعظم بروکندہ بود

مگر میلان خاطر بیشتر بہ نظم ریختہ داشت ، وآں ہم مشتمل بر ہزل و ہجا مردم چنانچہ ہمان محمد اعظم شاہ ممدوح را ہجو ہم کرد ، وایں بیت از ان جاست :

چہارم پسر ڈومنی کا جنا ۔۔۔ برج میں رہے چوں ۶ میں ۷

بلکہ بادشاہ فرخ سیر را ہم نگذاشتہ کہ در ایام قحط سال ایں بیت بنامش گفتہ :

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر ۔۔۔ بادشاہ تسمہ کش فرخ سیر

۶/۷ - الفاظ نانوشتنی -

دیگر عطا نام او باشیست از عہد عالمگیر و ایں بیت بنام او مشہور:

اے در نبرد حسن تو کٹا پچھاڑ چشم

زیر مژہ نہفتہ چو آہو پچھاڑ چشم

بہر کیف اوائل عہد محمد شاہ فردوس آرامگاہ در سال دویم جلوس میمنت مانوس چوں دیوان ولی از دکن بشاہجہان آباد رسید رواج شعر ہندی از سابق ہم بیشتر گردید۔ و سخنوران آں عہد میاں نجم الدین آبرو و محمد شاکر ناجی و مصطفی خاں یکرنگ و میر سجاد و شرف الدین علیخاں پیام و شرف الدین مضمون و جعفر علی خاں زکی و دیگر چند کس بودہ اند و از زبدگان نیز یک یک دو دو بیت می طرازد میاں نجم الدین آبرو گوید:

گریہ ہے مسکرانا تو کس طرح جئیں گے تم کو تو یہ ہنسی ہے پر یہ ہے مرن ہمارا

جینا مثل حباب اس جگ میں دم کا پیچ ہے یہ گرہ کھل جائے تو دیکھو زندگانی ہیچ ہے

محمد شاکر ناجی گوید:

نمکین حسن دیکھ کر پی کا رنگ گل کا مجھے لگا پھینکا

بیت

تکلیف کھینچے حد سے زیادہ کھے جو فیض گو نام کو ہما ہے پہ کھاوے کیا اپنے ہاڑ

مصطفی خاں یکرنگ گوید:

اتا ہے مست اپنے حسن کی مے سے سجن میرا

کہ کھاتا ہے بیان کرنے ستی لغزش سخن میرا

بیت

دل مرا لے کے جو دلبر ہے میں پڑے ہو اس بھانت

کیا سجن اس کا کوئی جگ میں خریدار نہیں

میر سجاد راست:

لا دتے جو میرے آگے کیا دوا خون دل اپنا پیوں میں یا دوا

بیت

دونوں طرف جو مُنہ پہ ہیں جوں موسی جاریاں | لہریں ہیں میرے شوق کی زلفیں تمہاریاں

شرف الدین علیخاں پیام گوید:

دلّی کے کجکلاہ لڑکوں نے | کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا | ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

شرف الدین مضمون گوید:

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج | ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج

مہ رونے بوجھ پکڑا مشکل ہوا ہے جینا
یارو خدا کرے (؟) بھارکے یہ مہینا

جعفر علیخاں زکی گوید:

قضا کے راج کی صنعت گری دیکھ | نبیؐ کے آل کی بارہ دری دیکھ
نبیؐ کی آل پر مجھ دار جانا | اُسی بارہ پلے سے پار جانا

و بر ہمیں طرز روش است دیگراں راہم کلام مگر افصح ترین و خوب ترین اینہا
شیخ ظہور الدین مشہور بشاہ حاتم است کہ لفظ ظہور خبر از سال ولادت او میدہد و باعتبار
کبر سن تقدم ہم دارد چنانکہ در اہل عجم رودکی را آدم الشعرا گویند ہمچناں ایں بزرگ را
جناب تقی میر بسبیل شوخی مصواۃ الشعرائی فرمایند و بنای ایہام گوی در شعر ہندی
دادہ ہمیں چند بزرگ است کہ آبرو و ناجی و حاتم و عبد الغنی بیگ باشند، و حاتم موصوف
دو دیوان گفتہ یکی بطرز قدیم و دیگری بطرز جدید و دیوان- - - - - -[6] - - - - در گذاشتہ
و چون کثیر التلامیذ واقع شدہ اسمار شاگردان- - - - - -[7]- - - - بر پشت
سر لوح دیوان نگاشتہ وارشد و اکمل- - - - - - - - - - - -[8] نوشتہ و فی نفس الامر
ہم ہست- الغرض بعہد- - - - - - - - -[9] بیش از بیش رواج گرفت کہ اکثر صاحب طبعان
- - - - - - - - -[10]- چنانچہ قزلباش خاں امید مرد ولایت زای - - - - -[11]- - -

مطلع فرمودہ:

۶- آب زدہ تقدیر — جہاز الفاظ ۷- ایضاً ۸- ایضاً ۹- ایضاً ۱۰- ایضاً ۱۱- ایضاً

درو دیوار سے اب صحبت ہے یار بن مجکو عجب صحبت ہے

مگر با این ہمہ لہجہ رتمغل "ذرہ عجب صحبت ہے" ...۱۲ رای آنند رام مخلص وکیل نواب وزیر اعتماد الدولہ کہ شاعر مسلم الثبوت فارسی زبان واز مستفیضان جناب مرزا بیدل بود نیز بتقلید ہمہ گر این مطلع سرانجام نمودہ:

دھوم آونے کی کس کے گلشن اندر پڑی ہے
ہاتھ اب جگے کا پیالہ نرگس لئے کھڑی ہے

غرض اکثر اہل استعداد وارباب فضل وکمال بہ تنظیم شعر ہندی دماغ گرم فرمودند، مگر باایں ہمہ محاورہ قدیم بدستور ہمچنان بود، وحک و اصلاحش بخاطر ہیچ کس نمی نمود، تا آنکہ ہمت عالی حضرت مرزا مظہر جان جاں کہ در سلیقہ طبیعت ولطایف صحبت وحسن مقال ونزاکت خیال ممتاز فصحا ومیتز ہر زشت وزیبا، وبہ نہایت قوت واستعداد کشور سخن را فرمان فرما بود، باین طرف مصروف شد، اوّل کسی کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی مشتمل بر پیوند لفظ مانوس وترکیبات مطبوع گفتہ اوست بعد ازیں آرائش وپیرائش دیگر جزئیات وتہذیبات بایں تعلق سار نازک خیالی وحسن تدقیق جناب مستطاب استادی ومقتدای مرکز بلیغان سرآمد فصیحان حضرت درد وسراج الدین علی خاں آرزو، ومرزا رفیع سودا، ومحمد تقی میر صورت پذیرفت، آری

ع ہزاران نقطہ می باید بغیر از حسن زیبائی

وآنچہ از عالم ممنوع ومتروک کہ درتزئین وتہذیب این زبان بکار بردہ اند مشتمل است بر تصرف چند۔

تصرف اوّل در ترک حروف رابطہ است، چوں از در بر، چوں دریں بیت موسوی خان فطرت: بیت:

از زلفِ سیاہِ تو بدل دھوم پڑی ہی درخانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہی

وچوں دریں بیت:

رات دن ہے بر زباں شکوہ تری بیداد کا
کون شنوا ہے ہمارے نالۂ وفریاد کا

۱۲- آب زدہ بقدر یک لفظ۔

تصرف دوم، در ترک افعال فارسی است، چوں دریں بیت:

نقاب اپنے رخ کا جو تو باز کرتا — تو گل اپنی خوبی پہ کیا ناز کرتا

ظاہر است کہ باز کردن بمعنی کشودن آمدہ، ولہجہ فارسی است، باید در ہندی زبان نقاب کھولنا، یا نقاب منھ پر سے اٹھانا، یا دور کرنا، می گفتی دیگر، چوں درین بیت:

اب دم شمردگی سے مجھے کار و بار ہے — ہر دم مرے حساب میں روز شمار ہے

دمِ شمردگی بمعنی مصدری مستعمل فارسیان است، در ہندی دم گن نے گفتن فصیح۔

دیگر چوں دریں بیت:

خراشیدن دل مضطر کا میری آہ سے پوچھو
نہ پوچھو آہ سے تو نالہ جانکاہ سے پوچھو

ترکیب خراشیدن دریں مصرع چندانکہ دل را امتزاج اشد ظاہر است، حاجت بتصریح معلوم۔

تصرف سیوم، در ترک اسمار فارسی است، کہ بے مضاف و مضاف الیہ آوردنش درست نیست، مثلاً اگر کسے چنیں گوید:

چشم دُکھنے آئی تیرے منتظر کی صبح سے — آنکھیں دکھلا دے اپنے جلوۂ دیدار کو

لامحالہ مخل فصاحت خواہد بود، بہتر است بجای چشم آنکھ گویند، و گر چشم گویند باین طور گویند:

صبح سے ہے آج تیرے منتظر کو درد چشم
آنکھیں دکھلا دے اپنے جلوۂ دیدار کو

قس علیٰ ہذا حال دیگر اسما ہم۔

تصرف چہارم در ترک عطف و اضافت است، عند الترکیب لفظ ہندی بلفظ فارسی و لفظ فارسی بلفظ ہندی، چوں، رنگ پھول و پھول خوش رنگ و تیر و تلوار، و تلوار و تیر۔

تصرف پنجم، در جواز ضمائر مشترکہ برای بعضی اسمار کہ ضمیرش ہم بتذکیر و ہم بتانیث ہر دو مستعمل شدہ، چون فکر و قلم، و پیش قبض و ہی وغیرہ۔

تصرف ششم در انداختن بعضی حروف از بعضی الفاظ چون کی مع التا، فوقانی کہ بمعنی سے مستعمل بود چنانکہ دریں بیت یک رنگ:

جب سی گلرخاں سے یار ہوا   خلق کی میں نظر میں خار ہوا

تا را انداختہ فقط سے بہماں معنی اعتبار کردند، دیگر، از ایدھر و اودھر، جیدھر وتیدھر
یای معروف و واو معروف انداختہ، ادھر وادھر، جدھر و تدھر ہم براں معنی جائز داشتند،
چنانچہ حضرت درد راست:

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا   تُوہی آیا نظر، جدھر دیکھا

دیگر، پَر، کہ بمعنی لاکن است، حذف رای مہملہ بضرورت وزن از وجائز داشتند،
چنانچہ سودا فرماید، مصرع:

دی تھی خدا نے آنکھ، پہ ناسور ہو گیا

یعنی خدا نے آنکھ تو دی تھی، پر ناسور ہو گیا۔

دیگر، لفظ اُوپر بمعنی علیٰ کہ اشعار قدما مملوست از ین چون درین ابیات ناجی گوید:-

روا ہے کب، مجھ اوپر تیغ کو ہردم علم کرنا

دیگر رنگ نیز گوید، ع

برگِ حنا اوپر لکھو احوال دل میرا

اُو را ساقط کردہ، پَر، بہماں معنی پسندیدند۔

دیگر، واوی کہ در جیونا، و پیونا، و آونا و جاونا مستعمل بود، ثقیل یافتہ دور
کردند و فقط جینا و پینا آنا و جانا کافی دانستند۔

دیگر، گا، گی، کہ در ہیگا و ہیگی بصیغہ واحد مذکر و واحد مونث، و گے بہ یای
مجہول در ہینگے، بصیغہ جمع استعمال میکردند، از ہر سہ جا کاستہ فقط، ہے در واحد مذکر
و مؤنث، و ہیں در جمع بہمان معنی اعتبار نمودند۔

دیگر، از لفظِ پھیر کہ بہای ہندی و یای مجہول، و سکون رای مہملہ، و معنی
گردانیدن را امر است، و ہم بمعنی باز، چنانکہ درین بیت:

راہ بنڈے میں جو لیتا ہوں اُسے گھیر کبھی
ہنس کے کہتا ہے کہ اب کام ہے چل پھیر کبھی

یا آ را انداختند و پھر را فصیح اعتبار کردند، چوں دریں بیت :

پھر اندھیری غم کی راتیں آئیاں　　پھر وہی ہم ہیں، وہی تنہائیاں

تصرف ہفتم، در فزودن حرف، اِتنا و اِتیا، بکسر ہمزہ کہ بمعنی ایں قدر مستعمل بود،
آں را نون بین التاء و الف در آوردہ، اَنتا، کردند، بمعنی تیں، کہ حاضر را می گفتند،
چنانکہ دریں بیت محمد حسین کلیم آمدہ،

میں کہتا تھا ساقی ایاغ اب کہاں ہے　　پنٹ دیر کی تیں دماغ اب کہاں ہے

ہم موقوف، و بجای آں، تو و تو نے مستعمل کردند۔

تصرف ہشتم، در تبدیل حرفی بحرفی، چوں باتاں و راتاں و آنکھاں و بھوآں ازیں
الف و نون جمع الف را بیای مجہول بدل کردند، راتیں و باتیں، آنکھیں و بھویں،
مستعمل نمودند۔

دیگر، سین، بیای مجہول، و سوں، بواو مجہول ہر دو بنون غنہ کہ بمعنی سے بود،
و تجھ سوں، و مجھ سوں، و تجھ سیں، و مجھ سیں می گفتند، واو و نون، ایں را انداختہ،
فقط بیای مجہول داشتند، یعنی تجھ سے و مجھ سے۔

دیگر، ہای دیوانہ و فرزانہ و مستانہ و پیمانہ، را در جای کہ در ہمہ قوافی غزل
آنا و جانا و امثال آں باشد، بالف بدل شدن جائز داشتند۔

دیگر، یای کبھی را بواو معروف در جای کہ قوافی گلو، و سبو و امثال آں باشد بدل کردند۔

دیگر، یای کہیں، را ہم برہماں قاعدہ بواو کہوں بدل نمودند، یعنی قافیہ جنوں
و زبوں نمودند، چوں دریں بیت :

جب کہا میں کام میرا بھی کہیں ہو جائے گا
سنتے ہی ہنس کر کہا ہے اس نے ہوں، ہو جائے گا

دیگر، بای جیب و تیب و کیب را در حالت قافیہ بدال مہملہ بدل کردند، چوں
دریں بیت :

ناحق ستم کسی پر وہ شوخ گر کرے ہے　　دیتا ہے ٹانگ اس کو جو فعل بد کرے ہے

ونیز دریں بیت:

لخت جگر سے خالی مژگاں یہ کدر ہیں ہیں
یہ چھوٹے چھوٹے پودے پھولوں میں کدر ہیں ہیں

دیگر، چوں لفظ فارسی کہ از ادات تشبیہ است وقد با در ہندی ہمچنیں تلفظ میکردند آں را بجیم تازی و واؤ مجہول بدل کردند، و نون غنہ بدستور گذاشتند۔

دیگر، مکھ کہ فارسیش رو و چہرہ آمدہ بجای آں منہ گفتند۔

تصرف نہم در موقوفات سوں، بواؤ معروف و نون غنہ کہ بمعنی قسم می گفتند، یعنی مجھے تیرے سر کی سوں، اور تجھے میرے سر کی سوں، وفقیہ صاحب درد مند در ساقی نامہ نیز ہمچنیں گفتہ:

تجھے عید کی شب کے چاؤں کی سوں تجھے اپنے مہدی کے پاؤں کی سوں

این را بالمرہ ترک کردند و بدین معنی ہمان لفظ قسم وسوگند جایز داشتند۔

تصرف دہم، در ترک الفاظ ہندی الاصل کہ قوۃ ہندی باشد، چوں لالن، پیتم، درس، پاتی، دوتی، نس، رین، بھور، سانجھ، بھیتر، باجھ، من، تنگ، پیت، بیت، برہ، اگن، سجن واشال آں، واین کہ ازیں الفاظ ممنوعہ خود در کلام این بزرگان شاذ ونادر نظر می آید، انصاف داند کہ خاص برای اینہا است، ودریافت لطف بندش آں موقوف سلیقہ طبیعت است، وحوالہ بوجدان، کہ محض شاعر قادر سخن وکامل این فن بکیفیت آں نرسد من فہم فہم:

عارف دانست آنچہ عارف دانست ملا فہمید آنچہ ملا فہمید

بریں تقدیر استعمال نمودن این بزرگان نہ از عالم اجازت است، نسبت بعموم موزون طبعان تا ہر نومشق بتقلید اینہا کار کند، اِلّا دقتی، کہ ذوق کامل وتمیز دانی وقدرت کلی در تنظیم حاصل کند ولطف وقوع نکتہ بر محل ومصرف خاص) از عالم بلاغت دریافتن تواند سلیقہ بندش وصفای تالیف وچستی ترکیب ودرستی وصل وپیوند بہم ساند، ازیں جاست کہ یکی از شعرای سست نظم بخدمت حضرت مرزا بیدل بیتی چند از مثنوی خود عرض کرد چوں

بایں بیت رسید :

بیا ساقی کہ چشم بیقرارت　　　　چو گل خون شد ز زخم انتظارت

آنحضرت فرمود کہ اضافت چشم بیقرارت از عالم صفت موصوف معلوم می شود، یعنی چشم تو کہ بیقرار است، و بیان آنکہ ارادۂ شاعر اضافت بیانی است، یعنی چشم عاشق تو کہ خود را باسم بیقرار بر آوردہ، پس شاعر را باید کہ ازیں چنین گفتگو احتراز نماید، کہ ارادہ چیزی باشد و چیزی دیگر از زبان بر آید، آں عزیز مطابق عندیہ خود چنانکہ مفہومش بود، گفت زلالی از ہمیں قبیل بستہ است۔ میرزا فرمود، شما زلالی را موقوف دارید از خود حرف زنید، و لطف این نکتہ بہ اساتذہ معلوم۔

وجہ تسمیہ شعر ہندی بلفظ ریختہ : ریختہ در روزمرّہ معمار و بنّاء عبارت از مصالح است کہ بنا بر استحکام سقف و دیوار اجزای چند باہم مخلوط کنند۔ پس بدیں نسبت وجہ تسمیہ در نظم ایں زبان ترکیب الفاظ عربی و فارسی و ترکی و ہندی ناگزیر آمد و از حق بجاید گذشت ترکیب ہم ترکیب خوشیست، چوں عطر مجموعہ کہ نسبت بعطر مفرد مطبوع تر آید و لہٰذا ترک ہیچ کدام قسمی از اقسام الفاظش جایز نداشتند، حتّی کہ بعضی لفظ ہندی الاصل را ہم آنکہ بکثرت استعمال مرغوب سامعہ باشد، آوردن مضایقہ ندانستند، چہ دریں صورت جزوی از اجزا امی کاست، و در ترکیب نقص راہ می یافت، اِلّا الفاظ دکن یکقلم متروک کردند، زیرا کہ ثقالت آں ہر آیینہ تخریب فصاحت کرد۔ حالا آمدیم بر بیان وجہ تسمیہ اُردو کہ خاص بایں لفظ چرا نامیدند۔ پس مخفی نماند کہ اُردو بر زبان فارس بمعنی لشکر یست کہ چادر شاہی درو باشد۔ چوں ایں زبان مستعمل حضوریان و استادگان پای تخت بادشاہی افتاد لہٰذا نسبت باں دولت سرای عالی گردیدہ مسمی باسم اُردو کردند، و ازیں جاست کہ صاحب دستور شگرف جای کہ توضیح اقسام زبان فارسی نمودہ است در تعریف زبان دری آوردہ کہ در زبانی کہ مردم درگاہ سلاطین کیان متکلم می شدند، آں را دری گویند، اعنی منسوب بہ در دولتِ سلطان، پس ہمچنیں است خصوصیت لفظ اُردو در تسمیہ ایں زبان ہم دیگر، آنچہ در تصرفات عشرہ مذکور شدہ از عالم اصول است و ہنوز چندیں فروع

باقی، چون زیاده برین کلام تطویل می یافت لهٰذا بهمان قدر اکتفا رفت العاقل تکفیه الاشاره

بالجمله سلسلهٔ سخن بس دراز است و انواع احتیاط لازم سخن طراز حقیقت شناس داند کہ ربط الفاظ بچه قدر خون دل میسر گردد، نظم سلسلهٔ معانی بچه مرتبه جگر کاوی دست بهم دهد، لهٰذا گفته اند:

سخن بس دقیق است و معنی بلند
مگر پی برد عارفِ هوش مند

علاوه نفس قدسی باید تا باین عطیهٔ مخصوص شود و مناسب بعالم علوی بود که بدین موهبت امتیاز یابد، نکته سنجان گداخته نفس سخن مربوط را بپایهٔ تصرف و کرامت برابر گرفته اند، و کلام لطیف و موزون را بمرتبهٔ الهام بر شمرده و ازین جاست که بزرگی فرموده که مرا از دنیا دو چیز خوش آمده، سخن دل پذیر، و دل سخن پذیر، و لنعم ما قیل:

عالم بالا ابر معنی پسند (کذا)
نیست بغیر از سخنان بلند

سینه بکن تا گهر آری بدست
بهتر از آن خوی که در سینه هست

امّا، حیف که من مضیع الاوراق از مبادی عشق این فن تا غایت مدتها قلم بخون جگر بر کوبیده ام و چاک سینه با شگاف خامه برابر نموده، مع هٰذا هنوز روز اوّل، و می دانم که آنچه باین بی بضاعت کرامت شده نمیست ازیم و قطره ایست از محیط اعظم! امّا بحصول این قدر موهبت هم جناب مفیض و هاب را نیایش گر و سپاس گذارم، بو که بحکم و لئن شکرتم لازیدنّکم، باز دیاد این نعمات نوازند، و دولتِ قبول خاطر کرامت سازند۔

پس از دیده وران بخلاف چشم آنست که هر جا حرف بلند و نکته دیوان پسند درین دیوان از فیضان حضرت منّان مطالعه نمایند، بانصاف و الطاف نعرهٔ تحسین بر آرند و زبان آفرین بر کشایند، و جای که از مقام مذلت الاقدام سخن لغزش پای ببینند، بدستگیری اصلاح اقدام نمایند، و بمراعات طریقهٔ لطف و کرم فرا پیش آیند که، ع

عیب پوشی به از عمد پوشی است

عبد الرشيد، القسم العربي بكلية بتنه

طبقات الحنفية ومؤلفوها

الفقه الاسلامي نشأ في صدر الاسلام ونبغ كثير من الصحابة والتابعين في اجتهاد الأحكام الشرعية واستنباط المسائل الدينية في سائر الأمصار والبلاد الاسلامية كعبد الله بن عمر المتوفى سنة ۷۳ھ في المدينة وعبد الله بن عباس المتوفى سنة ۶۸ھ في مكه ومحمد بن سيرين (۳۳-۱۱۰ھ) في البصرة وسعيد بن جبير (۴۵-۹۵) في الكوفة وكذلك في بلاد أخرى، لكن لم تشتهر مذاهبهم بين الناس كمذاهب الأئمة الأربعة، جاؤا بعدهم، لوجوه مختلفة

(۱) الأول ان آراء هذه الجماعة ومذاهبهم لم تكن مدونة۔

(۲) الثاني اذ كان عصرهم غير بعيد عن عصر النبي صلى الله عليه وسلم فكان اكثرهم أئمة في معرفة الحديث والقرآن فلكثرة الائمة المجتهدين في أيامهم لم يجد واجماعة من التلاميذ والأشياع لنشر مذاهبهم في البلاد۔

(۳) الثالث لم تساعدهم الشئون السياسية۔

ثم جاء العصر العباسي فانتهى الفقه كسائر العلوم فكان تحريره

وتد ونیه ونضجه فی هذا العصر وانتشر الفقه فی بلاد العراق و صار الفقهاء والمجتهدون یجتهدون فی الأحکام ویستنبطون المسائل فی ضوء القرآن والحدیث وفق معرفتهم بهما - ففقهاء الحجاز لکانتهم فی الروایة تمسکوا بالقرآن والسنة ولم یرجعوا الی القیاس حینما وجدوا خبرًا او أثرًا وزعیمهم مالک بن أنس (۹۵ - ۱۷۹) امام دار الهجرة، وفقهاء العراق لکونهم أشداء فی قبول الروایة لصحتها وسقمها رجعوا الی القیاس - وامامهم الامام الاعظم ابوحنیفة النعمان الکوفی (۸۰-۱۵۰ھ) ثم جاء الامام الشافعی (۱۵۰- ۲۰۴) والامام احمد بن حنبل (۱۶۴-۲۴۱) وانفرد کل منهما بمذهب آخر- وهکذا افترق الفقهاء والمجتهدون فی مذاهب مختلفة وأشهرها هذه المذاهب الاربعة المشهورة بین الناس-

ثم قام تلامیذهم ومتبعوهم وجمعوا تراجمهم واقوالهم فی الکتب، فمنها ما عالج ترجمة امام واحد ومنها ما عالج تراجم الأئمة الأربعة، وبعد ذالک أخذوا ان یدونوا تراجم الفقهاء والمجتهدین وفق مذاهبهم وسموا تالیفاتهم بطبقات الفقهاء او تاریخ الفقهاء اومثلهما کما دونت الطبقات فی العلوم الأخرى کطبقات الادباء وطبقات المحدثین وطبقات القراء وغیرها - فالمالکیة دونوا الطبقات المالکیة والحنفیة دونوا الطبقات الحنفیة وکذالک فعل الشوافع والحنابلة -

والآن أرید ان أذکر الکتب التی تعالج تراجم الفقهاء الحنفیة و قد بحثت عنها فی المکتب المختلفة ووجدتها عددا کبیرًا، لکن الأسف أنها قد ضاعت أکثرها ولا توجد نسخة واحدة لأکثرها فی دار الکتب الشرقیة والغربیة، ولا أجد لها أثرا غیر أسمائها بل منها ما طویت اسمائها فی طی الأیام ومنها ما طویت اسماء مؤلفیها فی طی الزمان کما سأبینها فالکتب التی عثرت علیها أبینها تحت أسماء مؤلفیها وفق السنین دون نحو المعجم

الاعديدة منها فأبينهما فى الآخر وفق حروف المعجم لاننى لم أقف على اسماء مؤلفيهم الى الآن بعد جهد بليغ -

(١) عبد الملك بن ابراهيم بن احمد الهمدانى المتوفى قرب خمس مائة[1]

له "طبقات الحنفية" كما قال صاحب الفوائد البهية فى ترجمته وفى ترجمة شيخه ابراهيم بن محمد الدهستانى المتوفى سنة ٥٠٣ﻫ - أن عبد الملك بن ابراهيم الهمدانى صاحب طبقات الحنفية والشافعية" وفى الأثمار الجنية والجواهر المضية ان" ولده محمد المتوفى سنة ٥٢١ﻫ صاحب الطبقات طبقات الحنفية والشافعية" - وقد ذكراه فى ترجمة ابيه - ولم أجد ذكر طبقات الحنفية من تاليفاته فى كتب أخرى وفى الاعلام (١٢٧/٧) وكشف الظنون (١١٠٥/٢) وهدية العارفين (٨٥/٢) وطبقات السبكى (٨٠/٤) مايفيد أن من كتبه "طبقات الفقهاء" وأظن أنها طبقات الشافعية، لأنه كان شافعيًا، ولذلك ترجم له السبكى فى طبقاته وحين ذكر هذا الكتاب لم يشر الى أن هذا فى طبقات الفقهاء الحنفية، فالظاهر أن والده عبد الملك هو الذى ألف كتابين فى طبقات الحنفية وطبقات الشافعية، وعلى الأقل له كتاب فى طبقات الحنفية -

(٢) ابراهيم بن على بن عبد الواحد بن عبد المنعم الطرسوسى، نجم الدين صاحب "الفتاوى الطرسوسية" (٧٢١-٧٥٨)[2] -

له "وفيات الأعيان فى مذهب النعمان"

(كشف الظنون ٢/٢٠٩٨، هدية العارفين ١/١٦)

(١) راجع ترجمته فى الجواهر المضية ١/٣٣٠، الفوائد البهية ٤٧ و١١ فى ترجمة شيخه ابراهيم - والاثمار الجنية، ١٣٧ (الف) (خطية مكتبة خدابخش)

(٢) الدرر الكامنة ١/٤٣ - الأعلام ١/٤٦ - الجواهر المضية ١/٨١ وفيه اسمه: أحمد بن على وقال صاحب الفوائد: والاول أصح -

(٣) عبد الله بن محمد بن ابراهيم بن غنائم الصالحي، الحنفي، صلاح الدين المتوفى سنة ٧٦٩ھ[١] من كتبه "طبقات الحنفية" - (هدية العارفين ١/٤٦٦، الكشف ٢/١٠٩٨) -

(٤) مسعود بن شيبة بن الحسين، الامام عماد الدين السندي الملقب شيخ الاسلام[٢] له مصنف في تراجم الحنفية - قال صاحب الجواهر: "له كتاب التعليم وطبقات اصحابنا" وفي كشف الظنون (٢/١٠٩٨): قال ابن الشحنة - سياتي ذكره - في هوامش الجواهر: و"جمع طبقات اصحابنا الامام مسعود بن شيبة، عماد الدين السندي، أقول: وغالبه رجال الشقائق وأذيالها الى زماننا هذا على مذهب الحنفية" -

(٥) عبد القادر بن محمد القرشي، المصري، الحنفي محي الدين، ابو محمد بن ابي الوفاء (٦٩٦ - ٧٧٥)[٣] -

له "الجواهر المضية في طبقات الحنفية" قال القرشي في خطبة الكتاب: "ولم أر أحدا اتتبع طبقات أصحابنا وهم أمم لا يحصون" فجمعها بامداد الشيخ قطب الدين عبد الكريم الحلبي وابي العلاء البخاري وابي الحسن السبكي وابي الحسن الماردينى، فصار شيئا كثيرا من التراجم والفوائد الفقهية" وتحريره هذا يفيد أنه اول من صنف في طبقات الحنفية وهكذا قال صاحب الأعلام وصاحب الكشف - والصحيح أن الطبقات ألفها قبله غير واحد - والقرشي هذا قد نص في ترجمة مسعود بن شيبة أن له "كتاب التعليم" و"طبقات اصحاب الحنفية" - وقد استفاد من كتاب التعليم في

---

(١) هدية العارفين ١/ ٤٦٦

(٢) لم أعثر على مولده ووفاته والظاهر أنه توفي قبل صاحب الجواهر لأن له ترجمة في كتابه الجواهر المضية ٢/ ١٦٩

(٣) راجع ترجمته في الأعلام ٤/١٦٨، هدية العارفين ١/٥٩٦، الدرر الكامنة ٢/ ٣٩٦

خطبة الجواهر المضية -

نسخة منها محفوظة بمكتبة خدابخش تحت الرقم ٢٤٤٨-٢٤٤٩ (الفهرس الانجليزي لمكتبة خدابخش ١٢/٩٤) -

ونسخة بمكتبة برلن تحت الرقم ١٠٠٢٠ (فهرس مكتبة برلن ٩/٤٣٧)

ونسخة بمكتبة ايشياتك سوسائتي (فهرس المكتبة: ٤٥)

ونسختان بالمكتبة الخديوية (فهرس المكتبة الخديوية ٥/٤٢)

طبعت من دائرة المعارف العثمانية بحيدرآباد سنة ١٣٣٢ﻫ

(٦) ابراهيم بن محمد بن أيدمر العلائي، القاهري، الحنفي، الشهير بابن دُقماق، الشيخ صارم الدين المتوفى سنة ٨٠٩[1] -

له "نظم الجمان في طبقات أصحاب إمامنا النعمان"

كشف الظنون ٢/١٠٤٨ وفيه: وقفت على المجلد الاول والثالث منه بخطه سماه "نظم الجمان" وفي هامش نظم الجمان بخط بعض العلماء ان الشيخ مجد الدين ـــ سياتي ذكره - إختصر طبقات الحافظ عبد القادر، فهو مختصر لا مبتكر، لكن زاد عليه قليلا - وابن الدقماق لم يزد على ذلك الا قليلا جدًا - وأخبرني عبد الكريم بن قطب الدين قاضي العسكر أن عنده نسختين منها، فامتحن ابن دُقماق بسبب هذه الطبقات، لأنه وجد فيها خط شنيع على الامام الشافعي، فطولب بالجواب عن ذالك في مجلس القاضي، فذكر أنه نقل من كتاب عند اولاد الطرابلسي، فعزره القاضي جلال الدين بالحبس والضرب. وذكره صاحب الكشف مرة أخرى (٢/١٩٦١) فقال: نظم الجمان في ثلاث مجلدات، أوله: الحمد لله الذي رفع طبقات العلماء الاعلام الخ، المجلد الاول في مناقب أبي حنيفة والثاني والثالث في أصحابه -

---

(١) هدية العارفين ١/١٨، الضوء اللامع ١/١٤٥ - الأعلام ١/٦١

نسخة منه محفوظة بمكتبة برلين تحت الرقم ١٠٠٢٢ (فهرس مكتبة برلين ٩/٤٣٧)-

ونسخة أخرى محفوظة بمكتبة البارنيس تحت الرقم ٢٠٩٦ (فهرس مكتبة البادنس ١/٣٧٢)

(٧) محمد بن يعقوب بن محمد بن ابراهيم بن عمر الفيروزآبادى، الشيرازى، الشافعى الشيخ مجد الدين، ابو طاهر المتوفى سنة ٨١٧[١]-

"له المرقاة الوفية فى طبقات الحنيفة"

(الأعلام ٨/١٩، هدية العارفين ٢/١٨٠، كشف الظنون ٢/١٠٩٨)-

وله كتاب آخر فى تراجم الحنفية وهى "الألطاف الخفية فى أشراف الحنفية" (الهدية ٢/١٨١، كشف الظنون ١/١٤٩، ذكرها مرتب الفهرس لمكتبة برلين (٩/٤٤٣) لكنه لم يذكر اسم المؤلف)

(٨) محمود بن احمد بن موسى بن أحمد العينى، القاضى بدر الدين، ابو محمد، المتوفى سنة ٨٥٥[٢]-

له "طبقات الحنفية" (مفتاح السعادة ١/٢١٦، الضوء اللامع ١٠/١٣١)-

(٩) قاسم بن قطلوبغا بن عبد الله الحنفى، الشيخ زين الدين، ابو العدل (٨٠٢-٨٧٩)[٣] له "تاج التراجم فى طبقات الحنفية"-

---

(١) راجع ترجمته فى شذرات الذهب ٧/١٢٦- البدر الطالع ٢/٢٨٠، الضوء اللامع ١٠/٧٩ مفتاح السعادة ١/١٠٣- هدية العارفين ٢/١٨٠-١٨١- وفيها: له المرقات الوفية فى طبقات الحنفية والمرقات الأرفعية فى طبقات الشافعية، والألطاف الخفية فى أشراف الحنفية-

(٢) الشذرات ٧/٢٨٦ - الجواهر المضية ٢/١٦٥ - الضوء اللامع ١٠/١٣١- الأعلام ٨/٣٨، مفتاح السعادة ١/٢١٦

(٣) الأعلام ٦/١٤- البدر الطالع ٢/٤٥- الضوء اللامع ٦/١٨٤-

وفي الكشف (٢٦٩/١) وهو مختصر جمعه من تذكرة شيخه التقي المقريزي ومن الجواهر المضية مقتصراً على ذكر من له تصنيف، وهم ثلاث مائة وثلاثون ترجمة -

نسخة منه محفوظة بمكتبة برلن تحت الرقم ١٠٠٢٣ (فهرس مكتبة برلن ٤٣٨/٩) ونسخة أخرى بمكتبة وِيَن تحت الرقم ١١٧٤ (فهرس مكتبة وِيَن ٣٣٩/١) طبع من ليبسيك سنة ١٢٨٨ - ومعه ملحوظات الماني وفهرستا أسماء الرجال للخواجة جوستاف فليجل -

(١٠) محمد بن محمود بن خليل القونوي، شمس الدين، المعروف بابن أجا، المتوفى سنة ٨٨١ -[1]

له "طبقات الحنفية" في ثلاث مجلدات -

(الاعلام ٣٠٩/٧، كشف الظنون ١٠٩٨/٢)

(١١) محمد بن محمد بن محمد بن محمود الحنفي، الحلبي، القاضي محب الدين أبو الفضل، المعروف بابن الشحنة (٨٣٠-٨٩٠)[2]

له "طبقات الحنفية" (ايضاح المكنون ٧٨/٢، الأعلام ٢٧٩/٧)

(١٢) احمد بن سليمان بن كمال باشا، شمس الدين، المتوفى سنة ٩٤٠[3]

له "طبقات الفقهاء" وهي مرتبة على سبع طبقات (الاعلام ١٣٠/١) -

نسخة منها محفوظة بمكتبة برلن تحت الرقم ٩٩٩٤ (فهرس برلن ٤٢٣/٩)

وله ايضاً "طبقات المجتهدين" (الأعلام ١٣٠/١، كشف الظنون ١١٠٦/٢)

نسخة منها محفوظة بمكتبة برلن تحت الرقم ١٠٠٣٥ فهرس برلن ٤٣٩/٩)

---

(١) الاعلام ٣٠٩/٧ - الضوء اللامع ٤٣/١٠

(٢) راجع ترجمته في الاعلام ٢٧٩/٧، ايضاح المكنون ٧٨/٢ - شذرات الذهب ٣٤٩/٧ الضوء اللامع ٢٩٥/٩، البدر الطالع ٢٦٣/٢

(٣) الفوائد البهية: ٢١ - الأعلام ١٣٠/١، هدية العارفين ١٤١/١ -

(١٣) محمد بن علی بن احمد بن طولون الدمشقی، الصالحی، الحنفی، شمس الدین-
(٨٨٠-٩٥٣)[١]-

له "الغرف العلية فی تراجم متأخری الحنفية"
(الأعلام ١٨٤/٧، کشف الظنون ١٠٩٨/٢)-

المجلد الثانی والثالث منها محفوظان بمکتبة المتحف البريطانی تحت الرقم ٦٤٥ (فهرس المتحف البريطانی ٤٣٤/١)-

(١٤) ابراهیم بن محمد بن ابراهیم الحلبی، الحنفی، المتوفی سنة ٩٥٦[٢]-
له تصنيف فی طبقات الحنفية-(الکشف ١٠٩٨/٢) فهرس مکتبه برلن الرقم ١٠٠٣١)-

(١٥) محمد بن أمر الله بن آق شمس الدین الرومی، المتوفی سنة ٩٥٩[٣]-
له کتاب فی تراجم الحنفية سماه "طبقات الحنفية"
(ایضاح المکنون ٢٤٤/٢، کشف الظنون ١٠٩٨/٢)-

(١٦) علی بن أمر الله بن عبد القادر الرومی، المعروف بابن الحنائی،
(٩١٦-٩٧٩)[٤]-

له تالیف فی تراجم الحنفية-قد أشار إليه مرتب الفهرس لمکتبة برلن (٤٤٣/٩)، لکنه لم یذکر إسم الکتاب و قال فی إسمه: علی بن أمر الله قنالی زاده/ [والصحيح حنّائی زاده، راجع فهرس مکتبة وِيَن ٣٥٢/٢)، وفی کشف الظنون (١٠٩٨/٢): "جمع المولی علی بن أمر الله ابن الحنائی مختصراً علی إحدی وعشرين

---

(١) الهدية ٢٠٢/١؛ الشذرات ٢٩٨/٨-الفلك المشحون ترجمة لنفسه بقلمه-کشف الظنون ٢/١٠٩٨، ١٢٠٢، وفيه إسمه: اسحاق بن حسن وما أثبتنا فی المتن فهو من الاعلام ١٨٤/٧-
(٢) کشف الظنون ١٨١٤/٢، الاعلام ٦٤/١، وفيه: له "مختصر طبقات الحنابلة"
(٣) هدية العارفين ٢٤٤/٢
(٤) هدية العارفين ٧٤٨/١

طبقة، كتب فيه المشاهير، بدأ بالإمام الاعظم وختم باحمد بن سليمان بن كمال باشاه أوله: الحمد لله رب العلمين".

فهذه العبارة تشير الى أربعة أمور:-

(١) الأول أن الكتاب يبتدئ "بالحمد لله رب العلمين"

(٢) الثاني أن الكتاب مختصر جداً، ويحتوي على تراجم المشاهير فقط.

(٣) أن الترجمة الأولى هي ترجمة الامام أبي حنيفة والترجمة الأخيرة هي ترجمة احمد بن كمال باشا، المتوفى سنة ٩٤٠-

(٤) الرابع أن الكتاب مرتب على إحدى وعشرين طبقة.

فالأمور الاربعة هي المعالم التي تنكشف بها الغطاء عن مخطوطات كثيرة ياتي ذكرها.

نسخة منه محفوظة بمكتبة وِيّن تحت الرقم ١١٨٦ (فهرس مكتبة وِيّن ٢/٣٥٢) وفيه عنوان الكتاب: "مختصر في ذكر طبقات الحنفية" والظاهر أن اسم المؤلف غير مذكور في الكتاب ولكن مرتب الفهرس قال: أنه لابن الحنائي، ثم ذكر أن اوله: الحمد لله رب العلمين والصلوة على سيدنا محمد واله الخ فهذا كتاب مختصر في ذكر طبقات الحنفية، ذكرتُ فيه المشاهير من الأئمة الذين نقلوا على [علم] الشريعة من كل طبقة ونشروها [نشروها] بين الأمة مع سلسلتهم على طبقاتهم وأحوالهم على درجاتهم الاقدم فالأقدم على الترتيب البليغ والنظام الأحكم.

ثم ذكر شعراً بعد سطور:-

محمد ونعمان ومالك وأحمد
وسفيان وأذكر بعد داود تابعاً

وبعد ذلك صرح المرتب ان الترجمة الاولى تبتدئ بالامام ابي حنيفة والترجمة الأخيرة هي ترجمة احمد بن كمال باشا المتوفى سنة ٩٤٠-

فهذا الكتاب لابن الحنائي بلا شك، لأنه جامع للأمور التى بينها صاحب كشف الظنون إلا الرابع، بل هو حافل له ايضا كما يظهر لك بالنسخ الآتية -

نسخة أخرى منه محفوظة بمكتبة خدا بخش تحت الرقم ٢٤٥٣ -

وإسم الكتاب على صفحتى العنوان كذا: "طبقات الحنفية" لطاشكبرى زاده" (المتوفى سنة ٩٦٢) - وأظن أن هذا الإنتساب غير صحيح لوجوه مختلفة -

(١) اولا لم أجد ذكر هذا الكتاب فى تاليفات طاشكبرى زاده -

(٢) ثانياً أن العبارة المنقولة من نسخة دِيّن توافق عبارة هذه النسخة من كل وجه -

(٣) ثالثاً أن هذه النسخة مرتبة على احدى وعشرين طبقة وهى مختصرة جداً فعدد أوراقها ٥٢، وتحتوى على تراجم المشاهير فقط - وعدا ذلك أنها تبتدى بترجمة الامام ابى حنيفة وتختم بترجمة احمد بن كمال باشا المتوفى سنة ٩٤٠ -

فقد ظهر من هذا البيان ان النسخة المتقدمة وهذه النسخة كليتهما حافلتان للامور الأربعة -

وقد وافق رأئ مرتب الفهرس الانجليزى لمكتبة خدا بخش (١٢/٩٦) - حيث قال: أن هذا الكتاب ليس لطاشكبرى زادة - لأنه لم يجد ذكره فى مصنفاته - لكنه ظن أن الكتاب لعبد الله السويدى المتوفى سنة ٩٥٠ - والعنوان الصحيح "طبقات السادة الحنفية" لأنه وجد نسخة أخرى منه بعينها فى مكتبة برلن تحت الرقم ١٠٠٢٦ (فهرس مكتبة برلن ٤٣٩/٩) ومؤلفها عبد الله السويدى (م ٩٥٠) - وعنوانها "طبقات السادة الحنفية" -

والصحيح ان النسختين لكتاب واحد كما هو ظاهر بعبارة الخطبة لكل واحدة منهما وقد ذكر مرتب الفهرس لمكتبة برلن ايضاً أن نسخته مرتبة على إثنتى وعشرين طبقة وكل طبقة منها تبتدى بالعبارة "ثم انتقل العلم الى طبقة فلان

واوّل التراجم للامام الاعظم واخرها لاحمد بن كمال باشا — والكتاب لابن الحنّائى لوجوه التى بينتُها فى السابق، لا لعبد الله السويدى، ولا أعرف من هذا السويدى، ولم أعثر على ترجمته وان بذلت جهدى -

وأما مايستفاد بقول مرتب الفهرس الانجليزى لمكتبة خدابخش ان الكتاب مرتب على سبع طبقات فهو غلط فاحش، لأن هذا مما لايعين المولّف بكلامه: فاعلم أن الفقهاء على سبعة طباق، الطبقة الأولى طبقة المجتهدين فى الشرع الخ، بل أراد به أن يبين درجات الفقهاء الحنفية ومراتبهم كما بينهما صاحب الفوائد البهية (ص: ١٠) وصاحب الجواهر المضية (٢/٥٥٨) وغيرهما فى طبقاتهم - فمنهم من قسّم الفقهاء فى ست طبقات ومنهم من قسم الفقهاء فى سبع طبقات - والكتاب منقسم فى احدى وعشرين طبقة - وابن الحنّائى (مؤلّف الكتاب) لم يشر الى هذه الطبقات فى الخطبة بل قال فى إبتداء كل طبقة من هذه الطبقات بعد ترجمة الامام الاعظم: "ثم إنتقل الفقه الى طبقة" فلان، وقد عددت كلام المؤلف هذا اورقا بعد ورق فوجدته فى ٢١ موضعا - وما ذكره مرتب الفهرس لمكتبة برلن ان الكتاب مرتب فى ٢٢ طبقة، فلعله خطأ فى تعديدها ويمكن ان يكون من اضافة الكاتب -

ونسخة أخرى منه محفوظة بالمكتبة الخديوية وعنوانها: "مختصر فى طبقات الحنفية" وعدد أوراقها ٣٨ - واسم المؤلف غير مذكور وقال مرتب الفهرس: ذكر فيه مؤلفه المشاهير من الأئمة الذين نقلوا علم الشريعة فى كل طبقة ونشروها بين الأمة مع سلسلتهم على طبقاتهم وأحوالهم على درجاتهم الأقدم فالأقدم - (فهرس المكتبة الخديويه ٥/١٤٤)

والنسخ الأخرى توجد بدار الكتب المصرية كما أشا بينها فى النمرة ٢٦ - ونسخة منه محفوظة بمكتبة بودلين (فهرس مكتبة بودلين ١/٦٠، ٢/٥٦٩) -

(١٧) محمّد بن احمد بن قاضى خان النهروانى الهندى المكىّ الحنفى

قطب الدين بن علاء الدين، المتوفى سنة ٩٨٨[1]-

له "طبقات الحنفية" فی أربع مجلدات (هدية العارفين ٢/٢٥٥، ايضاح المكنون ٢/٧٨) وفی كشف الظنون (٢/١٠٩٨) وجمع قطب الدين محمد بن علاء الدين المكی كتاباً فی اربع مجلدات، ثم احترق مع كتبه ثم كان فی صدد تجديدها-

(١٨) محمود بن سليمان الكفوی، الرومی، الحنفی، المتوفی سنة ٩٩٠[2]-

له "كتائب أعلام الاخيار من فقهاء مذهب النعمان المختار" وفی كشف الظنون (٢/١٤٧٢-١٤٧٣) اوله: الحمد لله الذی أرسل رسوله بالهدیٰ ودين الحق الخ- قال ومن نعم الله تعالیٰ ان ساقنی الی جمع أخبار فقهاء الأمصار من ذوی الفتيا وقضاة الأمصار من لدن نبينا الی مشائخنا فی تلك الاونة- ولقد كنا فی اثناء بعض الليالی تسامرنا بأهالی البلاد التی يكون بها القاضی من ثمرات أفانين العلوم، فكلما انساق عنان الكلام فی بيداء بيان الفقهاء وشيوخ الاسلام وجدنا اكثرهم غافلين من اصحابنا لايفرقون التلميذ من الاستاذ، ولا يميزون ذوی التقليد عن أهل الاجتهاد فحثونی علی كتب "كتائب اعلام الأخيار وطبقات ذوی الفتيا وقضاة الأمصار" فجمعت مشائخنا المتقدمين والمتأخرين بأسانيدهم وعنعناتهم علی حسب أعصارهم وطبقاتهم مع أرداف المسائل الغريبة المنقولة عنهم فی مشاهير الكتب الفتاوی وتذييل الحكايات العجيبة المسموعة فی حقهم عن جماهير العلماء-

نسخة منها محفوظة بمكتبة باريس تحت الرقم ٢٠٩٧ (١/٣٧٢)

---

(١) راجع ترجمته فی الأعلام ٦/٢٣٤- البدر الطالع ٢/٥٧- ايضاح المكنون ٢/٧٨- وفی هدية العارفين ٢/٢٥٥ اسمه: محمد بن علاء الدين علی بن أحمد الخ

(٢) راجع ترجمته فی الأعلام ٨/٤٩، هدية العارفين ٢/٤١٣-

ونسخة اخرى بمكتبة النور عثمانية تحت الرقم ٣٠٤٢ (فهرس المكتبة ص: ١٧٥) ونسخة ثالثة بمكتبة وِيَن تحت الرقم ١١٨٧ (فهرس وين ٢/٣٥٣) ونسخة رابعة بمكتبة برلن تحت الرقم ١٠٠٢٧ (فهرس برلن ٩/٣٤٠)ع

(١٩) محمود بن سليمان الكوفى

له "طبقات الكوفية فى السادات الحنفية" — الفهرس الانجليزى لمكتبة المدرسة العاليه بكلكتة، المطبوع سنة ١٩٠٥ص : ٣٣ فيه: "إن فى ورق ١٥٩ (الف) لحاشية الفاضل الچلبى على المطول للحسن چلبى بن محمد شاه الفنارى المتوفى سنة ٨٨٦ ترجمة المؤلف (لعل الصحيح المحشى) منقولة من "طبقات الكوفية فى السادات الحنفية" لمحمود بن سليمان الكوفى -

لا أعرف من هذا الكوفى ولم أجد ترجمته فى الكتب. ذكرته هنا لوجهين :-

(١) لأنه توفى بعد سنة ٨٨٦ بلا شك ولذلك كتابه يحتوى على ترجمة الفنارى المتوفى سنة ٨٨٦-

(٢) وظنى ان اللفظين "الكوفى" و"الكوفية" تحريف "الكفوى" (المذكور سابقاً) و"الكفوية" بادنى تغير بتقديم "الواو" على "الفاء"-

(٢٠) تقى الدين بن عبد القادر التميمى، الدارى، المصرى، الحنفى قاضى الجيزة، المتوفى سنة ١٠١٠[1]-

كتابه "الطبقات السنية فى تراجم السادة الحنفية"

وفى كشف الظنون (٢/١٠٩٨) : ثم جاء تقى الدين بن عبد القادر المصرى وصنف فى ذلك كتاباً جمع فيه تراجم الحنفية، فادعى واجاد وهو

ع نسخة خاصة بمكتبة بخار تحت الرقم ٢٥٥ (فهرس البحار : ٢٨٩) نسخة سادسة بالمكتبة الخديوية فى مجلد. عدد اوراقها ٥٧٣ (فهرس الخديوية ٥/١٢٧)

(١) راجع ترجمته فى الاعلام ٢/٦٨ خلاصة الأثر : ٤٧٩ هدايه العارفين ١/٢٤٥

أجلّ الكتب المؤلفة في تراجم أهل الرأى - أدرج فيه رجال الشقائق ومن بعدهم الى زمانه وجميع رجاله ٢٥٢٣ أئمة سنة ٩٩٣، وسماه "طبقات السنية في تراجم الحنفية" وتم تاليفه بمدينة فوه وهو قاض بها في رجب سنة ٩٨٩- وقرظه المولى سعد الدين المعروف بخواجه آفندى، والمولى جوى زاده، والمولى زكريا، والمولى عبد الغنى، والمولى أحمد الانصارى -

ثم ذكره حاجى خليفة مرة أخرى (١٠٩٩/٢) وقال: ذكر في اوله مقدمة تحتوى على أبواب وفصول، فيها فوائد مهمة تتعلق بفن التاريخ، لا يسع المؤرخ جهلها، وصدر باسم السلطان مرادخان بن سليم العثمانى، ثم سيرة النبى عليه الصلوة والسلام اجمالا مفيدا، ثم مناقب الامام ابى حنيفة كما في الجواهر المضية، ثم رتب الأسماء على الحروف وزينها أكثر في بعض التراجم من الأشعار وقصد بذلك أن لا يخلو كتابه من الأدب، وذكر في اوله: أنه أورد بالانساب والألقاب في آخر الكتاب -

نسخة منها محفوظة بمكتبة برلن تحت الرقم ١٠٠٢٩ (فهرس برلن ٤٤١/٩)

ونسخة منها بمكتبة وين، رقم ١١٨٩ (فهرس وين ٣٥٦/٢)

ونسختان بمكتبة النور عثمانية، رقم ٣٣٩٠ - ٣٣٩١ (فهرس النور ص: ١٩٢) وفيه اسم المؤلف: شمس الدين بن عبد القادر -

(٢١) على بن سلطان محمد القارى، الهروى، المتوفى سنة ١٠١٤-[1]

له "الأثمار الجنية في اسماء الحنفية"

نسخة منها في مكتبة خدابخش تحت الرقم ٢٤٥١ - الفهرس الانجليزى (١٠٠/١٢) عنوان الكتاب غير مذكور - لكن نجد ذكره في مؤلفات القارى في كتب أخرى - عدد اوراقها: ١٧٨ - نقلت سنة ١٠٧٩ - اوله الحمد لله رب الأرض والسماء ذى الفضل والطول الخ -

---

(١) هدية العارفين ٧٥١/١، معجم المطبوعات: ١٧٩١، الاعلام ١٦٦/٥- البدر الطالع ٤٤٥/١-

نسخة أخرى محفوظة بمكتبة البحار بكلكتة - تحت الرقم ٢٥٦

(٢٢) عيسى بن محمد بن محمد المغربي، المالكي، جار الله، ابو المهدى، المتوفى سنة ١٠٨٠[1] - له "أسماء رواة الامام ابي حنيفة"، لم أجد ذكره فى كشف الظنون وقد ذكره مرتب الفهرس لمكتبة برلن تحت الرقم ١٠٠٣١ (فهرس برلن ٩/٤٤٣)

(٢٣) خليل بن تاقيه جي صولاق محمد الرومي، الحنفي، المعروف بصولاق زادة - المتوفى سنة ١٠٩٥[2] -

له "طبقات الحنفية" - (ايضاح المكنون ٢/٧٨) - الهدية ١/٣٥٤) -

(٢٤) محمد كامي بن ابراهيم بن أحمد بن سنان بن محمود الأدرنوي الحنفي (١٠٥٩ - ١١٣٦)[3]

كتابه "مهام الفقهاء" فى طبقات الحنفية - إختار فيه مؤلفه تراجم بعض فحول الحنفية ورتبه على حروف المعجم وجعل فى أخر كل حرف فصلاً اورد فيه: أسماء الكتب الفقهية - (ايضاح المكنون ٢/٦٠٨)

نسخة منه فى المكتبة الخديوية، تمت كتابتها سنة ١٢٩١، عدد اوراقها: ١١٦ (فهرس الخديوية ٥/١٦٢) -

(٢٥) عبد الحي بن محمد عبد الحليم الأنصاري، الهندي، ابو الحسنات (١٢٦٤ - ١٣٠٤)[4]

له "الفوائد البهية فى تراجم الحنفية"

وهى تلخيص كتاب الأعلام للكفوي - المذكور سابقاً - لكنه زاد شيئاً كثيراً من كتب أخرى كما قال مؤلفها فى خطبة الكتاب:

---

(١) راجع ترجمته فى الأعلام ٥/٢٩٤ - خلاصة الأثر ٣/٢٤٠

(٢) هدية العارفين ١/٣٥٤ - ايضاح المكنون ٢/٧٨

(٣) الاعلام ٧/٢٣٦ - " " ٢/٦٠٨ -

(٤) الاعلام ٧/٩٥ - الفوائد البهية ٢٤٨ - معجم المطبوعات: ١٥٩٥ -

"فلخصت من كتابه (اى كتاب الكفوى) تراجم الفقهاء من دون حذف ما يتعلق بها" الخ ثم قال: ثم زدت معلما بقولى "قال الجامع" بعد الفراغ من التلخيص من كتب أخرى صنفت فى هذا الباب من الفوائد التى يستحسنها اولوا الالباب -

وهذا الكتاب طبع من الهند سنة ١٢٩٣ وبهامشه "التعليقات السنية على الفوائد البهية" للمؤلف المذكور - وهى غير مختصة بالحنفية

(٣٦) رفيع الدين الشروانى، العلامة له[1] "طبقات الحنفية"

قال مرتب الفهرس لدار الكتب المصرية (٥/٢٤٨): "طبقات الحنفية تاليف العلامة رفيع الدين الشروانى كما ذكر فى اول "طبقات الفقهاء والعباد والزهاد"، جمع فيها جملة تراجم أصحاب الامام أبى حنيفة فى عصره ومن جاء بعده ورتبهم على إحدى وعشرين طبقة وبين فيها ان اول الطبقة الأولى هو الامام ابو حنيفة النعمان ومن أفراد الطبقة الأخيرة المولى احمد بن سليمان بن كمال باشا المتوفى سنة ٩٤٠"، وفى الدار نسختان منها وقطعة من النسخة الثالثة -

والظاهر ان الشروانى صنف كتابا فى تراجم الحنفية كما قال صاحب طبقات الفقهاء والعباد والزهاد ولكن النسخ الثلاثة المحفوظة فى الدار لابن الحنائى المذكور تحت النمرة ١٦ بلاشك لاسباب التى بينتها سابقا كما ظن مرتب الفهرست ايضا حيث قال: وفى كشف الظنون ما يفيد أنه مختصر للمولى على بن أمر الله الحنائى رتبه على احدى وعشرين طبقة -

---

[1] لم اعثر على ترجمته - وطبقات الفقهاء والعباد والزهاد ومشائخ الطريقة والصوفية والمؤرخين والقراء والنحاة واللغويين، لأحمد امين بن حبيب بن ابى بكر بن خيضر - فرغ من تاليف جزء منها فى التاسع عشر من جمادى الاولى سنة ١٢٣٥ - راجع فهرس الدار ٥/ بعد صفحات ٢٤٨ -

(٢٧) "كتائب المجتهدين"؟

نسخة منها بمكتبة خدابخش، لم يذكر ناقلها اسم المولّف ولا عنوان الكتاب ومرتب فهرسها الانجليزي سماها بكتائب المجتهدين لان الكتاب يحتوى على خمس كتائب :

(١) الاوّلى كتيبة طبقة المجتهدين فى الشرع ۔

(٢) الثانية كتيبة طبقة المجتهدين فى المذهب ۔

(٣) الثالثة كتيبة طبقة المجتهدين فى المسائل ۔

(٤) الرابعه كتيبة طبقة اصحاب التخريج ۔

(٥) الخامسة كتيبة طبقة المتبحرين فى الفتوى، عدد اوراقها ١٩٣ (الفهرس الانجليزي ١٢/١٠١)

والظاهر ان الكتاب ماخوذ من كتائب الأعلام للكفوى والدّر المختار للحصكفى المتوفى سنة ١٠٨٨ ۔

(٢٨) "مختصر الجواهر المضية فى طبقات العلماء الحنفية" نسخة منه بمكتبة وين تحت الرقم ١١٧٦ (٢/ ٣٣٦)

وكتاب اخر فى مكتبة برلن تحت الرقم ١٠٠٢١ ۔ قال مؤلفه فى خطبة الكتاب : هذا كتاب أذكر فيه من عرف بنسبة من اصحابنا المذكورين فى الجواهر فان كان تقدم ۔ قلت تقدم وقد ينسب الى النسبة جماعة ۔

فيمكن ان يكون كلاهما مخطوطتين لكتاب واحد

(٢٩) "نادرة الايام فى شمائل أئمة الاسلام ومشائخ الكرام العظام" النصف الاوّل منه محفوظ بمكتبة برلن تحت الرقم ١٠٠٢٨ (فهرس برلن ٩/٤٤١)

قال مؤلفه بعد الحمد والصلوة ! اما بعد فهذه رسالة منتخبة منقحة ملخصة، مستخرجة من كتاب المسمى بأعلام الاخيار الخ [للكفوى]

(٣٠) "نزهة الأبرار فى مناقب الاخيار".

فهى ايضا فى تراجم الحنفية - ذكرها مرتب الفهرس لمكتبة برلن تحت الرقم ١٠٠٣١ (فهرس برلن ٩/٤٤٣)

وقال صاحب كشف الظنون (١٩٣٨/٢) - نزهة الابرار فى مناقب الأخيار" يعنى فى مناقب ابى حنيفة واصحابه مختصر - اوله: الحمد لله الذى هدانا بهذا وما كنّا لنهتدى الخ.

عابد رضا بیدار

سر تیج بہادر سپرو کا رسالہ

کشمیر درپن

"اُردو زبان ہندو مسلمانوں کا مشترک اور ناقابلِ تقسیم ترکہ ہے۔" اس یادگار جملہ کے مصنف سر تیج بہادر سپرو، ایک اعتدال پسند محبِ وطن، ایک بڑے قانون داں اور اُردو تہذیب کے ایک معروف نام کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کے سلسلے میں اسمبلی کی ممبری، وائسرائے کی مجلسِ عاملہ کی ممبری، پریوی کونسل کی ممبری کا تذکرہ شاید اتنا ضروری نہ ہو جتنا یہ امر کہ تقسیمِ ملک سے پہلے وہ عرصے تک انجمن ترقی اُردو کے مستقل صدر تھے۔ ہندوستانی اکیڈمی کے بھی برسوں صدر رہے اور اُردو میں متعدد مقدمے اور دیباچے ان کی یادگار ہیں۔

بجنور کے رہنے والے تھے۔ ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں الٰہ آباد چلے آئے اور پھر ساری زندگی یہیں گزار دی۔ ۱۲ جنوری ۱۹۴۹ء کو الٰہ آباد ہی میں انتقال ہوا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے انتقال کے وقت ۷۲ سال عمر دکھائی ہے (نقوش، شخصیات نمبر) اور معارف نے اپنے شذرات میں (فروری ۴۹ء) ۷۳ سال عمر لکھی ہے۔ اس طرح سالِ پیدائش ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء ٹھہرتا ہے۔

خدابخش لائبریری میں "کشمیر درپن" کے مندرجہ ذیل شمارے محفوظ ہیں: جلد ۳، (۱۹۰۵ء) نمبر ۶ تا ۱۲۔ جلد ۴، (۱۹۰۶ء) نمبر ۱، ۴، ۵ اور ۷ تا ۱۲۔ جلد ۵، (۱۹۰۷ء) نمبر ۱ تا ۹۔ اوّلین جلد مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔

الہ آباد سے شائع ہونیوالا یہ ماہنامہ مخزن اور زمانہ جیسے وقیع پرچوں کا ہمعصر تھا اشاعت جنوری ۱۹۰۳ء سے شروع ہوئی۔ رسالہ ہندی اور اُردو دونوں رسم خط میں رہتا تھا ہندی کا حصہ تقریباً تہائی چوتھائی ہوتا تھا، مگر زبان اسکی بھی اُردو ہی جیسی ہوتی تھی "اڈیٹر پنڈت تیج بہادر سپرو ایم۔اے۔ایل ال۔ ڈی وکیل ہائیکورٹ" تھے سائز۔ زمانہ جیسا تھا سرورق پر ہی مضامین کی فہرست رہتی تھی چندہ "پیشگی" تین روپے تھا ضخامت پہلے پرچے کی کُل تیس ۳۰ صفحے تھی۔ جو بعد میں ۴۰ سے ۵۶ صفحے تک چلتی رہی۔

پہلے شمارہ میں کشمیر درپن کے اجرا کے مقصد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا ضروری حصہ مندرجہ ذیل ہے:

"..... اصلاح ..... اس قسم کے اخبارات کی ضرورت کو ہماری قوم میں سب سے پہلے پنڈت شیو نرائن بہادر مرحوم لکھنوی نے محسوس کی ... مراسلہ (کشمیر) کی جو کچھ مخالفت ہوئی اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ..... مراسلہ کے بعد دو اور قومی رسالے جاری ہوئے: سفیر کشمیر اور کشمیر پرکاش۔ اور دونوں نے اس کام کو جاری رکھا جو مراسلہ نے شروع کیا تھا......

جہاں تک ہم کو علم ہے "کشمیر پرکاش" کا بھی کوئی پرچہ کئی مہینہ سے نہیں نکلا۔ اب اس وقت قوم میں نہ کوئی اخبار ہے، نہ کوئی انجمن ... سیکڑوں رسالے میگزین موجود ہیں مگر ہندو قوم لاتعداد ذاتوں اور فرقوں میں منقسم ہے، اور ہر فرقہ کے رسم ورواج اور فرقوں سے کچھ نہ کچھ مختلف ہیں۔ کشمیری قوم کے جھگڑوں سے کسی بنگالی اخبار کو کیا مطلب، یا کسی مرہٹہ ریفارمر کا کہنا ہم اپنے مراسم کے تبدیل و ترمیم میں کیوں ماننے لگے۔ اس وجہ سے علاوہ عام رسالوں اور اخباروں کے ایک قومی میگزین کی ضرورت ہے، اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے....

فی زمانہ سوشل ریفارم ایسے دو لفظ ہیں جن سے بعض دلوں میں ہر قسم کے خوف پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور بعض دلوں میں ہر قسم کے ولولہ و امید۔ اس رسالہ کی یہ کوشش ہوگی کہ مباحثہ کے ساتھ ہی سوشل اور تمدنی معاملات پر رائے

صائب دستقل قائم کی جاوے۔ تعلیمی مضامین کے سلسلہ میں تاریخی مضامین اور دیگر ملکوں اور قوموں کے حالات وقتاً فوقتاً شائع ہوا کریں گے۔

اور تاکہ یہاں کی مستورات بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں، آٹھ صفحے اس رسالہ میں ہندی کے ہوں گے۔"

○

مندرجہ بالا سطروں سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ کشمیری قوم کی سوشل ریفارم کے لئے جاری کیا گیا تھا اور کشمیری قوم سے گویا کشمیری پنڈت مراد ہیں جو کشمیر میں اور کشمیر سے باہر خصوصاً دوآبہ کے علاقہ میں آباد تھے۔ ہندی کا حصہ "مستورات" کے لئے تھا، جس سے پتا چلتا ہے کہ اردو گویا کشمیری پنڈتوں کی زبان تھی اور مستورات میں ہندی کا رواج تھا۔ قاضی صاحب (قاضی عبدالودود) نے بتایا ہے کہ مسز کملا نہرو کے بھائی کول عرصے تک قاضی صاحب کے پڑوسی رہے ہیں، اور کول یہ کہتے تھے کہ ان کے گھروں میں عورتیں اردو کے سوا کوئی زبان جانتی ہی نہیں۔

رسالہ غالباً ۱۹۰۷ء کے ستمبر تک جاری رہا کہ یہی آخری شمارہ ہے، جو دستیاب ہو سکا ہے۔ اس کے بند ہونے کے آثار مئی ۱۹۰۷ء سے نظر آتے ہیں۔ جب مئی۔ جون کا مشترک شمارہ نکلا، اور اس کے بعد جو آخری دستیاب شمارہ ہے، وہ جولائی، اگست۔ ستمبر تینوں مہینوں کا مشترک شمارہ ہے۔ مئی۔ جون ہی کے شمارہ سے مقام اشاعت کی تبدیلی بھی نظر آتی ہے۔ الہ آباد کی جگہ لکھنؤ نے لے لی ہے، جس کا اعلان اپریل کے شمارہ میں کیا گیا ہے۔ اڈیٹر بھی مارچ تک تیج بہادر سپرو رہے۔ اپریل کے شمارہ میں ایڈیٹر کا نام ہی نہیں دیا گیا اور مئی۔ جون سے "ایڈیٹران: پنڈت کشن نرائن در بیرسٹرایٹلا اور پنڈت اقبال نرائن مسلدان بیرسٹرایٹ لا کے نام آنے لگے اور آخرالذکر کے اہتمام سے جی. ورما و برادران پریس محلہ امین آباد شہر لکھنؤ میں چھپنے لگا۔ اور مقام و نام کی یہ تبدیلیاں غالباً دین کو سزاوار نہ ہوئیں کہ اس تبدیلی کے ساتھ ہمیں صرف دو اشاعتیں میسر ہیں۔

ذیل میں ہم کشمیر درپن کے میسر شماروں کے مشتملات کا مجمل تذکرہ پیش

کرتے ہیں :-

پہلے شمارہ کی تفصیل یہ ہے :

جلد ۱ - نمبر ۱ - ۱۹۰۳ء :

"تبدّل خیالات اور اس کے نتائج : (۱) رسالہ قومی ضرورت (۲) قومی اخبار (۳) جاپان میں ہندوستانی طلبا (۴) کاشمیری اور سول سروس (۵) جناب آنریبل پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب (۶) مہاراجہ کشمیر کی خدمت میں کشمیری پنڈتوں کا ایڈریس (۷) نمائشگاہ دہلی"

مضامین غیر کے عنوان سے "جگموہن ناتھ صاحب آگرہ" کا ایک مضمون ہے "خیرات"

ہندی میں تین مضمون ہیں : (۱) نئے اور پرانے خیالات (۲) دِلّی دربار (۳) پرانے زمانے میں ہندو عورتوں کی حالت" یہ تینوں مضمون آٹھ صفحوں میں آئے ہیں -

اندرونِ سرورق پر ایک پورے صفحہ کا اشتہار "کشمیری بنک لیمیٹڈ فیض آباد کا ہے - ایک اشتہار آخری صفحہ پر ہے " خارِ غم" (ناول) (از گوری پرشاد ہمدم، رئیس آگرہ) ___ دامید وصال -"

پہلے شمارہ میں یہ بھی اعلان ہے کہ : " رسالہ کا پہلا پرچہ مفت ناظرین کی خدمت میں نذر کیا جاتا ہے "

رسالہ "الٰہ آباد میں لاہور پریس میں چھپا" اور " منشی اجودھیا پرشاد نے ۲ - الف سوتھ روڈ الٰہ آباد سے شائع کیا -"

جلد ۱ : نمبر ۲ اپریل ۱۹۰۳ء

سرورق پر یہ رباعی ملتی ہے :-

اسرارِ خلوص دل کا گنجینہ ہو یہ	اے حسن صفا سینۂ بے کینہ ہو یہ
ہوں جوہرِ قوم صاف درپن میں عیاں	تہذیب و ترقی کا اب آئینہ ہو یہ

سمبت ۱۹۵۹ بکرمی

اڈیٹوریل کے تحت :

بچّوں کی تعلیم ، اور (۲) ہمارے ذرائع معاش ___ صرف دو مضامین ہیں -

اور مضامین غیر کے تحت:

(۱) پنڈت پران ناتھ سرسوتی۔ (از پنڈت برج نرائن صاحب چکبست) —— سلسلۂ سخنوران کشمیر نمبر ۲ (۲) دماغی اشتغال۔ (از پنڈت برجموہن دتاتریہ) اور (۳) مرقع کشمیر۔ (از آنریبل پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب)

مہتمم اشاعت کا نام اس پرچہ میں "پنڈت راجناتھ تکرو" ہے۔

مئی، ۱۹۰۳ء

ایڈیٹوریل:

(۱) وفات پنڈت کدارناتھ ادگرا (۲) پنڈت پران ناتھ پرنسپل وکٹوریہ کالج۔ (۳) سفر ولایت —— کشمیری نوجوانوں کے نام دیئے ہیں، جو لندن گئے۔ (۴) مسٹر کین صاحب مرحوم —— شراب خواری کی بیخ کنی کرنے والے۔

ہندی میں بالکل معمولی شذرے ہیں۔ کبھی کبھی، جیسے خود اس شمارے میں اُردو مضامین کا خلاصہ بھی دیا ہے۔

مضامین غیر:

مراسلۂ کشمیر۔ (از پنڈت پران ناتھ، پرنسپل وکٹوریہ کالج گوالیار)

پنڈت شیو نرائن صاحب بہار ...... بہار خاندان میں متبنّی ہو کر کشمیر سے لکھنؤ آئے... ۱۸۶۵ء میں انہوں نے ... (پھر) مراسلہ کشمیر جاری کیا.... عین جوانی کے زمانہ میں دماغ نے جواب دے دیا... جواں مرگ ہوئے۔ مراسلہ کا انتظام بشن نرائن صاحب ڈھادر نے اپنے ذمہ لیا ..... بعد ازاں لچھمی نرائن جی در... اور پھر گنگا پرشاد جی تمینی نے.... پھر جناب شیام نرائن جی صاحب مسلدان (بھی شامل)۔"

دو جوانانِ قوم۔ (از پنڈت منوہر لال زتشی ایم اے۔ پروفیسر ٹریننگ کالج الہ آباد)

کچکول۔ (از پنڈت بشمبھر ناتھ الہ آباد)

خط بسلسلہ "التماس نسبت رقم امانت کشمیری کانفرنس لکھنؤ" (از پنڈت اندر نرائن گرٹو سب جج فرخ آباد)

اگست ۱۹۰۳ء

اڈیٹوریل کے تحت صرف چند نوٹ ہیں۔

مضامین غیر کے تحت :۔

(۱) تذکرہ قومی (از شمبھو ناتھ مشران منصف کان پور) ــــ لکھنؤ میں اصلاح قوم کی کوشش ماضی قریب میں۔ (۲) سفر نامۂ لندن (از پنڈت اقبال نرائن مسلدان) کانفرنس کا ضرورت ــــ کیا پنڈتانِ کشمیر کو کانفرنس کی ضرورت ہے؟ (از پنڈت پران ناتھ، گوالیار) کشمیر کی تباہی۔ (از پنڈت پردمن کشن کچلو بی۔اے جوڈیشل اسسٹنٹ کشمیر)۔ کاروائی مینجنگ کمیٹی سوشل کانفرنس لکھنؤ ــــ ضمیمہ درپن : پنڈت موتی لال نہرو ایڈوکیٹ ہائیکورٹ الہ آباد کا خط : ــــ کشمیر کی تباہی پر سو روپے کا چک بھیجا ہے اور کہا ہے جلسہ کرو۔

جلد ۱۔ نمبر ۹ : ستمبر ۱۹۰۳ء

ایڈیٹوریل : "ہمارے صوبہ کا موجودہ نظام تعلیم (ب) سوشل کانفرنس کا پروگرام (ج) متفرقات ــ مضامین : آنریبل پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب (از خادم اڈیٹر) ــــ مشاہیر قوم کا سلسلہ ، تصویریں ہیں ــــ لندن کا سفر قسط نمبر ۲ (از پنڈت اقبال نرائن مسلدان) ــ سخنورانِ کشمیر قسط نمبر ۳ : پنڈت تربھون ناتھ ہجر (از چکبست) ــــ معمولی کاغذ پر فوٹو بھی۔ جلسۂ کانفرنس (از چکبست)۔ سوشل ترقی : ترجمہ تقریر گووند ریناڈے مرحوم۔ سوشل کانفرنس الہ آباد' (از اقبال نرائن گرٹو)

خریداران سے التماس ـ (از منوہر لال زتشی، داراگنج الہ آباد)

ہندی میں : عام خبریں ہیں اور مندرجہ ذیل مضامین : (۱) زمین کی شکل (۲) ولایت کا سفر (۳) کشمیریوں کی سوشل کانفرنس۔

جلد ۳ ۔ نمبر ۱ ۔ جنوری ۱۹۰۵ء

بڑے دن کی تعطیل (۲) بمبئی ۔ (از سیلاح) (۳) تھیوسوفیکل کنونشن بنارس۔ (از پنڈت سورج نرائن بہادر) ۔ (۴) اہلِ اسلام تعلیمی کانفرنس کا ۱۸ واں اجلاس لکھنؤ

(از چکبست)۔(۵) ہمارے معاصرین۔(۶) خط وکتابت۔(۷) بہار کشمیر (۸) گذشتہ (سیاسی حالات)۔(۹) اخبار قومی

بہار کشمیر کے تحت پنڈت بشن ناتھ کول کی نظم ہے اور کول کی ایک فارسی غزل۔ ہمارے معاصرین میں: اُردوے معلی، مخزن، عصر جدید، زمانہ، دکن ریویو، الکاشف اور قند پارسی۔

جلد ۳۔ نمبر ۲:

(۱) سفر کشمیر (از پنڈت دیبی ناتھ بھٹ)۔(۲) جوشستانِ خیال (از ترلوکی ناتھ کول)۔(۳) سامانِ حرماں اور اس کا درماں۔(از شام پرشاد زتشی)۔(۴) قومی حالت اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے فرائض (از کنور کشن ٹکرو) (۵) تنقید۔(۶) بہار کشمیر اور دوسرے مستقل عنوان (پچھلے پرچہ کی مانند)

بہار کشمیر میں فارسی غزلیں دی ہیں۔ تنقید کے تحت "استری ادھار" (مصنفہ لالہ امرداس) اصلاحی قصہ پر تبصرہ۔

جلد ۳۔ نمبر ۳:

(۱) مسٹر پارکر کی تقریر (ترجمہ اندر پرشاد کچلو)۔(۲) تربیتِ نسواں (از شام ناتھ مشران)۔(۳) کشمیری قوم کی حالت اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے فرائض۔(از اجودھیا پرشاد) (۴) حیات یا ممات (از ترلوکی ناتھ)۔(۵) سوشل اور مذہبی اصلاح قسط ۵ (از منوہر لال زتشی)۔

جسٹس رانا ڈے اور انڈین سوشل کانفرنس؛

جلد ۳۔ نمبر ۴:

(۱) مہاراجہ گیکواڑ کی تقریر۔(ترجمہ اقبال نرائن گرٹو)۔ انڈین نیشنل سوشل کانفرنس بمبئی میں دسمبر ۱۹۰۴ء میں (۲) ہولی (از موہن کشن کول۔(۴) تنقید گلزار نسیم (مرتبہ پنڈت ترلوکی ناتھ لکھنؤ)؛ ۔ پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر (مصنفہ مادھو رام)؛ ۔ الحیات والممات (از شیو برت لال زمن)؛ ۔ الف بے کا کھلونا۔ خط وکتابت

بہارِ کشمیر اور دوسرے مستقل عنوانات۔

جلد ۳۔ نمبر ۵:

(۱) تذکرۂ سکندر ماقدونی (از کشن پرشاد کول (۲) مسئلۂ کرم پر چند خیالات (از سورج نرائن بہادر)۔

معاصرین میں تین[۳] سابق رسالوں کے علاوہ اِس بار معاصر خاتون سے بھی اقتباسات

جلد ۳۔ نمبر ۶:

باقاعدہ رنگین سرورق۔ اڈیٹوریل: محض چند نوٹ۔

مضامین: اصلاح اور آزادی (از رائے برج نرائن گرٹو): نیکی بدی کا معیار بجائے اپنے ہر ایک کے ملک کی بہبودی قرار دیا جائے (۲)، جاپانی تہمتن۔ (از پنڈت ترلوکی ناتھ کول (۳) خط و کتابت: "تاریک خیال بزرگانِ قوم" وغیرہ، مختلف اصحاب کے خطوط مختلف عنوانات پر (۴) بہارِ کشمیر: "مذہبِ شاعرانہ" (نظم)۔ (از برج نرائن چکبست) ہمارے معاصرین: "اُردوئے معلّٰی، زمانہ، اور عصرِ جدید سے اقتباسات)۔ قومی اخبار۔ رسید زر وغیرہ

"نامی گرامی انڈین پریس الہ آباد میں طبع ہوا۔ اور منشی اجودھیا پرشاد نے ۱۶ نمبر الگن روڈ الہ آباد سے شائع کیا۔"

جلد ۳۔ نمبر ۷:

اڈیٹوریل: صرف چند نوٹ۔

مضامین: (۱) تعلیم نسواں کی ضرورت (از پنڈت پران ناتھ صاحب۔ (۲) برہما کی لڑکی۔ (از مونگ جی) ملک برما پر۔ (۳) شیو شمبھو کا چٹھا (۴) لکھنؤ کا کنھیا پاٹھ شالہ۔ (از پنڈت سورج نرائن بہادر) (۵) کشمیر ریلیف فنڈ (۶) ہمارے معاصرین (۸) اخبار قومی (۹) رسید زر وغیرہ۔

معاصرین میں اُردوئے معلّٰی، دکن ریویو، زمانہ، عصرِ جدید، فصیح الملک شامل ہیں۔

فصیح الملک کلنے رسالہ کی حیثیت سے تذکرہ ہے :-

"مئی ۱۹۰۵ء سے ایک نیا رسالہ فصیح الملک لاہور سے حضرت داغ دہلوی مرحوم کی یادگار میں باہتمام سید احسن صاحب مارہروی شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اردو زبان اور اردو رسم خط کی اصلاح اور ترقی اس رسالہ کا مقصد ہے، جیسا کہ پہلے اور دوسرے نمبر کے چند مضامین کی سُرخیوں سے ظاہر ہے۔ مثلاً "جو بولو وہ لکھو" "ہائے ہوز" "اردو الفاظ کی ترکیب"۔ علاوہ حصۂ نظم کے اس رسالہ کے آخر میں فصیح اللغات کے چند صفحے بھی شروع ہوتے ہیں۔ فصیح الملک کی قیمت ۲ دو روپے سالانہ ہے اور حجم ۳۲ صفحے۔ لاہور ہی سے ایک اور رسالہ سائنس اور تعلیم نامی "سائنٹفک و ٹکنیکل ورکشاپ" کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ رسالہ کی غرض یہ ہے کہ "نئے معلومات اور مشاہدات سے اس کثیر التعداد جماعت کو جو انگریزی سے بے بہرہ ہے کسی قدر واقف اور آگاہ کیا جاوے۔ پہلے نمبر میں کلکتہ کے مشہور و معروف ماہر علوم طبیعی ڈاکٹر جگدیش چندر بوس کی سوانح عمری درج ہے اور اسی مضمون کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ممدوح کی تصویر بھی ہدیۂ ناظرین کی گئی ہے۔ باقی مضامین سائنس۔ زلزلہ۔ اسباق الاشیاء وغیرہ کے متعلق ہیں۔ رسالہ کا حجم ۲۰ صفحے کا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک چار صفحہ کا انگریزی ضمیمہ بھی شائع ہوتا ہے جو ہمارے نزدیک غیر ضروری ہے۔ قیمت سالانہ صرف ایک روپیہ ہے۔"

جلد ۳ - نمبر ۸ :

اڈیٹوریل: چند نوٹ - مضامین: گلزار نسیم (از چکبست) انتالیس صفحہ کا مقالہ - شرر پر چکبست کا یہ گویا پہلا مضمون ہے جو آگے چل کے معرکۂ چکبست و شرر میں ڈھلا۔ خط وکتابت: ہمارے معاصرین اور دوسرے مستقل عنوانات۔

معاصرین پر تبصرہ کے ذیل میں گلزار نسیم پر احمد علی شوق قدوائی کا مضمون اودھ پنچ سے نقل کیا ہے جو "معرکۂ چکبست و شرر" میں شامل اشاعت ہے۔

ہمارے معاصرین کے ذیل میں اردوئے معلی، عصر جدید اور دلگداز کے مضامین کا تذکرہ ہے۔

"عصر جدید کے اس پرچہ میں دو مضمون قابلِ ذکر ہیں ایک شمس العلماء خان بہادر مولوی

ذکاء اللہ کا مضمون "پریس اور عام رائے" پر اور دوسرا خان صاحب مرزا سلطان احمد خاں صاحب کا "مذہب اور مذہبی فرقہ بندیوں پر:-

"شمس العلماء صاحب کی رائے میں تو ہمارے ملک کے انگریزی اخبارات جو ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہیں بالکل بیکار ہیں۔ کیونکہ ان کا بڑا مقصد۔۔ ہے پولیٹکل ایجی ٹیشن پھیلانا اور یہ کوشش محض بیہودہ ہے کیونکہ آپ کے نزدیک "یہ تعلیم یافتہ آدمیوں کی غلطی ہے کہ وہ اپنی اس بلاغت و فصاحت کو عمل کا قائم مقام سمجھیں وہ خوب سمجھ لیں کہ جو باتیں ملک کے اصلی فائدے اور ترقی کی ہیں ان کا کرنا ان کے حدِ اختیار سے باہر ہے۔" مولوی ذکاء اللہ صاحب کا یہ فیصلا ایسا ہے کہ اگر یہ صحیح ہو تو پولیٹکل ایجی ٹیشن کی کمر توڑ دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر خوش قسمتی سے آگے بڑھ کر آپ نے خود ہی اس بیان کی تردید کر دی ہے۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں "یہ اخبار حکام ضلع کے کاموں کی بھی خبر لیتے رہتے ہیں جس کے خوف کے سبب سے حکام اب کام پہلے کے نسبت زیادہ احتیاط سے کرنے لگے ہیں۔" اگر ایسا ہے تو نہ تو اخبار بیکار ثابت ہوئے اور نہ تعلیم یافتہ گروہ کی فصاحت و بلاغت رائیگاں گئی۔ کیونکہ ہندوستان ایسے ملک میں اخباروں کا ایک بڑا فرض یہ ہے کہ رعایا کو اس کے حقوق اور فرائض سے آگاہ کر کے اس قابل بنا دیں کہ وہ اپنے فرائض کو احسن طریقے سے انجام دے سکے اور اپنے حقوق کی نگرانی کر سکے اور حقوق کی نگرانی اور حفاظت کے لئے عوام کی رائے (پبلک اوپینین) میں ایسی قوت پیدا کی جاوے کہ حکام اس کا لحاظ کرنے کے لئے مجبور ہوں۔ اگرچہ ہندوستان کے اخباروں نے کسی حد تک یہ بات پیدا کر دی ہے تو جو باتیں اصلی فائدے اور ترقی کی ہیں وہ ان کی حدِ اختیار سے باہر نہیں ہیں۔

ہم کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ گو یہ مضمون عصر جدید میں چھپا ہے۔ مگر اس میں خیرات کے مروجہ ناقص طریقوں اور شادی اور غمی کی فضول خرچیوں کی حمایت کی گئی ہے۔ مراسم شادی کی فضول خرچیوں کے نسبت آپ کی یہ رائے کہ "ان فضول خرچیوں پر بعض فرقوں کا معاش موقوف ہے۔ اگر وہ موقوف ہوں تو ان فرقوں پر دفعتاً بڑی مصیبت و آفت آجائے۔" ہم نہیں جانتے کہ یہ دلیل کیا معنی و مطلب رکھتی ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ چونکہ چوری اور قزاقی اور زنا پر بعض فرقوں کی معاش موقوف ہے اس لئے انکا انسداد دفعتہ نہ ہونا چاہیئے، ورنہ ان فرقوں پر بڑی مصیبت

آجادے گی۔ شمس العلماء صاحب کی یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ مرزا سلطان احمد صاحب نے مذہبی قوموں
کی پیدائش اور نشوونما کے اصولوں کو بہت عمدہ طریقہ سے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے۔ مولوی
غلام محمد صاحب وکیل ندوۃ العلماء نے اپنے مضمون "نہ ختم ہونے والی کہانی" میں ایک بڑی فاش
غلطی کی ہے۔ مسلمانوں میں گداگری کی روز افزوں ترقی کے اسباب میں سے ایک سبب آپ "ہندوستان
کے ہندو اقوام کے پڑوس کے اثر" کو بتلاتے ہیں۔ "کیونکہ تفریق ذات نے ان میں اس قسم کے اسباب
پیدا کر دیے تھے کہ بعض لوگ جو اپنے آپ کو شودر کہلاتیں' وہ امراء سے مانگ کر گذارا کریں چنانچہ
مسلمانوں میں بھی زیادہ تر پیشہ ور گداگران ہی نومسلم اقوام میں ہیں' جو پہلے سے گداگری کیا کرتی
تھیں"۔ یہ تو ہم کو نہیں معلوم کہ مسلمانوں میں گداگر صرف نومسلم ہی ہوتے ہیں۔ گو اس امر کے متعلق
ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمان گداگر نومسلم ہیں تو ایران اور وسط
ایشیا کے درویش کس زمرہ میں ہیں۔ مگر اس سے قطع نظر کر کے مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ ہندوؤں
میں گداگری شودروں کا پیشہ ہے البتہ تعجب خیز ہے۔ کیا مولوی صاحب کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ
ہندوؤں میں بھیک مانگنا خاص برہمنوں کا حق ہے اور شودروں کا فرض دوسروں کی خدمت کر کے
اپنا پیٹ بھرنا ہے۔ مولوی صاحب نے ہندوؤں کو مسلمانوں کی گداگری کا ذمہ دار بے سبب ٹھہرا دیا، مگر
اس بات پر غور نہیں کیا کہ جن واقعات پر وہ اپنے اس فیصلہ کی بنیاد رکھتے ہیں وہ بالکل بے اصل ہے"۔

"دلگداز" میں گلزار نسیم کے متعلق ابھی تک بحث جاری ہے۔ یہ بحث زیادہ تر لفظی
ہے۔ اس وجہ سے ہم اس کے نسبت کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے۔ ہاں مثنوی مذکور کے متعلق مولوی
عبد الحلیم صاحب شرر کے "دو متضاد بیانات" ناظرین کی دلبستگی کے لئے پیش کرتے ہیں۔ مارچ
کے پرچہ میں مولوی صاحب نے لکھا تھا کہ "کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر آتش نے اس دلبستگی
کی بنیاد پر جو انہیں نو عمر شاگرد سے تھی اس کی تحریک سے یا اس کی مشق اولین دیکھ کے اس
مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو۔ پھر اس میں متعدد لغزشیں دیکھ کے اسے بجائے
اپنے اسی کی طرف منسوب کر دیا ہو جن دنوں یہ مثنوی کہی گئی ہے اُن دنوں شاعری کا یہ رنگ تھا
کہ معائب محاسن پر غالب خیال کئے جاتے تھے اور شعراء کو کلام میں خوبیاں پیدا کرنے سے زیادہ فکر
اس بات کی ہوتی تھی کہ کلام عیوب سے پاک ہو۔ لہٰذا یہ خیال اس بات کا پورا محرک ہو سکتا تھا کہ آتش

اس مثنوی کو کہیں اور اپنے کمسن شاگرد کو دیدیں "۔ اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا، تو مولوی عبدالحلیم صاحب کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مثنوی میں آتش کے سب شاگردوں کا کچھ نہ کچھ حصّہ ہے۔ اب جولائی کے دلگداز میں آپ کہتے ہیں کہ "اعتراضوں کے تسلیم کرنے کے ساتھ ان کے (اڈیٹر ریاض الاخبار کے) اس ارشاد کے نسبت کہ "جو اعتراضات شرر نے کئے ہیں گو موجودہ زمانے میں ان کا حرف حرف صحیح ہے مگر جس زمانے میں نسیم تھے اس وقت کی زبان اور طرز کلام اور تصرفات کو دیکھتے ہوئے ہم نسیم کی کوئی خطا نہیں دیکھتے" ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں نسیم کو اتنا زمانہ نہیں گذرا کہ انکی طرف سے ایسی عذرداری جائز سمجھی جاوے۔ ایسے تصرفات ایسی لغزشیں اگر اس زمانہ میں جائز تھیں تو ضرور تھا کہ ان کے معاصرین اور دیگر شاگردان ناسخ و آتش کے کلام میں بھی پائی جاتیں "۔ اب ذرا غور طلب امر یہ ہے کہ مولوی عبدالحلیم صاحب کے یہ دونوں بیانات کہاں تک ایک دوسرے کی تنسیخ کرتے ہیں۔ اگر مثنوی آتش کی تصنیف ہے۔ یا اگر اس میں صبا، رند، خلیل کی شرکت ہے، تو اس کے معائب کے ذمہ دار یہ سب شعراء ہیں اور اگر نسیم کے معاصرین کا کلام ایسے تصرفات اور ایسی لغزشوں سے پاک ہے، تو گلزار نسیم میں ان کی شرکت تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جولائی میں مضمون لکھتے ہوئے مارچ والے مضمون کا مولانا کو خیال نہیں رہا۔ کیا ہوا؟ غلبۂ ذکاوت سے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ مگر ہمکو خوشی یہ ہے کہ اس بحث میں اودھ پنچ نے نہایت ہی بے تعصبی سے کام لیا ہے اور منشی سجاد حسین صاحب ایسے منصف مزاج انشاپرداز سے امید بھی ایسی ہی تھی کہ منشی صاحب موصوف کی صحت میں فرق آگیا ہے مگر خلقی ذہانت اور طبیعت داری میں فرق نہیں آیا ہے اور جس زور کے مضامین آپ کے قلم سے اس بحث میں نکلے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ عالمانہ و محققانہ بیاقت کے ساتھ آپ کا آئینۂ دل مذہبی تعصب کے زنگ سے صاف ہے۔ یکم اگست ۱۹۰۵ء کے "اتحاد" میں جو بیہودہ گستاخی مولوی عبدالحلیم شرر نے منشی صاحب کی خدمت میں کی ہے اس کا جواب بس یہی ہے کہ:

اللہ ہے نگہبان اعلےٰ کی آبرو کا مُنہ پر پڑا اسی کے جس نے فلک پہ تھوکا

علاوہ اڈیٹوریل مضامین کے اودھ پنچ میں ایک ایسے شخص کا مراسلہ شائع ہوا ہے جس کی علمی لیاقت ذہانت اور قابلیت سے حضرت شرر اور ان کے ساتھیوں کو بھی انکار نہ ہوگا۔ ہماری مراد منشی احمد علی

صاحب شوق سے ہے۔ آپ ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کی ذات پر لکھنؤ کو ناز ہے۔ آپ مدت تک اخبار "آزاد" کے اڈیٹر نامور کی کے ساتھ رہے ہیں اور پنچ میں جو آپ کے مضامین نکلے ہیں ان کا شمار ہر صورت سے اردو کے اعلیٰ لٹریچر میں کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں آپ ایک کہنہ مشق اور مشہور شاعر بھی ہیں۔ چنانچہ مثنوی ترانۂ شوق آپ سے یادگار ہے اور یہ مثنوی گلزار نسیم کے طرز میں آپ نے تحریر فرمائی ہے۔ لکھنؤ میں یہ مشہور ہے کہ ترانۂ شوق گلزار نسیم کے جواب میں لکھی گئی تھی اور اس لئے شاید مولوی عبد الحلیم صاحب کو حضرت شوق سے حمایت کی امید تھی۔ آپ نے جو مراسلہ پنچ میں اس بحث کے متعلق بھیجا ہے اور جس کو منشی سجاد صاحب نے "قول فیصل" مانا ہے ہم اس کو بجنسہٖ درج ذیل کرتے ہیں۔

ایک نئے رسالہ "المصباح" کا بھی نوٹس لیا گیا ہے:

"جولائی سے ایک نیا اردو رسالہ "المصباح" نامی جے پور سے جاری ہوا ہے۔ اس رسالہ کی خاص غرض یہ ہے کہ "فلسفۂ جدید اور سائنس کی مدد سے دہریت کے خلاف مذہب پر عموماً اور متنازعہ امور پر خصوصاً روشنی ڈالی جاوے۔" مگر علاوہ "روحانی" مسائل کے ورزش صنعت و حرفت حفظ صحت وغیرہ پر بھی مضامین شائع ہوا کریں گے اور "مشاہیر ہند کی باتصویر سوانحعمریاں" بھی ہدیۂ ناظرین کی جاویں گی۔ چنانچہ جولائی کے نمبر میں سر سید احمد خاں صاحب کی سوانحعمری شائع کی گئی ہے۔ قیمت سالانہ عام شائقین سے للعہ طلبہ سے ہے"

جلد ۳۔ نمبر ۹:

سخندان کشمیر: لچھمی رام سرور (از چکبست)۔ اردو زبان (از دتاتریہ) بہار کشمیر:۔ (اس کے تحت کشن نرائن اور اثر لکھنوی کا کلام ہے)۔ بقیہ پانچ مستقل عنوانات بدستور ہیں۔ "ہمارے معاصرین" کے تحت ایک نئے پرچہ کا نوٹس لیا گیا ہے:

"اس مرتبہ ہمارے پاس ایک نیا پرچہ آریہ سماچار نامی آیا ہے۔ یہ پرچہ دیانند اینگلو ویدک کالج ٹرسٹ اینڈ مینجمنٹ سوسائٹی ممالک متحدہ کا ماہوار رسالہ ہے اور کانپور سے بابو آنند سوروپ صاحب وکیل کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔ اس کے مضامین اکثر آریہ سماج

سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی سُرخی ہے "آریہ سماج ہر دلعزیز کیونکر بن سکتا ہے" اور اس میں پنڈت بدری دت صاحب شرما نے جو خود آریہ سماجی ہیں اپنی سماج کی چند نقائص اور کمزوریوں کو نہایت صاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔

'خط و کتابت'، کے ذیل میں حوالہ ہے کہ "رسالہ کشمیر پرکاش مرحوم ... سب سے اوّل نمبر بابت جون و جولائی ۱۸۹۲ء" تھا۔ سفیر کشمیر کے نمبر مارچ و اپریل ۱۸۹۳ء کا حوالہ ہے۔

جلد ۳۔ نمبر ۱۰:

ہندوستان جدید (از کشن پرشاد کول) ۔ مجذوب کی بڑ (از شام پرشاد نقشی) قیصر باغ کا قدیم نظارہ (منقول از زمانہ) خط و کتابت ، بہار کشمیر ۔ اخبار قومی وغیرہ۔

'اخبار قومی'، کے تحت ایک ذیلی عنوان ہے نتیجۂ امتحانات الٰہ آباد یونیورسٹی۔ اس میں منجملہ دوسرے کامیاب طلبار کے ناموں کے اندراجات بھی ہیں:

"بی۔ اے ۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو۔ آگرہ۔ درجہ دوئم" بی۔ ایس۔ سی ۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو ۔ آگرہ۔ درجہ سوئم"

جلد ۳ ۔ نمبر ۱۱:

ہندوستان قدیم ۔ (از کشن پرشاد کول) ۔ تربیتِ اولاد: (از گوپی ناتھ کنزرو) چارلس ڈاردن ۔ (منقول از رسالہ سائنس و تعلیم) خط و کتابت ۔ بہارِ کشمیر وغیرہ۔

جلد ۳ ۔ نمبر ۱۲:

اڈیٹوریل: ۔ لاجپت رائے اور گوکھلے ۔ انگلستان سے واپس (ب) تقسیم بنگال کی ہندو مخالفت کر رہے ہیں گوپال کرشن گوکھلے باتصویر (از اڈیٹر)

انڈین نیشنل کانگریس ۔ (لکھنے والے کے نام نہیں: غالباً اڈیٹر ہی قلم سے) لارڈ کرزن کا عہدِ حکومت ۔ (از برج نرائن گرٹو) ۔ وطن آخر وطن ہے: ایک کہانی از مخزن (ترجمہ از فرانسیسی از عبد القادر) ہمارے معاصرین (مخزن ، اُدوئے معلّیٰ زمانہ) اور دوسرے عنوانات۔

جلد ۴ - نمبر ۱ - جنوری ۱۹۰۶ء :

انڈین نیشنل کانگریس : اکیسویں اجلاس کانگریس پر (از چکبست) - محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس : ۱۹۰۵ء کے اجلاس کی روداد (از منشی بدرالدین احمد بی - اے)۔ ٹمپرنس کانفرنس (از رتن ناتھ کول)، سانڈین سوشل کانفرنس (از منوہر لال زتشی) نمائشگاہ اور انڈسٹریل کانفرنس (از اقبال نرائن گرٹو)۔ ہمارے معاصرین اور دوسرے مستقل عنوانات۔

جلد ۴ - نمبر ۲ :

دقیانوسی خیالات (از کول جلالی) - ہندوستان جدید (از کشن پرشاد کول)۔ ہندوستانیوں کی اخلاقی تعلیم (از ترلوکی) - ایں ہم غنیمت است (از ت - ن - ک) تعلیم نسواں (از سورج نرائن بہادر) - بہار کشمیر اور دوسرے مستقل عنوانات -

جلد ۴ - نمبر ۳ :

مسٹر اومیش چندر دت کی تقریر (از پنڈت اقبال نرائن گرٹو) - ہندوستانیوں کی اخلاقی تعلیم (از ترلوکی ناتھ کول) - ہمارے معاصرین اور دوسرے مستقل عنوانات -

تنقید : "بھارت درپن" (از چکبست) - "دیسی ولایتی کھانڈ کا مقابلہ" - (از ہیرا لال گپتا) -

جلد ۴ - نمبر ۴ :

سناتن دھرم اور سوشل اصلاح : تقریریں سوشل کانفرنس (از جسٹس چندر دولکر) قوم کی موجودہ حالت (از اقبال کشن کول شرشتہ) - تاریک خیالات (از کامتا پرشاد عرف سکھیا) - کشمیر و دیگر ریچ (از منشی عبدالسلام، رفیقی - اڈیٹر الرفیق، رنگون - فارسی نظم، یہ صرف ایک خریدہ تمام پورے فائل میں ملتا ہے - نظم ہے جو "منقول" ہے دقیانوسی خیالات - (از دقیانوس) -

جلد ۴ - نمبر ۵ :

اڈیٹوریل : مالویہ جی کی مجوزہ ہندو یونیورسٹی پر —— لکھا ہے کہ تعلیم کو مذہب کے ساتھ آمیز کرنا ٹھیک نہیں - مضامین : (۱) اشرار و شرر - (پروفیسر مولوی سید عبدالحمید)

بسلسلۂ مضمون مصنفۂ چکبست دبحث مابین چکبست و شرر حکیم برہم وغیرہ - دقیانوسی خیالات (از سورج نرائن بہادر) اس عنوان سے کول جلالی شمارہ ۲ میں لکھ چکے ہیں۔

آزادی (از اقبال نرائن بہادر دکشن پرشاد کول) — کشن پرشاد کول کے مضمون پر مراسلۂ اقبال نرائن اور پھر کول کا جواب شائع کیا ہے۔

بہارِ کشمیر، ہمارے معاصرین اور دوسرے عنوانات۔

'ہمارے معاصرین' کے تحت مخزن، دلگداز وغیرہ کے علاوہ نئے پرچے تہذیب کا (جس کا مجمل تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے) بھی تفصیلی حوالہ ہے:

"کئی ماہ سے ایک رسالہ تہذیب نامی رام پور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس رسالہ کے مئی نمبر میں کئی مضمون قابل ذکر ہیں۔ ایک مضمون "لبرل" کا لکھا ہوا ہے۔ جس کی سرخی ہے "تعلیم یافتوں کا رجحان" اور جس میں انگریزی پڑھے ہوئے نوجوانوں کی چند کمزوریاں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً مذہب کی طرف سے بے پرواہی، اسراف، قومی تعصب، تنگ خیالی، نہ ان کمزوریوں کے وجود سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کوئی ان کی اصلاح کو غیر ضروری یا ناپسندیدہ کہہ سکتا ہے لیکن مضمون نگار نے اس جائز شکایات پر اکتفا نہ کرکے پولیٹیکل دائرہ میں کام کرنے والوں کو خواہ مخواہ گالیاں دی ہیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں:-

"نئے تعلیم یافتہ مذہب اور ملت سے زیادہ عزیز اپنے پولیٹکل مقاصد و اغراض کو سمجھتے ہیں۔ جس کا بُری طرح ان کے دماغوں میں سودا سمایا ہوا ہے۔ کوا چلا ہنس کی چال اپنی رفتار بھی بھولا اور وہ بھی نہ آئی لگا گُدکنے۔ وہی حال اس گروہ کا ہے کہ یورپ کے دولتمند صاحب علم وفضل اولوالعزم قوموں کی دیکھا دیکھی ان کو بھی زکام ہوا ہے اور ملک کے اختلاف قومی دُملکی سے غافل ہو کر ہر تعلیم یافتہ ہندو ہو یا مسلمان باغیانہ خیالات سے مدہوش ہو رہا ہے۔ ادب تہذیب متانت سے گذر کر اسی دُھن میں گرفتار ہے کہ ہمارا بھی حکومت کے پانچویں سواروں میں شمار ہو جائے۔" ان فقروں کو پڑھ کر دو قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ جو شخص تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو باغیانہ خیالات سے مدہوش بتلاتا ہے، وہ ہندوستان کے پولیٹکل تحریک کے حالات سے کس قدر غافل ہے۔ دوسرے

یہ کہ جو مضمون نگار پولیٹکل مقاصد واغراض کے حصول کے لئے کوشش کرنے کو سودے اور جنون سے تعبیر کرتا ہے، وہ دنیا کی تاریخ سے کس قدر ناواقف ہے اور اس نے برٹش گورنمنٹ کے اصول حکومت کے سمجھنے میں کس قدر غلطی کی ہے۔ کسی خاص مضمون یا بحث کا کسی رسالہ کے مقاصد واغراض کے خلاف ہونا اور بات ہے اور بلا سمجھے بوجھے کسی کو گالیاں دینا دوسری بات ہے۔ اسی نمبر میں دو اور مضمون شائع ہوئے ہیں، جو ایک دوسرے کے متضاد ہونے کی وجہ سے ضرور دلچسپ ہیں۔ محمد نبی خاں صاحب نے اپنے مضمون میں مسلمانوں کی تنزل کی وجہ ان کی لامذہبی کو قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "اس واقعہ کے تمام پہلوؤں پر نظر کرنے کے ساتھ مجھے ان لوگوں کا بھی خیال پیدا ہوتا ہے جو خلعتِ زیبا سے پابندیٔ مذہب کو اتار کر سر سے پیر تک برہنہ ہو گئے اور ہمارے علمائے اسلام اور بزرگانِ عظام کے پند و نصائح کو نعوذ باللہ من ذلک، مجنون کی بڑ خیال کرتے ہیں" آگے چل کر آپ اپنے مضمون کا ماحصل یوں بیان کرتے ہیں "میری اس تحریر سے عنوان والے سوال (ہماری ترقی کیونکر ہو سکتی ہے) کا جواب حاصل ہو گیا کہ سوائے دین کی پابندی کے ہماری ترقی نہیں ہو سکتی" ان خیالات کا پورا پورا جواب اسی نمبر میں ہم کو بھی مضمون ممتنعات معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک خاص مسئلہ کو ذہن میں رکھ کر قاعدے کے ساتھ اس پر بحث کی گئی ہے۔ ریڈیکل کی رائے ہے کہ "مذہب کی غایت اور اصل مقصد بنی نوع انسان کی روحانی اصلاح کرنا ہے۔ دنیوی معاملات و سلسلہ سبب و مسبب سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور نہ کوئی مذہب ہمیشہ کے واسطے دنیوی معاشرت کا کوئی مستقل کوڈ مرتب کرنے کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ روحانی اصلاح کے واسطے جہاں تک دنیوی معاشرت میں دست اندازی کی ضرورت ہو اس کے متعلق بھی مذہبی کتب میں کچھ احکام اور ہدایات مل جاویں۔ لیکن وہ احکام عام طور پر زمانہ کے واسطے موزوں اور قابل عمل ہوتے ہیں، جس زمانے میں وہ انسانوں پر نازل کئے گئے تھے۔ ہر زمانہ میں اُن کی پابندی قرین مصلحت اور موصل الی المقصود نہیں ہو سکتی" اس کے بعد اہل فنشیا یونان اور رومتہ الکبریٰ کی ترقی

کے حالت بیان کر کے لکھتے ہیں:۔ "لیکن ان مشہور قوموں میں کوئی قوم کسی مذہب حق کی پیرو اور کتاب آسمانی کی متبع نہ تھی۔ حالانکہ خود مسلمانوں نے ابتدا سے ان کی تہذیب ادبی اور علمی تحقیقاتوں کو اپنے مذہبی لٹریچر میں نہایت راسخ الاعتقادی کے ساتھ جگہ دے رکھی ہے اور اُن کا منکر بھی ایک رُکن اسلام کے منکر کی طرح کفر و الحاد کا مستوجب قرار پاتا ہے ...... مکہ معظمہ کے مسلمانوں کی راسخ الاعتقادی اور پابند شرع ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ بھی پکے مسلمان نہ رہیں، تو پھر کون مسلمان رہ سکتا ہے

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

لیکن اہل مکہ کی علمی اخلاقی تمدنی غرضکہ ہر قسم کی حالت نہایت خراب ہے اور تہذیب دنیا میں کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا" اسی نمبر میں میر ناصر علی صاحب دہلوی کا ایک مضمون "تہذیب اسلام" کے عنوان سے چھپا ہے۔ بیان تو یہ کیا گیا ہے کہ یہ مضمون مولوی صلاح الدین خدا بخش صاحب کی تصنیف Islamic civilization کا ریویو ہے لیکن مضمون کو پڑھ کر یہ خیال آتا ہے کہ اس مضمون کو ایسی قابل وقعت اور قابل غور کتاب کا ریویو کہنا فنِ تنقید کا منہ چڑھانا ہے۔

جلد ۴۔ نمبر ۶:

(۱) پنجاب میں اصلاح قومی۔ (از دتاتریہ)۔ (۲) جاپان نے کس طرح ترقی کی (از الف۔پ) (۳) ہندوستانیوں کی اخلاقی تعلیم (مترجمہ، ترلوکی ناتھ کول)۔ (۴) ہمارے معاصرین۔ بہارِ کشمیر وغیرہ۔

دتاتریہ کے مضمون "پنجاب میں اصلاح قومی" میں ضمناً چند رسالوں کا تفصیلی تذکرہ آگیا ہے:۔

"مراسلہ کشمیر جاریہ جناب پنڈت شیو نرائن صاحب بہار مرحوم کے صفحہ لوح کی پشت پر اکثر اشاعتوں میں وہ مضامین ہدایتاً لکھ دیئے جاتے تھے جن پر نامہ نگاروں کی طبع آزمائی ہتمان مراسلہ کو منظور تھی۔ اس فہرست میں اگرچہ ہم "امور مذہبی کی جانب توجہ ہو" بھی لکھا ہوا دیکھتے ہیں لیکن بہ لحاظ مندرجات ضمنی کے جو اہمیت کہ "بملاحظہ قانون کشمیر مصارف شادی کا بہ تخفیف مین

ہونا اور اُس کا عملدرآمد" اس مقصد کو دی جاتی تھی وہ امور مذہبی کی جانب توجہ" کو ہرگز نصیب نہ ہوئی اور یہی حال لکھنؤ کی نیشنل کلب کا ہے ۔ مراسلہ کشمیر نے ۱۸۷۲ء کے آخر میں جنم لیا اور اسی وقت سے تخفیف مصارف شادی کا مسئلہ معرض بحث میں ڈالا گیا ۔ ہمارے قابلِ تکریم بزرگ جناب پنڈت بشمبر ناتھ عزت صاحب نے جن کی بزرگی اور فضیلت محتاج توصیف نہیں ایک مفصل رسالہ میں اس مسئلہ پر بحث کی اور اسے چھپوا کر مراسلہ کے توسل سے استصواب رائے کے لئے ساری برادری میں شائع کرایا[۱] ۔ عرصہ تک مراسلہ کے کالم اس مسودہ پر تنظیر و تنقید سے مالا مال نکلتے رہے ۔ اس کے چند ماہ بعد ہی ایک اور کتاب میں اس مضمون پر اور مضامین کے ساتھ مفصل بحث کی گئی[۲] ...

کشمیری پنڈت نیشنل ایسوسی ایشن لاہور ...

... ... (جسے بنظر اختصار قومی انجمن لاہور کے نام سے تعبیر کیا جائے گا) ۱۸۹۱ء کی ۱۲ جنوری کو (کہا جاتا ہے کہ سنکرانت کے مبارک دن) بمقام لاہور قائم ہوئی اور اس کا اعلان یا دعوتِ شرکت ایک دو ورقہ گشتی چٹھی کی شکل میں سفر کشمیر بابت ماہ مارچ ۱۸۹۱ء کے ساتھ شائع ہوا ۔ اس کے صفحہ ۲ پر یہ اُصول انجمن لکھے ہوئے تھے ۔

" اوّل ۔ اتفاق قومی کو پیدا کرنا ۔

" دوم ۔ علمی اخلاقی اور صنعتی ذرائع کو تقویت پہنچانا ۔

" سوم ۔ سوشل اصلاحات جو مذہب کے خلاف نہ ہوں اور بہبودی قوم کو وسعت دینا ۔

" چہارم ۔ قوم کی مفلس بیوگان اور بے مدد یتیموں کی پرورش کے لئے ایک خیراتی سرمایہ کا بہم پہنچانا ...

اوّل مسئلہ جو انجمن نے ہاتھ میں لیا وہ "تخفیف مصارفِ شادی کتخدائی دختر" تھا اور اوّل مضمون جو اس نے شائع کیا وہ "رسم و رواج" پر تھا[۳] ۔ یہ مسودہ پنڈت ہرپرشاد صاحب

---

۱ التماس عجز اساس ۔ اہالی قوم کی خدمت سراپا افادت میں بغرض فکر اصلاح اسراف تزویج اطفال کے ۱۸۷۲ء ۔ ۲ تحفۂ طالب موسوم بہ گلگر کشمیر مرقومہ کرشن لال چودھری ۱۸۷۳ء ۔ ۳ یہ مسودہ اور مضمون روئداد کشمیری پنڈت ایسوسی ایشن مرتبہ ۱۸۹۱ء میں درج ہیں ۔"

کی طبع سلیم کا نتیجہ تھا اور غالباً اس وقت تک کی اس قسم کی تجاویز کے تجربہ پر مبنی تھا۔ میں پہلے لکھ آیا ہوں کہ یہ تذکرہ اس لئے چھیڑا جاتا ہے کہ آئندہ کارکنوں کو گذشتہ تجربہ سے فائدہ پہنچے۔ اس لئے واقعات پر استدلال افادت سے خالی نہ ہوگا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس مسودہ سے کوئی عملی فائدہ مترتب نہ ہوا۔ ایسا کیوں ہوا اور سب سے پہلے ایسی کوششوں کا کیا نتیجہ ہوا تھا۔ ان سوالوں کے جواب دلچسپی سے خالی نہیں۔

یہی تخفیف مصارف کا مسئلہ جب ۲۰ سال قبل معرض بحث میں آیا تھا تو اس وقت اس پر زیادہ تفصیل کے ساتھ رائے زنی کی گئی تھی۔ جس کے چند نمونے مراسلہ کشمیر کی کرم خوردہ فائل سے نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔ "صاحب دہلوی" کے "التماس عجز اساس" کے شائع ہوتے ہی اکابرین قوم نے مراسلہ میں اس پر اظہار رائے شروع کر دیا۔ جس کا قدرے انتخاب یہاں بیان کیا جاتا ہے:

"آگرہ سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"صاحب دہلوی کا ایک رسالہ طبعزاد جو متعلق بہ انسداد اسراف شادی وغیرہ ہے بندہ نے دیکھا۔ ہر چند یہ لاجواب ہے بلکہ عین ثواب ہے (خدا کرے کہ کامیاب ہو) مگر افسوس کہ بالفعل اوس سے کامیابی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں احقاق ترک رسومات میں ہادی قرار دے اور انگشت نمائی جہان سے خوف نہ کرے۔"

"پنڈت کالکا پرشاد صاحب کچلو مرحوم فرماتے ہیں:

"حقیقت میں اسراف (اصراف) شادی کے جو کچھ فی الحال ہیں، وہ اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ آیندہ آٹھ سال کے بعد ان کا نبھنا محال معلوم ہوتا ہے اور اس پر بھی قناعت نہیں ہے۔ ہر سال کچھ نہ کچھ کوئی نہ کوئی نیا صیغہ صرف زائد کا نکلتا رہتا ہے ..... لیکن آخر میں (صاحب دہلوی نے) جو تجاویز درباب تعین مقدار شادی و دیگر مراتب لکھے ہیں، وہ ایسے نہیں ہیں کہ دفعتہً اس طرح سے مقبول طبیعت جملہ صاحبان برادران قوم ہو جائیں۔ ...... مدار اس کا (یعنی دین شادی کا) منحصر اوپر بیان مستورات کے ہے اور ان کا یہ حال ہے کہ زیادتی اور نئی بات میں وہ اپنے دین دنیا کی بھلائی سمجھتی ہیں..."

رائے پنڈت اندر نرائن صاحب گرٹو مرحوم نے لکھا ہے:

"صاحب دہلوی نے الہ آباد سے حال میں جو مراسلہ بنام نہاد التماس عجز اساس کے تصنیف کیا، ناظرین پر ظاہر ہے کہ وہ ایک کیسا عمدہ مختصر و مفید امتحاناً چھاپا گیا ہے۔ اور عجب کیا کہ اگر اربابِ ہمت و دولت مُسِن و ذی شعور لوگ بدل حامی ہوں..... مگر تقسیم مدالج صرف جو انھوں نے کی ہے، اب بھی رقم کثیر معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً....

پنڈت بدری ناتھ صاحب رازداں معروف بہ نوعا تحصیلدار ضلع لاہور نے رائے دی:

"آپ پر روشن ہے کہ فضول خرچی بیاہ شادی کی بنیاد بھی زیادہ تر لکھنؤ سے اور اس سے کم دہلی سے اور اس سے کم لاہور سے اٹھی ہے پس بانی مبانی اول درجہ کا شہر لکھنؤ ہے.... الاجہاں آپ مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ دہلی میں ۱۲ ہزار روپیہ اور لکھنؤ میں ۱۴ ہزار روپیہ اور لاہور میں ۸ ہزار روپیہ لوازمہ شادی میں صرف ہوتا ہے۔ اس صورت میں لاہور والوں کو ابھی تک ۴-۶ ہزار کا بہ نسبت لکھنؤ کے اور دہلی کے فائدہ ہے۔ پس اگر صاحبان لکھنؤ و دہلی شامل لاہور کے ہو جائیں تو سرِ دست کسی قدر مفاد انہیں حاصل ہو جائے گا"

"پنڈت شیام نرائن صاحب کول اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی رائے ہے:

".... بیشک یہ اسراف (شادی) ایسا زبوں ہے جس کا بہت جلد دفع کرنا مناسب ہے۔ لہٰذا اس ہیچمداں نے مقصد مطلوبہ کے حاصل ہونے کی غرض سے ایک محضر دستور العمل مراسم شادی کا تیار کیا ہے...." (آگے چلکر اس محضر کا مسودہ درج ہے جس پر باقرار صالح دستخط ثبت ہونے تھے۔ مگر اس کا حشر نامعلوم ہے)۔

"صاحب خیر طلب از گونڈہ کی رائے بہت تفصیل و تدلیل کے ساتھ ہے۔ خلاصہ سے اس کا لطف جاتا رہے گا۔ لہٰذا بجنسہ ملاحظہ ہو۔

"پنڈت بشمبر ناتھ صاحب کول شرعہٗ تحریر می کنند کہ:

" از زمان سلف تا ایں ہنگام پُر آلام کہ نظر بر تقاریب ماضی و حال نمودہ می آید! زاں بخوبی صاف ظاہر کہ بہر دو راں سپری مدالج کو خدائی ذکور و اناث بحد و اشارات

ذیل تعین یافتہ معمول شدہ بظہور پیوستند۔ تاآن تاآن تاآن تاآق تاآق۔ و تعداد مصارف ہر قسم باہم یکدگر مغائر آمدہ۔ پس باصلاح تقرر مراتب کہ خدائی فی البدیہہ اوقات شریف را برگماشتن موجب ہرج دیگر اصلاح عادات خلاف اخلاق است۔"

"خیالاتِ ارباب دھلی بموجب ملتمسہ دھلی" ایں سخن دارند۔

قرارداد درجات دربارہ اسراف شادی اطفال وجہیہ ہا محال و دشوار است۔ باشد کہ بایں رسم شائستہ طرف وقوع گیرد، ورنہ چنانکہ میگزرد میگزرد۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ظاہر است کہ فی زماننا مردان کار مغلوب التانیث و زنان ہشیار سر غالب التذاکیر اند۔ پس ع

چگونہ حل شود ایں کار مشکل

"التماس عاصی رتن ناتھ لکھنوی"۔ (یہہ تحریر ہندوستان کے لئے سرمایہ ناز عالیجناب پنڈت رتن ناتھ صاحب سمت ۱۹۳۰ در موجد فن ناول نگاری اردو کی ہے۔ جو اول سے آخر تک موتیوں سے تولنے کے قابل ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"مثل علوم متعارفہ اظہر من الشمس ہے کہ سب اہل الرائے امراف داسراف تزویج اطفال کی طرف سے تہ دل سے متوجہ ہیں اور فضول اخراجات کی بیخ کنی میں سعی وافر اور کوشش مشکافر کر رہے ہیں.... خالی لکچروں سے کیا ہوگا۔ کچھ نہ ہوگا۔ اصل تو یہ ہے کہ وہ لوگ جن کو خدا نے پانچ اور سات نان کی مقدرت دی ہے اگر اس بارے میں پیشقدمی کریں، تو یہ رسم فوراً جاتی رہے۔ اور غریب آدمی تو اس معاملہ میں بڑے آدمیوں کی تتبع بخوشی تمام کریں گے"۔....

"رسالہ کشمیر پرکاش: تخفیف مصارف شادی کے متعلق جو کوششیں زمانہ سابق میں برروئے کار آچکی تھیں۔ اُن کی کامیابی میں جو امر سب اموروں سے بڑھ کر مانع اور مزاحم تھا وہ عورتوں کی عدم ہمخیالی تھی۔ اس لئے ارباب پنجاب نے اول اسی کی طرف توجہ کی یعنی اپنی اول رپورٹ یا اعلان کے ساتھ ہی "ایک ہندی ماہواری رسالہ کا پیما سپکٹس" شائع کردیا۔ اس رسالہ کے اغراض حسب ذیل تھیں:

"اس رسالہ میں ہندی زبان کی پیاری بول چال میں ان باتوں پر بحث کی جائے گی جن کا تشریح کرنے اور انہیں عمدہ طور پر سمجھانے کی قوم کی مستورات کو ازحد مفید ہو۔ ... یہ رسالہ نہ صرف اُن رسوم کو جو قوم پر تیرہ و تار ابر محیط کی طرح چھائی ہوئی ہیں صاف کردے گا۔ بلکہ اس پردۂ تاریک کو جو اس زمانے میں مستورات کے فہم و فکر پر پڑا ہوا ہے اور جس کی وجہ سے نہایت ضروری امور کے انجام دہی میں ہرنتا کامل واقع ہو رہا ہے، دُور کردے گا۔"

اس کے علاوہ جو کچھ اس رسالہ میں درج ہونا تھا وہ انجمن کی کارروائی تھی "اور بشرط گنجائش اُردو میں مفید مضامین متعلق قوم اور ترقی انجمن"۔ اب یہ قول بالکل صاف ہو گیا کہ کہ انجمن لاہور کے بانیوں نے اصلاح مراسم کے واقعات کی اصلیت کو پہلے سے محسوس اور دریافت کیا اور اس کی بیخ کنی کا سامان اصولی طور پر مہیا کر لیا تھا یعنی زنانہ جہالت کے دور کرنے کے لئے انہوں نے کشمیر پرکاش کی بنیاد ڈالی۔ کئی برس تک "پرکاش" جس آب و تاب سے نکلتا رہا اور جس پایہ کے مضامین اس میں شائع ہوتے رہے اس کے یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بہت پُرانا معاملہ نہیں ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس وقت پرکاش عرصۂ شہود میں جلوہ فرما ہوا تھا اس وقت ایک اور قومی رسالہ یعنی سفیر کشمیر کئی سال کی قدامت کی طاقت کے ساتھ نکل رہا تھا اور اس نے مراسلہ کشمیر کے ان بہت سے مضامین نگاروں کو اپنے گرد سمیٹا ہوا تھا جن میں استقلال اور امید کی جھلک ابھی تک قلیل قلیل باقی رہ گئی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد سفیر کا چراغ ٹمٹمانے لگا اور قومی ہوا خواہی کے پروانے پرکاش کی نئی شمع کو چراغِ ہدایت مان کر اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ ہر دلعزیزی کا پرکاش ہی کا حصہ تھا کہ نہ صرف اُس کو ہر سبھا کے آدمیوں نے اپنے اظہارِ خیالات کا مستند آرگن قرار دیا بلکہ قوم کی خواتین نے اسے اپنی تحریروں کا زیور پہنایا یہ وہ تاج ہے جو آج تک کسی اور رسالے کے سر کو نصیب نہ ہوا ہے، نہ ہوا تھا اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ مضامین انہیں امور پر تھے جو عورتوں کی ذات سے متعلق اور پرکاش کی غرض و غایت کا عین مرکز تھے۔ بیاہ کے لین دین، بوگی کی اذیتیں وغیرہ وغیرہ۔ ان سب سے بڑھ کر تاریخی حیثیت ان مضامین یا مباحثہ نے

حاصل کی جو قریباً دو سال کی مدت تک عورتوں کی تعلیم کی نسبت ہوتا رہا۔ عالمگیر دلچسپی اور خیالات کا سنجیدہ جوش و خروش جو اس مباحثہ نے پیدا کیا اپنی آپ نظیر ہے جس کی تشریح کے لئے پرکاش کے کالم صرف ایک کمزور گراموفون کا حکم رکھتے ہیں۔ ان دنوں عورتوں میں اگر کسی بات کا ذکر تھا تو اس کا اور اگر کسی گفتگو سے ملاقاتیں شروع اور ختم ہوتی تھیں تو اسی کے ساتھ۔ میری اس مباحثہ میں خاص حیثیت تھی اور میں اُن نیچی آنکھوں اور تمتماتے ہوئے چہروں کے ساتھ تقریروں کو کبھی نہیں بھولوں گا جن سے میری اندنوں کھٹوئیں بھرپور ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ تخفیف مصارف اور تعلیم نسواں سے لے کر اشتہار و مضامین شادی بیوگان اور ہندوستانی برہمن کھنڈاری تک کے مضامین نے پرکاش کے کالموں سے اشاعت و صدور پایا

.... اب نہ لاہور کی قومی انجمن ہے اور نہ بورڈنگ ہاؤس، نہ کرکٹ کلب اور نہ کشمیر پرکاش[1]:-

اِک شمع ہے دلیل سحر، سو خموش ہے

اتبدا بس، باقی ہوس

کار دنیا کسے تمام نہ کرد

برجموہن دتاتریہ"

اڈیٹوریل نوٹس کے تحت سنٹرل ہندو کالج کا بھی ذکر ہے جس میں لکھا ہے:

"سنٹرل ہندو کالج میگزین کے ساتویں سال کی رپورٹ ہمارے پاس ریویو کی غرض سے آئی ہے۔ ہم کو یہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ کالج مذکور استقلال کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ ہماری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ مدرسوں میں مذہبی یا قومی تخصیص کسی قسم کی نہ ہونی چاہئے۔ اور اسی لئے ہم کو اس دن نہایت خوشی ہوگی جس دن ہندو کالج کا دروازہ غیر ہندو طلبار

---

[1] وہ شور اشوری اس بے نمکی اور وہ گرما گرمی اس سرد مہری سے کیسے مبتدل ہوئی؟ اب کیا کرنا چاہئے۔ یہ ایسے امور ہیں جن پر عمدہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ کشمیر بھائی اس پر غور کریں۔ میں بھی بشرط فرصت کبھی اس مضمون کو اختتام پر پہنچاؤں گا۔

کے لئے کھول دیا جائے گا۔ لیکن اس خاص نقص سے قطع نظر کر کے ہندو کالج کی ترقی ہر طرح سے قابل تعریف ہے اور اس کے معاونین کی کوشش وہمت کی جس قدر ستائش وصفت کیجائے کم ہے۔ ۱۹۰۲ء میں اسکول کے طلبار کی تعداد ۳۰۹۱۔ اور کالج کے طلبار کی تعداد ۱۸۳ تھی۔

جلد ۴۔ نمبر ۷

(۱) سوشل ریفارم۔ (از کشن پرشاد کول)۔ (۲) عمل۔ (از ڈی۔ این۔ ڈی)

(۳) جسٹس راناڈے کی پونا کی مشہور و معروف تقریر (از پنڈت اقبال نرائن گرٹو)

(۴) ہندوستان جدید۔ ۳ (از کشن پرشاد کول)۔ (۵) کشمیری بچوں کی تعلیم۔ ہمارے معاصرین۔ اور دوسرے مستقل عنوانات۔ "نول کشور پریس الہ آباد میں چھپا"

'ہندوستان جدید' میں ایک پیراگراف یہ ہے:

"پہلا اخبار ہندوستانی زبان میں ۱۸۲۳ء میں بنگال سے شائع ہوا اور ہندوستان کی اخباری حالت اب تک نہایت طفولیت کے عالم میں ہے اس کی خاص وجہ ملک کی مفلسی اشتہارات کی کمی اخبارات کی زیادتی اور خاص کر نالائق ایڈیٹروں کی بھرتی ہے۔ ہندوستانی اخبارات جو انگریزی میں شائع ہوتے ہیں ان میں بعض کی اشاعت مشکل سے ....۴ تک پہنچتی ہے۔ ایک دو ہفتہ وار اخباروں کی اشاعت ....۲ تک بھی پہنچی ہوئی ہے لیکن یہ محض غیر معمولی بات ہے۔ مرہٹی میں کیسری اخبار جس کے باعث کہ دو سال ہوئے اس قدر غوغا مچا تھا اشاعت میں ....۷ سے زائد نہ تھا۔ ان اخبارات میں سے بعض میری نظر سے گذرے ہیں۔ لیکن میں نے ان کو اپنی امیدوں سے نہایت کم رتبہ پایا۔ ہندوستانی اخبار نویس اقتصادی مسئلات و تاریخی حالات سے بالکل ناواقفیت ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کے خیالات و طرز تحریر دونوں ذلیل ہیں۔ نہ اسباب و وجوہات میں منطقی دلائل کا ڈھنگ ہے نہ عبارت میں ربط و روش۔ نہ بیان میں سلاست صرف بکھرے ہوئے استعارات و مبالغات کے پیوند لگے جاتے ہیں۔ یا زیادہ تر اخبار ذاتی حملوں سے بھرا ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی اخبار نویس نیویارک و سین فرانسسکو کے اخبارات کی تقلید کرتا ہے۔"

جلد ۴ - نمبر ۸ :

(۱) ہندوستانیوں کی اخلاقی تعلیم قسط ۴ (از تربو گی ناتھ) - (۲) ہماری ضرورت تعلیم نسواں پر ایک بہن کا مراسلہ (از گمنام) (۳) تقریر پنڈت گوپی ناتھ طالب علم ہندو کالج سرینگر - (از کشن کول) (۴) رامائن کا ایک سین (نظم) (از چکبست) - (۵) خط و کتابت وغیرہ - "نول کشور پریس"

پنڈت گوپی ناتھ کی تقریر کی مندرجہ ذیل سطریں قابل ذکر ہیں :

"ہمارے قوم کے بہت سے اصحاب کا آج کل یہ خیال ہے کہ بجلی اور ریل کا کام کھلنے سے ہمارے قوم کے غریبوں کا حال بہتر ہو جائے گا - ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

یہ ناممکن بات ہے کیونکہ افسر زیادہ تر باہر سے آویں گے اور ادنیٰ اسامیاں کشمیریوں کے ہاتھ آویں گی - اور جو کچھ پیدا کریں گے وہ فقط کھانے اور کپڑے ہی پر صرف ہو جائے گا - ترقی کیا ہو گی خاک اور علاوہ اس کے یہ زمانہ مستقبل کی بات ہے - دیکھئے آگے کیا ہو - اب قوم کی مالی حالت دیکھئے -

حضرات سامعین ! ہمارے قوم کی مالی حالت بھی خاطر خواہ نہیں ہے - لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے قوم میں بہت سے دولت مند رئیس ہیں - میں یہ کہنے کو تیار نہیں ہوں - اگر ہیں بھی تو گنتی کے دو چار رئیس ہیں ، وہ بھی دولتمند نہیں ہیں - اگر ہمارے قوم کے رئیس دولتمند ہوتے تو اپنے غریب بھائیوں کی مصیبت کے وقت کچھ نہ کچھ مالی امداد ضرور کرتے - جب ۱۹۰۳ء میں سیلاب آیا تھا اس وقت کا حال میرے دل پر بخوبی نقش ہے - کسی قومی رئیس کی اتنی بڑی ہمت نہ پڑی کہ راولپنڈی یا کسی اور جگہ سے اناج لا کر اپنے غریب بھائیوں کے ہاتھ اصلی قیمت پر فروخت کرتا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے رئیس بھی خود تکلیفوں میں گرفتار ہیں - امیرا کدل - حبہ کدل - فتح کدل - زینہ کدل - عالی کدل اور مہاراج گنج پر جتنی دکانیں کپڑے کی واقع ہیں اور جن کے دکاندار ہمارے قوم کے بھائی ہیں وہ سب پنجابی ساہوکاروں کی طفیل میں ہیں - یعنی وہ سب مال پنجابی ساہوکاروں کا ہوتا ہے اور یہ فقط بطور ایجنٹ کے کام کرتے

ہیں۔ گذارہ بھر کو اچھی رقم وصول ہو جاتی ہے۔ ہمارے قوم میں ایسے کم اصحاب ہیں جنکی اپنی دکانیں ہیں۔

"اب یہی ٹھیکیداری۔ ہمارے قوم کے تھوڑے سے اشخاص ٹھیکہ داری میں دخل رکھتے ہیں۔ لیکن اس قلیل تعداد سے بھی زیادہ اشخاص قرض لے کر ٹھیکہ لیتے ہیں۔ جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ سُود میں چلا جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ نقصان ہو جاتا ہے، تو دیوالہ نکل جاتا ہے اور مکان پر قرقی کی نوبت آجاتی ہے۔

"اب رہی کرانی۔ عراف تو ظاہر ہے دن بھر بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی بھولا بھٹکا آگیا تو خیر ورنہ اللہ اللہ خیر صلاح۔ دودھ بیچنے والے اور پنساری اور نانبائی ان سب کی مالی حالت اتنی ہے جس سے کہ ان سب کا گذارہ چلا جاتا ہے۔

"ہمارے قوم کے بہت سے صاحبوں کو دکانداری کا ایسا شوق ہے کہ دو ایک نسوار کی بوتلیں۔ تھوڑے سے کپڑے دھونے والے صابون۔ دو ایک منہ دھونے والی صابون کی ٹکیاں۔ آٹھ، دس تاگے کی گولیاں اور تھوڑا سا تمباکو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی مالی حالت تو صاف ظاہر ہے اور نیز اس سب بیان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہمارے قوم کی مالی حالت خاطر خواہ نہیں ہے۔ اب تعلیم ملاحظہ ہو:

"حضرات سامعین! ہمارے قوم کی تعلیمی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ ہمارے قوم کی مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔ بہت سے طالب علم مڈل تک پڑھ کر تعلیم کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بہت سے انگریزی کی دو ایک کتابیں پڑھ کر محمد فاضل ہو جاتے ہیں اور بہت سے طالب علموں نے انٹرنس سے آگے پڑھنے کی قسم کھائی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ سٹیٹ ہائی اسکول سے گزشتہ سال دو کشمیری مسلمان لاہور کالج میں داخل ہونے کی غرض سے گئے۔ لیکن ہمارے کشمیری بھائیوں کی ابھی تک باہر جانے کی مہورت نہیں نکلی ہے۔

"کل صوبہ کشمیر میں تین ہائی اسکول ہیں (۱) اسٹیٹ ہائی اسکول (۲) مشن اسکول۔ (۳) ہندو ہائی اسکول۔ ان تینوں اسکولوں میں ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہر سال انٹرنس کے امتحان میں ہمارے قوم کے کتنے طلبا پاس ہوتے ہیں۔ اس سے تعلیم کا حال صاف معلوم ہو جائے گا۔

تین سال کا نتیجہ میں آپ کو بتا سکتا ہوں، غور کر کے سنئے:

"سنہ ۱۹۰۴ء میں انٹرنس کے امتحان میں ہمارے قوم کے قریب (۱۰) طلباء کے پاس ہوئے تھے۔

سنہ ۱۹۰۵ء " " " " " " " " (۹) " " " "

سنہ ۱۹۰۶ء " " " " " " " " (۴) " " " " "

"اگر آپ صاحبان سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ کل صوبہ کشمیر میں کتنی آبادی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کل صوبہ کشمیر میں ۱۱۵۷۳۹۴ کی آبادی ہے اور کل صوبہ کشمیر میں سناتن دھرم والوں کی تعداد ۶۰۶۸۲ ہے اور اس ۶۰۶۸۲ کی آبادی سے انٹرنس پاس شدہ طلباء کا اوسط سال میں ۸ ہے۔ اس سے ہماری قوم کی جہالت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے قوم کے لڑکوں کی تعلیم روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔"

"آپ صاحبان اس بات کو پتھر کی لکیر جانئے کہ: ؎

شدھ بدھ سے فارسی کے چلے گا نہ کام اب
دعوتوں سے اور سبیلوں سے ہوگا نہ نام اب"

خط و کتابت کے ذیل میں سکریٹری اے، ایس دھر کا طویل خط، کشمیری ریفارم ایسوسی ایشن سری نگر بابت جس کا ایک مقصد کشمیری زبان کے لئے رسم الخط بھی رواج دینا ہے۔ اڈیٹر نے اپنے نوٹ میں اُردو یا ہندی رسم الخط اپنانے پر زور دیا ہے، مکتوب نگار کا یہ پیراگراف اہم ہے:

"جناب پنڈت صاحب مکرم بندہ سلامت۔

نیاز مندی۔ واضح رائے مبارک آنجناب ہو چکا ہے کہ سری نگر کشمیر میں ایک انجمن مسمی "کشمیر ریفارم ایسوسی ایشن" قائم ہوئی ہے۔

کشمیری زبان کے لٹریچر کے پیدا کرنے میں بالخصوص کوشش کی گئی ہے چنانچہ تعلیم نسواں اسی کے ذریعہ سے دی جائے گی۔ زبان کشمیری جیسا کہ جناب کو روشن ہوگا ایک پرانی زبان ہے۔ تاریخ کشمیر میں یہ باسم "پراکرت بھاشا" موسوم ہے۔ مہا بھارت رامائن و دیگر پرانوں کے ترجمے اس زبان میں کئی سو برس کے بنے ہوئے تھے۔ اگر ان کے جمع کرنے کی کوشش

کی جاوے تو اگر یہ کلیہ بہم نہیں ہوں گے۔ پھر بھی بہت کچھ دستیاب ہو جائیں گے۔ زمانہ حال کے قصص۔ قصیدے۔ غزلیات وغیرہ اس زبان میں موجود ہیں اور کتب اخلاق و دہرم کے ترجمہ کرنے سے اُمید ہے کہ اس کا لٹریچر قائم کرنا بہت مشکل نہیں۔ خصوص جب کہ اس کی گرامر (صرف ونحو) ایک عالم فاضل کی سنسکرت ویاکرن کے اصول پر مرتب کی ہوئی موجود ہے۔ یہ سطور بدیں غرض اشاعت کئے گئے کہ بہت سے اصحاب کشمیری زبان کا اس طرح ایک تحریری زبان بنانا ایک اہم کام تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس کے فوائد کے پورے قائل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جناب کا خیال اس بارے میں انجمن کی رائے کے موافق ہے۔"

جلد ۴۔ نمبر ۹:

(۱) مسٹر دادا بھائی نوروجی کے پولیٹکل مشاغل۔ (از "پارسی") (۲) ولایتی خیالات: کول جلالی اور اقبال کشن شرغریب (از گمنام) (۳) قوم کی حالت زار (از راست گو) (۴) کشمیری بچوں کی تعلیم (۵) ہمارے معاصرین (عصر جدید، مخزن، اُردوئے معلّٰی) اور دوسرے عنوانات ضمیمہ کارروائی جلسۂ سالانہ کشمیری ینگ منس ایسوسی ایشن۔ تقاریر میں چکبست کی تقریر بھی ہے۔

جلد ۴۔ نمبر ۱۰:

(۱) کاسٹ سسٹم اور ہم (از الف۔پ) (۲) مغربی تعلیم و تہذیب کا اثر (از جگجیون ناتھ صاحب تکرو۔ (۳) برہما کے تیوہار (از مونگ چو) (۴) موجودہ حالت (از دناتریہ) —— منروا سے منقول سات صفحے کا طویل مضمون ہے اور ہندو مسلم مسئلہ پر بہت اہم تحریر ہے اور نقل کئے جانے کے لائق ہے۔

(۵) طالب علم اور پالیٹکس۔ منقول از اُردوئے معلّٰی (از طالب علم) (۶) ہمارے معاصرین (اُردوئے معلّٰی، مخزن، عصر جدید) وغیرہ۔

"کاسٹ سسٹم" والے مضمون کا پہلا پیراگراف یہ ہے:

"حال کے ایک صاحب تصنیف نے کسی کتاب میں لکھا ہے کہ اہل اسلام نے بزور شمشیر لاکھوں ہندوؤں کو مسلمان کیا۔ انگریزی عمل داری کی ایسی میٹھی چھری ہے کہ لوگ

ایا ب خاطر ہندو دین سے علیحدہ ہوئے جاتے ہیں اور قیود لازمہ اہل ہنود بلا تردد خود ٹوٹے جاتے ہیں۔ سوامی دیانند سرسوتی کا خدا بھلا کرے جس نے ہزاروں ہندوؤں کو عیسائی یا مسلمان ہونے سے بچایا اور جو ہوتے ہیں اُن کو شُدّھی کے ذریعہ سے یہ ہندو بنانے کا طریقہ نکالا۔

جلد ۴۔ نمبر ۱۱:

(۱) زبان اُردو۔ مخزن کے ایک مضمون "بیبر گوشمال" پر تنقید۔ (از حق پسند) (۲) قدامت پرستی۔ (از پنڈت دوارکا ناتھ تکو۔ (۳) ہندو مذہب (از پ۔ الف۔ک۔ ام کشمیر (۴) ہمارا سودیشی رتھ کیوں اُڑ گیا ہے (از منوہر ناتھ کول دتاترہ۔ (۵) مضمون نگار بہنوں سے ایک التجا (از ناصح)۔ (۶) سر گورو داس بنرجی (از درگا پرشاد مشران) (۷) ہمارے معاصرین (مخزن، اُردوئے معلّٰی، عصر جدید) اور دوسرے مستقل عنوانات۔

جلد ۴۔ نمبر ۱۲:

(۱) سوشل اصلاح کے متعلق مہاراجہ گیکواڑ کے خیالات۔ (از جگجیون ناتھ تکرو)۔ (۲) ہندوستان جدید، قسط ۳ (۳) پدمنی: نظم منقول از مخزن (از سرور جہان آبادی) (۴) ہمارے معاصرین (اُردوئے معلّٰی۔ مخزن۔ دکن ریویو)۔ وغیرہ۔

جلد ۵۔ نمبر ۱۔ ۱۹۰۷ء:۔

(۱) دادا بھائی نوروجی (از پنڈت برج نرائن چکبست) (۲) قدامت پرستی۔ (از پنڈت دوارکا ناتھ تکو) (۳) طالب علم اور پالیٹکس (از ابوجہل لکھنوی) (۴) شرر وسرشار (منقول از مخزن) (۵) ہمارے معاصرین اور دوسرے مستقل عنوانات۔

چکبست کا مضمون نقل کیے جانے کے لائق ہے۔

جلد ۵۔ نمبر ۲:

(۱) کلکتہ کی کانگریس پر ایک سرسری نظر (از چکبست) (۲) انڈسٹریل کانفرنس (از سیاست مدن)۔ (۳) نمائش صنعت و حرفت کلکتہ ۱۹۰۶ء (از پنڈت منوہر ناتھ سپرو (۴) انڈین سوشل کانفرنس (از رائے برج نرائن گرٹو) (۵) آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بیسواں اجلاس (از ظہور احمد) (۶) ہندوستان کی ترقی (از مہیش رام گنگا رام)

ہمارے معاصرین اور دیگر مستقل عنوانات۔

کلکتہ میں کانگریس اور ایجوکیشنل کانفرنس پر مضامین نقل کیے جانے کے لائق ہیں۔

جلد ۵: نمبر ۳:

(۱) تذکرہ قومی (از بزان ناتھ گوالیار)۔ (۲) کشمیر میں تعلیم کی اشاعت (از عبدالسلام رفیقی) (۳) ہماری موجودہ حالت (از زندہ کول)۔(۴) بہارِ کشمیر وغیرہ مستقل عنوانات۔ (۵) "تنقید" کے تحت مرزا محمد سعید کے ناول خوابِ ہستی پر طویل تبصرہ ہے، جو نقل کیے جانے کے لائق ہے۔ ایک مختصر تبصرہ بدھوا بواہ پر بھی ہے، جو ڈاکٹر مراری لال کان پوری کی مفت تقسیم ہونے والی تصنیف ہے۔ (۶) ضمیمہ میں: "پنڈت موتی لال نہرو ایڈوکیٹ ہائیکورٹ، صدر نشین جلسہ کی افتتاحی تقریر"۔

موتی لال نہرو کی یہ تقریر تمام و کمال اس مضمون کے آخر میں درج کی جا رہی ہے۔

جلد ۵ - نمبر ۴:

(۱) ماضی و حال (از پنڈت برجموہن دتاتریہ (۲) قدامت پرستی (از پنڈت دوارکا ناتھ صاحب تکو۔(۳) ایک دلچسپ مکالمہ (از مخبر سنبھل پور)۔(۴) ریفارم کی ضرورت (سری کشن گرٹو)۔(۵) بہارِ کشمیر و دیگر مستقل عنوانات (۶) 'تنقید' کے تحت دیوان چند ایم اے کی کتاب "دنیا کے ۹ مہا پرش" پر طویل تبصرہ ہے۔ اختلاف اللسان (مصنفہ وجاہت حسین صاحب جھنجھانوی۔ "بدھ دیو جی کی سوانحعمری" مصنفہ سردھ پرکاش جی، اور مکتوباتِ آزاد پر بھی تبصرے ہیں۔

پنڈت اجودھیا ناتھ کنزرو، اور پنڈت لچھن نرائن در کی تصویریں شائع کی ہیں۔ پنڈت دوارکا ناتھ تکو کے انتقال کی اطلاع دی ہے۔

مینجر "کشمیر درپن" کا اعلان کہ وہ آئندہ کشمیر درپن لکھنؤ سے شائع ہوگا۔ اس کے متعلق خط و کتابت پنڈت اقبال نرائن صاحب مسلدان بیرسٹر ایٹ لا گولا گنج لکھنؤ سے کی جاوے۔ معاصرین بھی مہربانی کر کے اپنے رسالے اور اخبار تبادلہ میں اسی پتہ سے ارسال کریں"۔

جلد ۵ - نمبر ۵ - ۶

(۱) خلاصہ تقریر رانا ڈے بہ اجلاس سوشل کانفرنس کلکتہ ۱۸۹۶ء۔ (۲) زمانہ موجودہ

کی دماغی اخلاقی اور سوشل تغیرات (پہلی قسط): (ترجمہ مضمون پنڈت بشن نرائن در۔ (۳) ماضی وحال کشامرہ (از ابوجہل۔ لکھنؤ) (۴) پھولوں کی سیر (از کشن کاک (۵) ایک کھلا خط بنام پنڈت موتی لال صاحب نہرو: موتی لال نہرو کی اسپیچ پر (از جانکی ناتھ اٹل)۔
(۶) ایک خط دیوان چند ایم اے کا ہے۔ جس میں پچھلے شمارہ کی تنقید کا جواب ہے۔ اس کے آخر میں ایڈیٹر کا نوٹ 'پنجابی اردو' پر ہے۔ (۷) دولت ہمہ از اتفاق خیزد۔ (شیام پرشاد زتشی) آزادی خیالات وافعال۔ (از ترلوکی ناتھ کول (۹) نیشنل فنڈ کیوں قائم کیا جائے اور وہ کس کام میں لایا جائے۔ (از جانکی ناتھ اٹل) (۱۰) بہار کشمیر۔ وغیرہ۔
"ماضی وحال کشامرہ" تمام وکمال نقل کئے جانے کے لائق ہے۔ لیکن صفحات کی تنگی حائل ہے۔

جلد ۵۔ نمبر ۷ ۔ ۹ :-

(۱) زمانہ موجودہ کے دماغی وسوشل تغیرات: بشن نرائن در کے مضمون کی دوسری قسط اور ہنوز ناتمام۔ (۲) تعلیم نسواں (۳) دیوالی (از جیون لال مٹو) (۴) قومی حالت زار (از رام ناتھ آغا) (۵) سودیشی (از پنڈت جیون لال مٹو) (۶) دیوالی (از پنڈت منوہر لال کول عرف کباب) (۷) سفر اورنگ آباد (از برجناتھ شرغہ) (۸) مسٹر دیوان چند ایم۔ اے اور اردو کی انشا پردازی۔ (از منوہر لال زتشی)۔ پچھلے دو شماروں میں جاری بحث کے سلسلہ میں (۹) ریویو: ارمغان دیوالی یعنی ورید وزنیتی کا ترجمہ (مانک راؤ وٹھل راؤ حیدرآبادی) (۱۰) تین سبق آموز مضمون: امریکہ کے ایک ماہوار رسالہ سے مندرجہ ذیل عنوانات پر نقل: "زندگی کیا ہے"۔ "اپنے اوپر بھروسہ کرنا کامیابی کا راز ہے" اور "مفلسی بھی ایک نعمت ہے"۔
(۱۱) اڈیٹوریل نوٹ میں کنیا پاٹ شالہ کا ذکر ہے۔ (۱۲) "ترجمہ مضمون ڈاکٹر تیج بہادر سپرو مطبوعہ ماڈرن ریویو" مضمون پنڈت بشمبر ناتھ پر ہے۔ (۱۳) رسالہ "تہذیب نسواں" کا ریویو: جو مندرجہ ذیل ہے:-

"لاہور سے ہر شنبہ کو رسالہ تہذیب النسواں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کی اڈیٹر ایک شریف بی بی صاحبہ ہیں اور عنوان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی تعلیمی حالت دیکھکر یہ امر ضرور باعثِ خوشی ہے کہ اڈیٹر رسالہ ایک خاتون صاحبہ ہیں۔ اکثر رسالے اور مضامین تعلیم نسواں کی عمدگی کے بیان میں مردوں نے چھاپے۔ مگر عورتوں میں بہت کم ان ممالک اور پنجاب میں ایسی ہیں جن کو کہ تعلیم یافتہ ہونے کا خطاب دیا جا سکتا ہو۔ مگر رسالہ زیر ریویو کی اڈیٹر چونکہ اناث میں سے ہیں لہذا بہت اطمینان کی بات ہے اور خوشی بھی ہے کہ ہمارے ملک میں اس قدر تعلیم نسواں نے ترقی کی ہے کہ وہ زمانہ بھی آگیا کہ عورتیں کارِ ایڈیٹری کو عمدہ طور پر کرنے لگیں۔ باوجود اس کے ہم انکار نہیں کرسکتے کہ ابھی بہت تعلیم کی ضرورت ہے۔ اس رسالہ میں جس طرح کے مضامین نکلتے ہیں، وہ صرف لڑکیوں کے لئے مفید نہیں ہیں۔ بلکہ سن رسیدہ عورتیں بھی، جن کی تعلیم معقول نہیں ہوئی ہے اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

"ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔ ان کے رسوم اور طریقے قدرے مختلف بھی ہیں۔ اس لحاظ سے مسلمان لکھنے والے کے خیالات ہر موقع پر ہندو لکھنے والے کے موافق نہ ہوں گے اور یہی وجہ ہے کہ رسالہ "تہذیب النسواں" میں مضامین زیادہ تر ان ہی حالات اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو کہ مسلمانوں میں موجود ہیں۔ یا ان میں پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ بہرحال جہاں تک ہم نے پڑھا ہم کو معلوم ہوا کہ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ ضرور مفید ہے اور ہر عورت کو چاہئیے کہ اس کا مطالعہ کیا کرے۔ مضامین کی زبان شستہ اور عام فہم ہے۔ کاغذ بھی برا نہیں ہے۔ لکھائی بہت صاف اور روشن ہے۔ مگر ہماری رائے میں بجائے کالم کے اگر پورا صفحہ معہ جدول ہو تو زیادہ بہتر معلوم ہو اس رسالہ کا چندہ ہے سالانہ ہے اور رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور کے مینجر صاحب کو خط لکھنے پر یہ پرچہ مل سکتا ہے۔"

لاہور سے کشمیری میگزین محمد الدین فوق نے غالباً کشمیر درپن کے توڑ میں جنوری ۱۹۰۶ء سے نکالنا شروع کیا جو ۱۹۱۱ء تک جاری تھا۔ کشمیر درپن میں اگر کشمیری پنڈت اہل قلم چھائے ہوئے تھے تو کشمیری میگزین مسلمان مضمون نگاروں سے بھرا رہتا تھا۔ درپن میں کشمیری 'ایک قوم' سمجھے جاتے تھے۔ اور اس قوم میں صرف کشمیری پنڈت شامل تھے (اِلّا ماشاءاللہ)۔

یو پی میں
انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی صوبائی کانفرنس
کا
خطبۂ صدارت

"وہ کون سی بات ہے جو دو بھائیوں کو خوشی خوشی ملنے اور پیاری ماں کی خدمت کے لئے تیار ہونے سے مانع آتی ہے؟ اس کی وجہ سوائے اس کے کہ حکام والاشان سے خوشنودی مزاج کے پروانے حاصل کئے جاویں اور کچھ نہیں ہے۔ اور جیسی جیسی ذلتیں کہ اس جدوجہد میں نصیب ہوتی ہیں اس کا حال کچھ چوٹ کھائے ہوئے دلوں سے پوچھئے۔ اے میرے مسلمان دوستو! ذرا اپنے عنایت فرماؤں سے ہوشیار رہنا۔ گو دو چار اعلیٰ عہدے آپ کے ہم مذہبوں کو مل گئے، تو کیا ہوا، بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا اس میں نفع نہیں ہے۔ بلکہ نقصان ہے۔ قومی ترقی سرکاری عہدوں کے بھروسے نہیں ہو سکتی۔ اس کا راستہ دوسرا ہے:

چھو لیا دھوکے سے دامانِ صبا تونے تو کیا
غنچۂ گل کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

ضرورت اس بات کی ہے کہ آپس کی بے اعتباری دور ہو اور دونوں جماعتوں کے لیڈر خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ مل کر کام کرنے کی کوشش کریں۔"

پنڈت موتی لال نہرو

پنڈت موتی لال صاحب نہرو ایڈوکیٹ ہائیکورٹ

صدر نشین جلسہ کی افتتاحی تقریر

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

حضرات! آپ نے صوبجات متحدہ کی پہلی پراونشل کانفرنس کا پریسیڈنٹ منتخب کرکے جو عزت مجھ کو بخشی ہے، اس کا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ساتھ ہی اس کے جب میں اپنے اردگرد ان دوستوں کو بیٹھے ہوئے دیکھتا ہوں، جن میں سے ہر ایک اپنے فرائض کو مجھ سے بدرجہا بہتر انجام دے سکتا ہے، تو مجھ کو بار بار اپنی بے بضاعتی کا خیال آتا ہے۔ لیکن میں آپ کے انتخاب کو فرمان قومی سے تعبیر کرتا ہوں اور اس کی تعمیل کو اپنے اوپر فرض سمجھتا ہوں اور محض یہی وجہ ہے کہ میں نے ایک ایسی عزت کو قبول کر لیا ہے، جس کے قابل میں اپنے تئیں نہیں سمجھتا۔

میں آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں، جو اس پہلی پراونشل کانفرنس کے منعقد کرنے میں حاصل ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ممالک متحدہ کے طرف سے کانگریس کے اجلاسوں میں شروع سے دلچسپی ظاہر کی گئی، چار مرتبہ اس قومی مجلس کو ہم اپنے صوبہ میں مدعو کر چکے ہیں۔ جہاں جہاں سالہائے گذشتہ میں کانگریس منعقد ہوئی، وہاں وہاں ہمارے صوبہ کے منتخب اشخاص نے اس کے جلسوں میں شریک ہو کر اپنے ملک اور قوم کی پوری پوری خدمت کی، لیکن ساتھ ہی اس کے ہم کو ماننا پڑیگا

کہ ان سالانہ جلسوں کی شرکت کے علاوہ اپنے خاص صوبہ کی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے ہم نے ابھی تک کچھ نہیں کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بہت سی ہماری خاص ضرورتیں ملک کی عام ضرورتوں کے ساتھ مشترک ہیں۔ لیکن چاہے ضرورتیں عام ہوں یا خاص، مقامی انجمنوں اور مقامی جلسوں کے فائدے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

نیشنل کانگریس کا جلسہ سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس قومی مجلس کا جلسہ سال میں ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاید آپ جانتے ہوں گے کہ انگریزوں کی ایک فطری خاصیت ہے کہ یہ لوگ نہ جلدی سنتے ہیں اور نہ جلدی سمجھتے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ جب کانگرس کا شور و غل ان کے کانوں تک پہنچتا ہے، تو یہ حضرات ایک دفعہ چونک پڑتے ہیں اور ان میں سے اکثر سوچنے لگتے ہیں کہ ہو نہ ہو کچھ دال میں کالا ہے، لیکن قبل اس کے کہ وہ ہمارے اغراض و مطالب کو پوری طرح سے سمجھ سکیں، کانگریس کا اجلاس ختم ہو جاتا ہے اور سال بھر کے لئے پھر خاموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ میرے اس کہنے سے آپ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں کانگریس کی کوشش کو بیکار یا بیسود خیال کرتا ہوں، کانگریس کو بیشک دو صیغوں میں ایک معقول حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے، اوّل ہمارے اہل ملک کو بیدار کرنے میں اور دوسرے حکام وقت سے چند اصلاحوں کے حاصل کرنے میں۔ اگر اس دوسرے صیغے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، تو میرے لئے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل انگلستان کی توجہ ہماری طرف پوری طور سے مبذول نہیں ہوئی ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے کہ انگلستان کے لوگوں کی نیت بخیر ہے اور یہ عقیدہ صرف میرا ہی نہیں، بلکہ میرے ان تمام ذی وقار ہم وطنوں کا بھی یہی خیال ہے، جنہوں نے انگلستان جا کر خود اپنی آنکھوں سے وہاں کے لوگوں کو دیکھا ہے۔ جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، اہل انگلستان بات کو ذرا دیر میں سمجھتے ہیں۔ لیکن جہاں ایک مرتبہ بات ان کے سمجھ میں آگئی پھر کوئی شخص ان کو حق بات کہنے اور کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ البتہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اگر آپ ان کو کوئی بات سمجھانا چاہتے ہیں، تو اس کو بار بار صبح سے شام تک ان سے کہتے رہیے۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ علاوہ انڈین نیشنل کانگریس کے ہم ہر صوبہ میں اور اگر ممکن ہو تو ہر ضلع میں چھوٹی چھوٹی کانگریسیں منعقد کیا کریں، چاہے اس میں ہم کو محض ایک ہی بات کو بار بار دہرانا پڑے۔ لیکن ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ علاوہ ان مشترک اغراض کے جن کا ذکر ہر کانگریس اور کانفرنس میں ہوتا ہے، ہر صوبہ کے متعلق کچھ نہ کچھ خاص

ضروریات اور تجاویز ہوتی ہیں، جو مقامی ہونے کی وجہ سے انڈین نیشنل کانگریس میں پیش نہیں ہو سکتیں اور جن کے طے کرنے کے لئے پروانشل کانفرنسوں کا ہونا ضروری ہے۔ اِن دو فوائد کے علاوہ تیسرا فائدہ اس تحریک کا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے ملک میں پولیٹکل تعلیم پھیلتی ہے۔ ہم میں سے جن لوگوں کو کانگریس سے قبل کا زمانہ یاد ہے وہ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں پولیٹکل مسائل کا چرچا محض برائے نام تھا۔ اِس کے برخلاف آج دیکھئے کہ ہر طرف سے پولیٹکل تحریکوں کی صدا آرہی ہے۔ اِس عظیم تغیر کے کیا باعث ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم کی اشاعت نے ایک حد تک اس کام میں مدد دی ہے، لیکن کیا ہم بغیر کانگریس کی ایسی مجلس کے اپنے مشترکہ اور مجموعی اغراض کا یکجائی اظہار کر سکتے تھے؟ کیا بغیر کانگریس کے قومیت کا پاکیزہ خیال ہندوستانیوں کے دلوں میں جگہ پا سکتا تھا؟ وہ کونسی قوّت ہے جس نے ہماری پولیٹکل زندگی کے چھوٹے چھوٹے چشموں کو مجتمع کر کے آج اتنا بڑا بحرِ ذخّار بنا دیا ہے کہ جس کی صولت کا ہمارے کافرے کا فرنکتہ چیں تک کو اقرار کرنا پڑتا ہے؟ اس قوت کا نام کانگریس ہے۔ میں انڈین نیشنل کانگریس کو عملی پالیٹکس کے صیغہ میں ہندوستان کا قومی دارالعلوم خیال کرتا ہوں۔ کانگریس تو اپنا کام کر رہی ہے لیکن اس کام کے تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ کانگریس کے ماتحت مختلف صوبوں میں مقامی انجمنیں قائم کی جائیں اور اس لئے میں آپ کو پروانشل کانفرنس کے انعقاد پر مبارکباد دیتا ہوں۔

لیکن جس طرح کہ کانگریس سال میں ایک مرتبہ ہونے کی وجہ سے ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ہے، وہی حال پراونشل کانفرنسوں کا بھی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ نہ کچھ کام برابر سال بھر تک ہوتا رہے۔ اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب ہر سال کانفرنس میں ایک سنٹرل کمیٹی مقرر کی جاوے۔ اور ہر ضلع میں ایک ایک مقامی انجمن اس غرض سے منعقد ہو کہ وہ اپنے ضلع کے حالات اور ضروریات سے برابر سنٹرل کمیٹی کو مطلع کرتی رہے۔ کچھ دن ہوئے ان صوبہ جات میں ایک انجمن یونائٹیڈ پروانسز ایسوسی ایشن کے نام سے اسی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ لیکن یہ انجمن کچھ شروع ہی میں بجھی سی ہوئی تھی، اس طرح کی کارروائی سے اب کام نہیں چل سکتا۔ کیا یہ ہماری ذلت نہیں ہے کہ پروانشل کانفرنسیں اور صوبوں میں برسوں سے قائم ہیں۔ لیکن اس کا افتتاح ہمارے یہاں آج ہو رہا ہے؟ اگر ہم اپنی سستی دور کر کے اب بھی کام کرنے کے لئے کمربستہ نہیں ہو سکتے، تو یہ کانفرنس محض بازیچۂ اطفال ہے۔ لیکن جس جوش اور خلوص کا اظہار آج ہو رہا ہے اس سے مجھے یقین ہوتا ہے

کہ دوسرے صوبہ جات کی طرح ہمارے صوبہ کے باشندے بھی اب واقعی بیدار ہو چلے ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ ہم نہ صرف اس کانفرنس اور اس کی کمیٹیوں کو مستحکم اور مضبوط بُنیاد پر قائم کریں گے۔ بلکہ اپنی کوشش اور محنت سے اس کمی کو پورا کریں گے جو کہ دیر سے کام شروع کرنے سے پیدا ہو گئی ہے۔

گو ہم نے کام دیر سے شروع کیا ہے تاہم اس کانگریس کے لئے یہ ایک فال نیک ہے کہ اس کا افتتاح ایک ایسے حاکم کے عہد میں ہوتا ہے کہ جس کے دورِ حکومت میں ہم کو ہمدردی اور ترقی حاصل کرنے کی پوری پوری امید ہے اور اس لئے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ان صوبہ جات کی جانب سے اس اجلاس میں سر جان ہیوٹ صاحب بہادر کا خیر مقدم کروں۔ سر جان ہیوٹ کا زمانۂ ملازمت سنہ ۱۸۷۷ء میں انہیں صوبہ جات میں شروع ہوا تھا اور گو اُس وقت وہ یہاں صرف سات برس ادنیٰ عہدوں پر متعین رہے تاہم میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جن لوگوں پر ان کو آخر میں حکومت کرنا تھا اُن کے لئے اسی وقت سے ان کے دل میں ہمدردی شروع ہو گئی تھی۔ سر جان ہیوٹ سنہ ۱۸۸۴ء میں ان صوبہ جات سے نکل گئے اور اب کئی ایک اعلیٰ او معزز عہدوں پر کام کرنے کے بعد وہ ہمارے صوبہ میں لفٹیننٹ گورنر ہو کر تشریف لائے ہیں ایسے عالی دماغ اور تجربہ کار مدبر سے ہم صرف یہی نہیں امید کرتے ہیں کہ وہ ایک منتظم حاکم ہوگا، بلکہ ہم کو یہ بھی امید ہے کہ اُس کے زمانۂ حکومت میں انصاف سے کام لیا جاوے گا۔ ہماری پہلی کانفرنس کا ایک ایسے دورِ حکومت کے شروع میں افتتاح ہونا ایک اچھا شگون ہے۔ ہماری نئی کانفرنس اور یہ نیا دَورِ حکومت، دونوں ہونہار نظر آتے ہیں، اور مجھے قوی امید ہے کہ اپنے اپنے ادائے فرض میں دونوں اس طرح کاربند ہوں گے کہ ایک کو دوسرے سے نفع اور تقویت حاصل ہو گی۔

اب مجھ کو ان فرائض کے متعلق عرض کرنا ہے جن کو یہ کانفرنس ادا کرے گی۔ جہاں تک کہ کسی گورنمنٹ یا کسی انجمن کو امورِ عامّہ کا تعلق ہے، سب صاحب اُس سے واقف ہیں اور مجھ کو اس کے متعلق بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور طریقۂ کار کے متعلق کچھ کہنا میرا فرض ہے۔ آپ لوگ اس اختلاف سے واقف ہوں گے جو کہ ہمارے گروہ میں چند روز سے پیدا ہو گیا ہے اور جس کی نسبت کہ میں مختصر طور سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ملک میں آج کل ایک جدید فرقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جو غیر معتدل اصول کی پیروی کرتا ہے اور

جو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے زبردست اور ناپسندیدہ طریقے عمل میں لانا چاہتا ہے۔ اس کا نام لوگوں نے فریقِ گرم رکھا ہے اور معتدل گروہ فریقِ نرم کے نام سے موسوم ہے۔ الہ آباد کے طلبہ میں اکثر فریقِ گرم کے پیرو موجود ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آنریبل مسٹر گوکھلے کے حکیمانہ اقوال اور نیک صلاح پر ان اصحاب نے کچھ نہ کچھ غور کیا ہوگا۔ لیکن ہنوز ہم اپنے طریقِ عمل پر تمام و کمال متفق نہیں ہیں۔ حضرات! اس وقت میری یہ خواہش نہیں ہے کہ میں ان اصحاب کو اپنا ہمخیال بنانے کے لئے آپ صاحبوں کے سامنے وعظ دوں۔ یہ کام اُن اصحاب کا ہے جو مجھ سے زیادہ قابل اور لائق ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مسٹر گوکھلے سے زیادہ فائق واعظ معتدل اصولوں کا نہیں ہو سکتا۔ میں ہرگز اس امر کا ادعا نہیں کر سکتا کہ اس مسئلہ کے ہر پہلو کو میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کر سکتا ہوں جیسا کہ انہوں نے اپنے بلیغ اور مدلل لیکچروں میں حال ہی میں ان صوبجات کے مختلف حصص میں بیان فرمایا ہے۔ میرے لئے یہ کہنا کافی ہوگا کہ میں اپنے غیر معتدل احباب کے اکثر و بیشتر اصولوں سے متفق نہیں ہوں، اور یہ کہ میں نہایت خلوص کے ساتھ امید اور یقین کرتا ہوں کہ میرے اہل ملک کی کثیر جماعت ایسا ہی کرے گی۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں غیر معتدلین کو موجودہ کیفیات اور علل کا فطری نتیجہ سمجھتا ہوں۔ وہ تحریک جس کے وہ محرک ہیں، بنگال میں پیدا ہوئی۔ جہاں گذشتہ چند سالوں کے رنجیدہ واقعات نے ایک بڑے گروہ کو قعر ناامیدی میں گرا دیا ہے۔ یہ گرم اور معتدل فریق اسی ناامیدی کا خلق کیا ہوا ہے اور یہ نتیجہ ہے ان مصنوعی اسباب کا جن سے زبردستی رعایا کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ میرے خیال میں فریقِ گرم کی پیدائش سے آثارِ زمانہ کا اظہار ہوتا ہے، اور اس سے گورنمنٹ اور رعایا دونوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ ایک طرف تو اس فریق کی موجودگی اس بے چینی کا پتہ دیتی ہے جو اس وقت سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے اور دوسری طرف اس کا طرزِ عمل ثابت کرتا ہے کہ ناامیدی اور یاس کے جوش میں جو طریقہ کام کرنے کا تجویز کیا گیا ہے، وہ ایک نوعمر اور ہونہار قوم کے شان کے ہرگز شایاں نہیں ہے۔ میرا مطلب اس جگہ فریقِ گرم کے چند خاص اطوار سے ہے۔ کیونکہ ان کے بعض طریقے جائز، پسندیدہ اور ہر محبِ وطن کے اختیار کرنے کے قابل ہیں۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ باوجود نقائص کے ہمارے گرم دوست ہمارے لئے ترقی اور بہبودی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہی ہوتا ہے کہ وہ نئی روح جو آجکل ہماری قوم میں پھونکی جا رہی ہے

قائم رہے گی۔ لوگ جوش و خروش کے ساتھ ناپسندیدہ طریقے اختیار کرتے جاویں گے اور ناپسندیدہ طریقوں پر کارروائی کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان نئے طریقوں کا ذکر مجھ کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ جہاں تک سودیشی کا تعلق ہے مجھ کو یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اس طریقے کو اختیار کرنا ہر حبیب وطن کا فرض ہے۔ بقول مسٹر گوکھلے کے سودیشی کے اعلیٰ ترین معنی ہیں وطن کا پُر جوش اور کامل عشق۔ ظاہر ہے کہ ایسی سودیشی سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے۔ انگریز تو اس کے ہرگز ہرگز منکر نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ خود پکے سودیشی ہیں۔ اگر آپ انگلستان جایئے تو وہاں ریلوے اسٹیشنوں پر تھیٹروں کے باہر گاڑیوں پر، غرض کہ ہر چیز پر لکھا ہوا ملے گا "اپنے ملک کی چیزیں خریدو" اور آجتک کسی انگریز کی، حتیٰ کہ لارڈ کرزن کی بھی یہ ہمت نہیں پڑی کہ وہ سچی اور خالص سودیشی کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکالیں۔ بلکہ وہ لوگ اور ان میں لارڈ کرزن بھی شامل ہیں بار بار سودیشی کی امداد کا وعدہ کرتے رہے ہیں۔ سودیشی کا خیال تو ہمارے ملک میں عرصہ سے موجود ہے لیکن اس نئی تحریک نے جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے اس میں ایک نئی رُوح پھونکی ہے، اور اس کے اثر سے ملک کے مختلف حصص میں بہت سے نئے کارخانے کُھل گئے ہیں اور دستی حرفتوں کی ترقی کی از سرِ نو فکر ہونے لگی ہے۔ اس نئے جوش کے ساتھ نئے نئے کارخانے ہمارے ملک میں قائم ہوں گے، ملک کی خام پیداوار بجائے ملک کے باہر جانے کے ملک کے اندر ہی رہے گی، اور آخر کار ہم ایک نہ ایک دن اس قابل ہوں گے کہ غیر ممالک کے لوگوں سے تجارت میں کُھلے بندوں مقابلہ کر سکیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بدیشی چیزوں کی آمد تب ہی قطعی بند ہو سکتی ہے جب سودیشی چیزیں اُن سے اچھی اور سستی بننے لگیں، جب ہم اس قابل ہو جاویں گے، تو بدیشی چیزوں کی آمد روکنے کے لئے بائیکاٹ کی کوئی ضرورت نہ رہے گی اور ہم کو اپنے اغراض حاصل کرنے کے لئے ناپسندیدہ اور ناجائز طریقے استعمال نہیں کرنے پڑیں گے۔ یہ ہے وہ ترقی کا معیار جس کے لئے ہر ہندوستانی کو کوشش کرنی چاہیئے اور جہاں تک اس کے حصول میں فریق گرم مدد دیتا ہے، وہاں تک میں اس کا مشکور ہوں لیکن جب وہ سودیشی سے گذر کر بائیکاٹ کی اشاعت شروع کرتا ہے، تو مجھ کو مجبوراً اُس کا ساتھ چھوڑ دینا پڑتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں بائیکاٹ سودیشی میں شامل ہے۔ اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ

سودیشی اور بائیکاٹ ایک حد تک مشترک ہیں، کیونکہ سودیشی اشیاء کے استعمال کے معنی یہی ہیں کہ غیر ممالک کی چیزیں خریدنے سے پرہیز کیا جائے۔ لیکن بائیکاٹ کے اصلی معنی یہ نہیں ہیں اور نہ ہمارے دوست اس لفظ کو محض ان معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ بائیکاٹ کو ان لوگوں نے دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اوّل تجارتی، دوم پولٹیکل۔ اگر آپ محض تجارتی بائیکاٹ کا خیال کیجیے تو اس سے سودیشی تحریک کو کچھ نہ کچھ مدد ملتی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کیا حبّ الوطنی کے پاک اور روحانی جذبہ کی جس پر سودیشی کا دار و مدار ہے۔ ذاتی قوّت کافی نہیں ہے کہ ہم اس میں دشمنی اور عداوت کے ادنیٰ جذبوں کو شریک کرتے ہیں؟ اگر واقعی حالت یہ ہے تو مجھ کو یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ ساری دنیا کی خصومت اور دشمنی سودیشی تحریک کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ آپ کا جوش قوانینِ قدرت پر غالب نہیں آسکتا، یہ قدرت کا مسلمہ قانون ہے کہ کشاکشِ حیات میں قوی، کمزور پر غالب آتا ہے۔ اگر ایک بالشت بھر کا بونا، چاہے اس کے دل میں دنیا بھر کی عداوت اور خصومت بھری ہوئی ہو، ایک تنکا لے کر ایک ایسے دیو سے مقابلہ کرنے کو کھڑا ہو، جو اچھے سے اچھے اسلحۂ جدید سے مسلح ہو تو اس کا حشر کیا ہوگا؟ انگریزی مال کے بائیکاٹ کے یہ معنی ہیں کہ آپ دنیا کی سب سے بڑی تجارتی قوّت سے، جو اس وقت آپ پر حکمراں بھی ہے، مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر یہ کہنا کہ چونکہ آپ کے دل میں خصومت اور عداوت کے جذبے بھرے ہوئے ہیں اس لئے آپ اپنے ننھّے ننھّے کرگھوں اور ٹوٹے پھوٹے کارخانوں کے زور سے انگریزی تجارت کو مٹا دیں گے، بچّوں کی سی باتیں کرنی ہیں۔ میں اس جوش اور ایثار کی قدر کرتا ہوں جو لوگوں کو اپنے ملک کی خراب اور مہنگی چیزوں کو غیر ممالک کی عمدہ اور سستی چیزوں پر ترجیح دینے پر آمادہ کرتا ہے، اور ایسے لوگوں کی تعداد میں جہاں تک اضافہ ہو اچھا ہے۔ لیکن ذرا ان صوبجات کی آبادی کا خیال کیجیے اور پھر سوچیے کہ ان کروڑوں آدمیوں کے مقابلہ میں ان چند ہزار کی تعداد کیا ہے جو اس قسم کے ایثار سے کمربستہ ہو سکتے ہیں؟ اگر آپ ایسا کریں گے، تو آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ بائیکاٹ کے ذریعہ سے بدیسی مال کی درآمد نہیں رک سکتی۔ بڑے بڑے شہروں میں آپ کو چند آدمی ایسے مل جاویں گے جو اس قسم کے ایثار پر تیار ہوں لیکن بدیسی اشیاء اب ہر ضلع کے دور افتادہ قصبہ اور گاؤں میں پہنچ گئی ہیں اور روزانہ کھپنے کی بات ہے کہ ان کے سب سے زیادہ

استعمال کرنے والے عوام النّاس ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے جب تک عوام میں بھی ایثار کا وہی ہی جوش نہ پیدا ہو جیسا کہ اُس جان نثار جماعت میں ہے جس کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے اس وقت تک کوئی بیّن کمی مال در آمد میں نہیں ہو سکتی۔ ہم اور آپ دونوں ہی اس امر سے خوب واقف ہیں کہ جماعت عامّہ کو افلاس کی بیماری نے ایسا تباہ کر رکھا ہے کہ وہ باوجود اپنی دلی خواہش کے ایسا نہ کرنے پر مجبور ہیں۔

ابھی اس امر کو بہت زمانہ باقی ہے کہ کسی دیہاتی کے قلب پر یہ بات نقش کی جا سکے کہ اُسے اپنے ملک کے فائدہ کی غرض سے لنکاشیر کی بنی ہوئی دھوتی لینے سے پرہیز کرنا چاہیئے، اور اپنے خاندان کی اشد ضروریات پر ترجیح دے کر دیسی اشیاء پر اپنی گاڑھی کمائی کا زیادہ تر حصّہ صرف کرنا چاہئے۔ خیر یہ بھی سہی، ہم ایک قدم اور بڑھ کر تھوڑی سی دیر کے لئے مانے لیتے ہیں کہ ایک معمولی ہندوستانی گنوار کو آپ ایسا یقین دلانے میں کامیاب ہو بھی گئے۔ مگر تب اس سوال کا جواب کیا ہوگا کہ کیا رسد اُس طلب کے لئے کافی بھی ہو گی جسے ہم یوں معرض وجود میں لاتے ہیں؟

حضرات! کسی تجارتی کاروبار کی کامیابی تجارتی ہی اصول پر منحصر ہے اور سیاسی اصول کا اس میں دخل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ انسانی فطرت برقرار ہے وہی تاجر کامیاب ہوگا، خواہ اُس کے سیاسی اصول اور اُس کی قومیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، جس سے خریدار کو اپنی قیمت کے معاوضہ میں سب سے اچھی اور سستی چیز وصول ہوتی ہے۔

علاوہ بریں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسا صنّاع اپنی کاریگری میں کچھ ترقی نہ کرے گا جس کی بھونڈی اور بھدّی اشیاء غیر مکمل ناقص اوزاروں سے بنی ہوئی آسانی سے فروخت ہو جایا کرتی ہیں۔ اس کی آزادی سے سرپرستی کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ آپ نہ صرف اپنی کاریگری اور اپنی ساختہ اشیاء کو دائماً ناقص رکھنے میں مدد دیں گے۔ بلکہ اُس سے اس کی قوتِ محرکہ کو بھی چھین لیں گے محض جس پر اُس کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ حضرات جو سودیشی اور بائیکاٹ کے توسّل کے قائل ہیں۔ اول الذکر تحریک کے مقصد اور غرض کو بھولے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے قول کے مطابق بطور ایک سیاسی اسلحہ کے استعمال کیا گیا ہے اور تجارتی کاروبار سے اس کی کچھ غرض نہیں۔ آنریبل مسٹر گوکھلے نے اپنی صدارتی تقریر میں بمقام بنارس بائیکاٹ کو ایک

ایسے سیاسی حربہ سے جو ایک خاص غرض کے حصول کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تعبیر کیا تھا، اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ نظر بر واقعاتِ موجودہ ہمارے بنگالی احباب اپنے اس فعل کے لئے معذور ہیں۔ واقعات موجودہ کی تشریح انہوں نے یوں فرمائی تھی:

"ہم سب جانتے ہیں کہ جب ہمارے بنگالی بھائیوں کو یہ معلوم ہوا کہ سابق وائسرائے کو کوئی چیز تقسیم بنگالہ سے باز نہیں رکھ سکتی اور اخبارات اور لکچروں میں اس کا اظہار بیزاری ان کی سب عرضداشتیں بحضور معروض الیہ و سکریٹری ہند و پارلیمنٹ بیکار ہیں اور یہ کہ گورنمنٹ اپنی جابرانہ قوت ان کے دلی جذبوں کو کچلنے اور ان کو نقصان پہنچانے میں صرف کرے گی، اور کہیں سے کسی قسم کا بچاؤ ان کو نہیں مل سکا، تو مجبوراً و بالآخر انہوں نے تحریک بائیکاٹ سے کام لیا۔ اس کانگریس میں مسٹر سرنیدرو ناتھ بنرجی و دیگر مقررین نے ایسی ہی تقریریں کیں اور اس تمام بحث کا نتیجہ ذیل کی تجویز کی شکل میں ظاہر ہوا۔ تجویز ہوا کہ یہ کانگریس نہایت زور سے اپنی بیزاری کا اظہار اُن جابرانہ کارروائیوں کے خلاف کرتی ہے جو حکام نے بنگالہ میں اس وقت کیں جب کہ وہاں کے باشندے بدیسی اشیاء کے بائیکاٹ پر بطور آخری اظہار بیزاری مجبور ہو گئے تھے اور اُن کے لئے کوئی مناسب و جائز وسیلہ اہل انگلستان کی توجہ گورنمنٹ ہند کی حرکات کی طرف مائل کرنے کا باقی نہیں رہا تھا۔"

حضرات! اب ایک لحظہ کے لئے آپ یہ سمجھ لیں کہ موجودہ گورنمنٹ الہام سے متنبہ ہو کر سابق گورنمنٹ کی اس بڑی بھاری ناانصافی سے واقف ہو جائے، جو ہمارے بنگالی بھائیوں کے ساتھ کی گئی ہے اور تقسیم بنگال کے حکم کو منسوخ کر دے کیا ایسی صورت میں ہمارے بنگالی بھائیوں کا یہ فرض نہ ہو گا کہ وہ بائیکاٹ سے درگذر کریں؟ اور پھر سودیشی تحریک کا کیا حشر ہو گا جب کہ وہ اتنی بڑی حد تک بائیکاٹ پر منحصر ہے؟ یا تو اس کا وجود بغیر بائیکاٹ کے ممکن ہے یا ناممکن ہے۔ اگر ناممکن ہے تو کیا آپ سودیشی تحریک کو جس کی بنیاد خالص عمیق اور محیط محبّ وطن پر ہے حصولِ انتقام پر قربان و نثار کر دیں گے؟ بائیکاٹ کا منشا جیسا کہ مسٹر سرنیدر ناتھ بنرجی نے بیان

کیا ہے صرف اہل برطانیہ کی اس لاپروائی کے خلاف جو ان میں ہندوستانی اُمور سے رہا کرتی ہے ناراضی کا اظہار کرنا ہے۔ اگر یہ غرض حاصل ہوگئی تو ایمانداری اس بات کی مقتضی ہوگی کہ اس کو بند کر دیا جائے اور اس کے خاتمے کے ساتھ ہی سودیشی کی ساری عمارت کا خاک میں مل جانا لازمی ہے۔ لیکن اگر سودیشی بعد تنسیخ تقسیم بنگالہ کے بغیر بائیکاٹ کے معرض وجود میں رہ سکتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ سودیشی ملت محبت وطن کی سب سے اعلیٰ تخیل کا نتیجہ ہے اور یہ ذرہ برابر بھی بائیکاٹ پر منحصر نہیں ہے۔ آخر الذکر اگرچہ ایک نہایت عمدہ قومی سیاسی آلہ ہو۔ مگر تاہم وہ ادنیٰ خواہشات نفرت وانتقام سے منتج ہے، تجارتی واقتصادی حیثیت سے سودیشی اور بائیکاٹ کا کوئی تعلق نہیں ہے، واحد اور سچا ذریعہ سودیشی تحریک کی مدد کا یہ ہے کہ ملکی حرفتوں اور صنعتوں کو زمانۂ جدید کے مطابق ترقی دی جائے، ہم کو اپنی ساری قوتیں اس میں صرف کرنی چاہئیں اور ہمارے مہاجنوں کو نئے کارخانے قائم کرنے اور ملکی اجناس خام کو ملک کے اندر ہی صرف کرنے کے تدابیر میں روپیہ خرچ کرنا چاہیئے۔ ایسے پرانے زمینداروں اور تعلقہ داروں کو جن کے پاس اب بھی سونا چاندی بہت گڑھا ہوا ہے اپنے مال و دولت کو نکال کر اس طرح صرف کرنا چاہیئے کہ انہیں اور اُن کے وطن دونوں ہی کو فائدہ پہنچے، کیونکہ ایسے باہمت اور اولوالعزم اصحاب کی تعداد بہت ہی قلیل ہے: جو اپنے وطن کی محبت میں اپنی دولت خرچ کر ڈالیں۔ ہم اپنے ملک میں ایسے دارالصناعات بنادیں، جن میں ہمارے نوجوان کو جدید صنعت وحرفت کی تعلیم وتربیت دی جائے۔

حضرات! اس قسم کے چند اصلی اور واقعی طریقے ہیں جن کی مدد سے سودیشی کی بُنیاد مستحکم ہو سکتی ہے۔ آپ اس تحریک کو چند روزہ کے غصہ اور جوش سے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ جس سے ایک جھوٹی خواہش تو پیدا ہو جاوے گی لیکن علت کے معدوم ہونے پر وہ خود بھی غائب ہو جاوے گی۔ ہماری اصلی مشکل کچھ تو ہمارے ہی اہل ملک بالخصوص دولتمند حضرات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور کچھ سرکار سے کافی مدد ابتدائی اور صنعتی تعلیم کی توسیع کے نہ ملنے سے بائیکاٹ ہماری خفیہ قوتوں کو بیدار نہیں کر سکتی اور ہندوستانی اہل دُوَل کے پرانے تعصب کو دور نہیں کر سکتی۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی وجہ سے سرکار کی ہمدردی بالکل مفقود ہو جائے گی۔ پھر میں سمجھ نہیں سکتا کہ سودیشی کے مقدس دعویٰ کو اس کی کیا ضرورت ہے اور کیا حاجت ہے۔

اب ہمیں اِس مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ کیا ان صوبہ جات میں ہم کو بائیکاٹ کی بطور سیاسی حربہ کے، ضرورت ہے؟ اور کِن کِن صورتوں میں بائیکاٹ کا استعمال جائز ہے؟ ہم متذکرہ بالا ہر دو بزرگوں کے بجنسہ الفاظ اس سوال کے جواب میں نقل کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر سر بیندر ناتھ بنرجی فرماتے ہیں:

"بائیکاٹ ایک سیاسی حربہ ہمارے قبضہ میں ہے اور ہم اشد ضرورت پر اس کے استعمال پر آمادہ ہیں۔ مگر اس وقت کہ جب اور سب کوششیں بیسود ہو چکی ہوں اور عوام الناس کی کافی اور قوی رائے اس کے استعمال کو جائز اور اس کی کامیابی کو یقینی قرار دے۔"

مسٹر گوکھلے فرماتے ہیں:

"ایسے حربہ کو خاص خاص اوقات کے لئے رکھ چھوڑنا چاہیئے۔ اس کی ناکامیابی نہایت پُرخطر ہے اور کامیابی کے لئے عوام میں غیر معمولی جوش و خروش کی ضرورت ہے۔ جب بائیکاٹ کا استعمال کیا جائے گا: تو جن کے خلاف بائیکاٹ ہوگا ان سے ضرور دُشمنی پیدا ہوگی اور کوئی شخص بلا خاص اور اشد ضرورت کے ایسے جذبوں کے پیدا کرنے کی ذمّہ داری نہیں لے سکتا۔"

حضرات اب آپ ذرا اس مسئلہ پر غور فرمائیے کہ ہمارے صوبہ میں کوئی ایسی خاص اور اشد ضرورت ہے کہ جو ہم کو گورنمنٹ کے خلاف ایسا خطرناک حربہ استعمال کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے کہ جس سے ہم کو زخمی ہونے کا اندیشہ ہے؟ کوئی صاحب مجھ کو یہ بتلائیں کہ اس صوبہ میں عوام میں وہ غیر معمولی جوش و خروش گورنمنٹ کے خلاف کہاں ہے کہ جس کے بھروسہ پر بہی خواہانِ ملک اس پُرخطر طرزِ عمل کے اختیار کرنے کی صلاح دیں؛ جس سے فریقِ ثانی کے دلوں میں غصّہ اور دشمنی پیدا ہونا لازمی ہے؟ یہ ضرور ہے کہ ہم کو گورنمنٹ سے اکثر شکایتیں ہیں ہماری جائز اور ضروری درخواستوں پر توجّہ نہیں کی جاتی اور ہمارے ساتھ حکّام کا سلوک اچھا نہیں ہوتا۔ لیکن ہم نے ان شکایات کے دُور کرنے کی اب تک کیا تدابیر کیں ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ سوائے کانگریس میں چند تجاویز پاس کر دینے کے ہم نے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ پس ہم کو کیا حق ہے کہ ہم باقاعدہ اور جائز طریقوں سے بیزاری ظاہر کر کے بائیکاٹ ایسے ناپسندیدہ طریقے کے پیچھے دوڑیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اپنے صوبہ میں کوئی ایسی خاص شکایت نہیں ہے، تو کیا ہم کو اہلِ بنگال سے ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے اس طریقے کو اختیار کرنا چاہیے؟ میں اس موقعہ پر اس سوال پر بحث نہیں

کرنا چاہتا کہ اہلِ بنگال کا یہ فعل کہاں تک معقول اور قابلِ تعریف ہے ؟ مگر ان لوگوں نے جو کچھ کیا ہے، اپنی پوری ذمہ داری محسوس کرکے کیا ہے اور اُن کا بیان ہے کہ ان کے صوبہ میں عوام میں اس قدر جوش و خروش موجود ہے کہ جو اس طریقے کو عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ہمارے یہاں تو جوش و خروش عامہ، جس کی موجودگی کامیابی میں شرط ہے، عنقا ہے اور جب یہ کیفیت ہے تو ہم اس حربہ کے استعمال سے اہلِ بنگال کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ ہمارے لئے بائیکاٹ کا طریقہ جاری کرنا پتھروں سے سر ٹکرانا ہے۔ ہندوستان کے کسی اور صوبہ نے اس شکل میں بنگال سے ہمدردی نہیں ظاہر کی ہے اور ہمارے لئے بھی یہی بہتر ہے کہ ہم بالفعل اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ صوبوں کی تقلید کریں۔

میں نے ابھی تک یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بائیکاٹ اس "نرم" صورت میں بھی (جس کو کانگریس کی دو پچھلی اجلاسوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے) ہمارے صوبہ کے لئے مناسب نہیں ہے، لیکن فریق گرم جس بائیکاٹ کا وعدہ کرتا ہے وہ اس "نرم" بائیکاٹ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کا مطلب بائیکاٹ سے محض تجارتی بائیکاٹ نہیں ہے بلکہ وہ ہر انگریزی چیز کو بائیکاٹ کرنے کی صلاح دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم گورنمنٹ کا انتظام چلنے نہیں دیں گے۔ کبھی یہ بزرگ مزاحمتِ مجہول (Passive Resistance) کا ذکر بھی کرتے ہیں جو معلوم تو اس قدر معنی خیز ہوتا ہے مگر دراصل بالکل بے معنی ہے۔ لیکن جب آپ سے یہ کہا جاتا ہے کہ گورنمنٹ سے کوئی تعلق نہ رکھئے تو اس میں ایک نازک سا فرق بھی نکالا جاتا ہے، اور وہ یہ کہ محض اعزازی عہدوں کو چھوڑنے کی صلاح دی جاتی ہے۔ لیکن فرائض حُب الوطنی کے ادا کرنے کے لئے تنخواہ اور ماہیہ کی رکاوٹ کیا معنی۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ اگر طوائف الملوکی کے ساتھ آسودگی ہو تو طوائف الملوکی اس امن سے بہتر ہے جس کے ساتھ افلاس موجود ہو۔ لیکن بھلا کوئی ان سے یہ پوچھے کہ طوائف الملوکی کی حالت میں سوائے چور ڈاکوؤں کے آسودہ حال کون ہو سکتا ہے ؟ یہ بیانات اس قدر لغو ہیں کہ زبان سے نکلتے ہی ان کی تردید خود بخود ہو جاتی ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ ایسی لغویات سنجیدگی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں۔ میں تو یہ صاف صاف کہتا ہوں کہ میرا تو ملک کی اس حالت پر خیال کرتے ہوئے دل دہلتا ہے جبکہ سب سرکاری اور امدادی اسکول اور کالج بند ہو جاویں گے، میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ ٹوٹ جاویں گے اور ہماری مجالس واضعان قانون میں ایک بھی ہندوستانی نظر نہ آوے گا۔ اس وقت ہماری کیا حالت ہوگی "ناگفتہ بہ"۔ جو کچھ ہماری حالت

انگریزوں کی حکومت کے شروع میں تھی، جب کہ اسکولوں میونسپل بورڈوں اور کونسلوں کے ہندوستانی ممبروں کا وجود بھی نہ تھا، یہ حالت اُس حالت سے خراب ہوگی۔ یہ یاد رکھئے کہ جو کچھ ہمکو پچھلے سو برس میں ملا ہے اس کا ہم کو نہایت بیش بہا معاوضہ دینا پڑا ہے۔ اگر ہم ان چیزوں سے بلا سوچے سمجھے دستکش ہو جاویں گے، تو بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں طرح ہمارا سخت نقصان ہوگا۔ اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ گو سودیشی کا کشادہ پیشانی سے خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ لیکن بائیکاٹ ایسے پُر خطر حربہ کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیئے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تحریک کو جائز اور پسندیدہ طریقوں تک محدود رکھیں، میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ان صوبجات میں ہم کو اپنا کام گورنمنٹ کے ساتھ ہمدردی اور اس کی نیت پر بھروسہ رکھ کر شروع کرنا چاہیئے۔

حضرات! میں گورنمنٹ کا طرفدار نہیں ہوں اور نہ گورنمنٹ کا وکالت نامہ میرے پاس ہے۔ میں آپ سے یہ ہرگز نہیں کہتا کہ آپ ذلت اور کمینہ پن کے ساتھ گورنمنٹ کی خوشامد کیجئے۔ آپ مرد ہیں اور مردانگی آپ کا جوہر ہے۔ آپ اپنے حقوق کے مالک ہیں اور ان حقوق پر آپ کو مردانگی کے ساتھ قائم رہنا چاہیئے۔ آپ کو جو کچھ شکایتیں ہیں ان کو مردانگی کے ساتھ بیان کرنا چاہیئے، جو اصلاحیں آپ چاہتے ہیں ان کو بیان کرنے میں اور نیز عملی جامہ پہنانے میں جرأت، ہمت اور استقلال سے کام لینا چاہیئے حق بات کہنے اور کرنے میں کسی کا خوف نہ کیجئے، اس کا مرتبہ کتنا ہی اعلیٰ ہو۔ حق کی قوت پر بھروسہ کیجئے اور اس کو نہ چھوڑیئے، چاہے اس کے پیچھے جان ہی کیوں نہ جاتی رہے۔ اپنے دل میں ارادہ کر لیجئے کہ آئندہ ہندوستان کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے دیں گے۔ اور اس ارادہ کو پورا کرنے کے لئے قوت اور قابلیت کہیں باہر سے نہیں پیدا ہوگی۔ بلکہ رفتہ رفتہ آپ ہی کے سرشت سے پیدا ہوگی بشرطیکہ آپ اس کے واسطے تیار ہوں۔ جس قوت اور قابلیت کا میں نے ذکر کیا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ حکام کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ حاکم وقت سے مؤدبانہ برتاؤ کرنا مردانگی کے خلاف نہیں ہے۔ ہماری جو کچھ شکایتیں ہیں ان کے اصلاح کی فکر ضرور ہونی چاہیئے مگر ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انگریزی حکومت میں ہم کو بہت سی برکتیں بھی حاصل ہوئی ہیں، جو کہ اس کے پیشتر ہم کو نصیب نہیں تھیں، مثلاً ہم سب پبلک کے جلسوں میں جمع ہو کر حکام وقت پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں ہم کو چاہیئے کہ جو حقوق زمانہ گذشتہ میں ہم کو مل چکے ہیں اس کے لئے شکر گذار ہوں اور انصاف اور حق پسندی کے

اصولوں سے قوت مزید حاصل کر کے آئندہ اور حقوق طلب کریں۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ ہماری پہلی کانفرنس ہے اگر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنا کام گورنمنٹ سے ہمدردی کے ساتھ شروع کیجئے، تو اس کے محض یہ معنی ہیں کہ آپ گورنمنٹ کے ساتھ شرفا کا برتاؤ کیجئے۔ ہم اپنی پولیٹکل تحریک میں جائز اور صحیح طریقے برتنے چاہتے ہیں اور ہمارا منشا یہ ہے کہ حکام وقت کے ذریعہ سے اصلاحیں عمل میں لائی جاویں۔ اس حالت میں ہم کو گورنمنٹ سے قدم قدم پر سابقہ ہے۔ حکامِ وقت بھی آخر انسان ہیں اور ان کا یہ امید کرنا کہ آپ کو دبا نہ اور معتدل طریقے سے اپنی خواہشوں کا اظہار کریں گے کچھ بے جا نہیں ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو حقوق طلب کریں وہ جائز اور مناسب ہوں اور آپ کا طرز گفتگو جادۂ اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔ جب وکیل زیادہ شور و غل مچاتا ہے، تو جج فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس کا مقدمہ کمزور ہے۔ یہ تو آپکو ماننا پڑے گا کہ حکومت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ گورنمنٹ بھی اپنی دقتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہے اور اس کا منشا ہے کہ جس طرح آپ یہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ آپ کی دقتوں کو محسوس کرے اسی طرح آپ کو اس کی دقتیں بھی محسوس کرنی چاہئیں۔ جو کچھ کہ میں نے آپ کے سامنے گورنمنٹ اور رعایا کے تعلقات کی نسبت بیان کیا ہے اس کا اطلاق خصوصاً اس وقت ہماری کانفرنس اور ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ پر ہوتا ہے۔ ہماری کانفرنس نئی ہے اور ہمارے صوبہ کا حکمراں بھی نیا ہے اور ابھی تک کوئی صریح اور متین پالیسی ایک نے دوسرے کے خلاف یا موافق اختیار نہیں کی ہے۔ میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آپ اپنی کارروائی میں یا اپنی تجاویز میں کوئی بات ایسی نہ کیجئے کہ جس سے گورنمنٹ خواہ مخواہ آپ سے بھڑک جاوے۔ گورنمنٹ کو موقع دیجئے کہ وہ آپ کی مدد کرے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ کی امیدوں کی برآری نہ ہو، تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ اپنے حقوق کے حصول کے لئے پوری کوشش اور جدوجہد کیجئے۔ ساتھ ہی اس کے یاد رکھئے کہ اگر جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ آپ کو اپنی زندگی میں نہ ملے، تو یاس کا کوئی سبب نہیں ہے۔ اپنی اولاد کے لئے آپ بہترین ورثہ بھی چھوڑ سکتے ہیں کہ جو پیڑ آپ لگاتے ہیں، وہ اس کے زمانے میں بارآور ہو۔ میں پھر آپ سے بصد ادب کہوں گا کہ تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ناجائز نہیں بلکہ جائز طریقے اختیار کیجئے۔ مردانگی کو نہ کہ بدتہذیبی کو کام میں لائیں۔ اپنی عزت کا مگر ساتھ ہی دوسرے کی عزت کا بھی خیال رکھئے۔

ہیں سودیشی اور بائیکاٹ کی بحث کو اس قدر طول نہ دیتا اگر آج کل ملک میں ان کا اس قدر چرچا نہ ہوتا۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنی پہلی پراونشل کانفرنس میں ان دونوں مسائل کے متعلق اپنی رائے کو صاف صاف ظاہر کر دیں۔ میں نے اپنی رائے آپکے سامنے بیان کر دی:

اب مان نہ مان تو ہے مختار

اب میں آپ کی توجہ ایک ایسے مسئلہ کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں جس کو میں خصوصاً ان صوبجات میں اور تمام مسائل سے زیادہ ضروری خیال کرتا ہوں اور یہ ہندو و مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا مسئلہ ہے۔ اس اتحاد سے جیسا کچھ نفع ہوگا اس سے کبھی کسی نے انکار نہیں کیا ہے۔ اصولاً تو ہر شخص اس کے ماننے کے لئے تیار ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے واجبی اور جائز تعلقات کا اظہار سر سید احمد خاں مرحوم نے نہایت پسندیدہ پیرایہ میں ذیل کے الفاظ میں کیا ہے:

"ہندو اور مسلمان، ہندوستان کی دو آنکھیں ہیں، اگر ایک کو ضرر پہنچے گا، تو دوسرے کو بھی کچھ نہ کچھ نقصان ہوگا۔"

ایک دوسرے موقع پر بھی صاحب موصوف نے اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ:

"ہندو و مسلمانوں کو مل کر کام کرنا چاہیئے۔ اگر متفق ہو کر رہیں گے، تو ایک دوسرے سے مدد پہنچے گی، ورنہ دونوں پر تباہی آوے گی۔"

یہ سچ ہے کہ بعد میں سر سید احمد خاں صاحب نے کانگریس سے مخالفت کی تھی۔ لیکن میں نے ان کی جس رائے کا اوپر ذکر کیا ہے اور جس کا اظہار انہوں نے ۱۸۸۴ء میں کیا تھا اس کی صداقت میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔

ہز مجسٹی امیر کابل ابھی تھوڑے دن ہوئے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ان کی عزت جیسے کہ مسلمانوں نے کی ویسے ہی ہندوؤں نے کی۔ اس مشرقی بادشاہ نے جس فراخدلی کا اظہار کیا اس پر کسی مغربی حکمران کو ناز ہو سکتا ہے۔ ہز مجسٹی امیر کابل نے ایک آن واحد میں کل معاملہ کو سمجھ لیا اور بار بار ہندو مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق پر زور دیتے تھے۔ کلکتہ میں انہوں نے پشتو کا ایک شعر پڑھا تھا جس کے معنی ہیں کہ "کوئی گلی کوچہ، کوئی جگہ ایسی نہیں کہ جہاں ہندو و مسلمان مل کر نہ رہ سکتے ہوں۔"

اس شعر کا جو کچھ مطلب ہے ظاہر ہے۔ اس قول کی صداقت اظہر من الشمس ہے۔ لیکن افسوس

یہ ہے کہ ہم ایسے کام کرنے والے نہیں پاتے اس اعلیٰ قول پر عمل کرنے میں اور اس اعلیٰ خیال کو عمل میں لانے کے لئے کوشاں ہوں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ مجھ کو مجبوراً قبول کرنا پڑتا ہے کہ گو مجھے اس بات کا یقین اعتقاد کے درجہ تک ہے کہ ہندوستان قعرِ ذلت سے نکل کر ضرور ترقی کرے گا اور گو ناامیدیوں سے میں جلدی گھبراتا نہیں ہوں تاہم جس وقت میں ہندو مسلمانوں کے نفاق کے اصلی اسباب پر غور کرتا ہوں اس وقت صبر و استقلال اور امید کا دامن مجھ کو اپنے ہاتھوں سے چھوٹتا نظر آتا ہے۔ اکثر اوقات حق بات کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ موجودہ حالت دونوں گروہوں کے لیڈروں کے لئے باعثِ شرم ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ جو کچھ کشیدگی ہے وہ جہلا کی جہالت کا نہیں، بلکہ تعلیم یافتہ اصحاب کی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ کسی گاؤں میں جائیے آپ ہندو مسلمانوں کو ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھیں گے۔ اس کے برخلاف بڑے شہروں میں تعلیم و تہذیب کے اثر سے ظاہری برتاؤ تو آپ اچھا پاویں گے لیکن ذرا سے غور کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک کو دوسرے کی طرف سے بے اعتباری ہے اور ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے کہ فریق مخالف کسی سازش کی فکر میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کیفیت کا اثر عوام پر بھی پڑتا ہے کیونکہ بہت سی باتوں میں عوام خواص کے مطیع ہوتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہلا میں بعض وقت جنگ و جدل تک نوبت آ جاتی ہے۔

لیکن گو میں نے لیڈروں کو اس معاملہ میں قصوروار ٹھہرایا ہے تاہم میں گورنمنٹ کے حکام کو بالکل بے قصور نہیں کہہ سکتا۔ ۱۷ مارچ ۱۹۰۷ء کو زمینداران بنگال کے سالانہ جلسہ میں مہاراجہ صاحب دربھنگہ نے اسی خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا:

> "ہم اس بات کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتے کہ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے (گو دراصل یہ غلط ہی کیوں نہ ہو) کہ کہیں کہیں حکام کے طرف سے ہندوؤں کو مسلمان سے اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے لڑانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

ممکن ہے کہ یہ کوشش ہر جگہ جان بوجھ کر نہ کی جاتی ہو۔ لیکن ان صوبجات میں ہم ایسے کلکٹروں، کمشنروں حتیٰ کہ لفٹننٹ گورنروں سے واقف ہیں کہ جو اپنے زمانۂ حکومت میں ہندو یا مسلمانوں کی طرفداری کرتے تھے اور کرتے ہیں، اور جن کے حرکات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں بُعد روز

بروز بڑھتا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ایسا بدنیتی سے کرتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں کی پرانی تاریخ تہذیب اور علم و ادب میں بہت سی ایسی باتیں ہیں کہ جو قابلِ ستائش و تعریف ہیں، ممکن ہے کہ کسی حاکم کو ان میں سے ایک کے علم و ادب کے تحصیل کرنے کا شوق ہو اور اس وجہ سے اس کو ایک خاص گروہ سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہو۔ ممکن ہے کہ کسی حاکم نے محض عدل اور انصاف لپسندی کے بنا پر بلا تفریق مذہب و ملت محض قابل اور لائق اشخاص کو ان کی قابلیت اور لیاقت کا صلہ دینا چاہا، لیکن اس فعل سے بلا اس کے ذاتی ارادے کے ایک گروہ کو بمقابلہ دوسرے گروہ کے زیادہ نفع پہنچا ہو، یہ ناممکن ہے کہ کسی حاکم کا تقرر ایسے حاکم کی جگہ پر ہوا ہو جو ہندوؤں کا طرفدار مشہور تھا اور اس نئے حاکم کو بار بار یہ سنایا گیا ہو کہ مسلمانوں کی امیدیں اس کی ذات سے وابستہ ہیں اور آخر کار وہ یہ سنتے سنتے مسلمانوں کا طرفدار ہو گیا ہو۔ جہاں تک ان حکام کی ذات کو تعلق ہے یہ باتیں قابلِ اعتراض نہیں معلوم ہوتیں، لیکن رعایا کے دلوں میں اس قسم کی اعانت اور مخالفت سے دشمنی اور حسد پیدا ہوتا ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو حکام کی طرفداری سے واقعی فائدہ کسی گروہ کو نہیں ہوتا ہے۔ اگر ایک گروہ کو دو چار عہدے زائد مل گئے یا کوئی برائے نام رعایت اس کے ساتھ کر دی گئی تو اس سے نہ تو اس گروہ کی اصلی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ گروہ مخالف کی واقعی ترقی رک سکتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک عام حاکم ہندوؤں کا طرفدار ہو اور اس کے بعد دس حکام نے مسلمانوں کی اعانت کی تب بھی قانونِ مساوات کے مطابق چند سال میں لیکھا ڈیوڑھا برابر ہو جاوے گا اور آخر میں دونوں کی حالت وہی ہو جاوے گی جو اعانت اور مخالفت شروع ہونے کے قبل تھی۔ یہ سب کچھ صحیح لیکن آئینۂ دل میں زنگِ کدورت باقی رہتا ہے اور خصومت و عداوت کا خمیازہ نسلاً بعد نسلاً ہم کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس سب کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری نوکری کے معاملہ میں ہم ادھی ناسمجھی سے کام لے کر ایک دوسرے سے جھگڑا کرتے ہیں اور ان حکام کو جنہیں ہندوستان کے متحد اور متفق دیکھنے کی زیادہ خواہش نہیں ہے، مسرور کرتے ہیں۔ میری رائے میں سر ہنری کاٹن نے اپنی کتاب "نیو انڈیا" (ہندوستانِ جدید) میں جو کچھ اس مسئلہ پر لکھا ہے اس سے اس مرض کی جڑ کا پتہ لگتا ہے۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں:

"سر سید احمد کے سے ذی عقل آدمی نے فوراً محسوس کیا کہ جس پولیٹیکل تحریک سے حکام ناراض ہوں اس کی مخالفت کر کے ایک قلیل جماعت قومی نفع حاصل کر سکتی

ہے اور یہ سمجھ کر انہوں نے اپنی پوری قوت اس قومی تحریک (یعنی انڈین نیشنل کانگریس) کی مخالفت میں صرف کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ہم مذہبوں کے ایک گروہ کثیر نے ان کے مشورہ پر کاربند ہونا پسند کیا۔"

کوئی ایسی پالیسی جو مصلحتِ وقت پر مبنی ہو، دیرپا نہیں ہو سکتی۔ لیکن شروع شروع میں حکامِ وقت کے طرف سے جس طرح کانگریس کی مخالفت کی گئی ہے اس کو خیال کر کے سر سید احمد ایسے ذی ہوش ہنڈنگ کو بھی ایک حد تک ہم معذور خیال کر سکتے ہیں۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ہے کانگریس کی پولیٹکل تحریک کے جواز پر موجودہ سکریٹری آف اسٹیٹ اور دوسرے انگریزی مدبروں کی مہر لگ چکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے پرانے عنایت فرما اینگلو انڈین اخبارات وہی پرانے راگ الاپے جاتے ہیں، اور جب پرانے فرسودہ دلائل بیان کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو تلوار کی آنچ کی دھمکی دینے لگتے ہیں۔ لیکن ان صاحبوں کی "ایڈیٹرانہ" تلوار کی آنچ ہماری نظروں میں وہی وقعت رکھتی ہے، جو ان کے قلم سے نکلا ہوا زہر۔ ہندوستان میں آج کل مختلف قسم کی وبائیں پھیلی ہوئی ہیں اینگلو انڈین اخبارات کا شمار بھی انہیں میں ہے۔ اینگلو انڈین اخبارات کو چھوڑ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عموماً انگریز چاہے وہ سرکاری نوکر ہوں یا نہ ہوں، کانگریس کی تحریک کو جائز اور واجب خیال کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جس چیز نے سر سید احمد کو کانگریس کی مخالفت پر آمادہ کیا تھا وہ اب نہیں ہے۔ سر سید کے شاگرد بیس برس سے اسی پالیسی پر چل رہے ہیں لیکن آج بھی ان کی پولیٹکل حالت ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے ہی دن تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ جہاں تک پولیٹکل تحریک سے پرہیز کرنے کا تعلق ہے ہمارے مسلمان احباب بھی سر سید کے مشورہ پر کاربند ہونے کو آمادہ نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنا کعبہ الگ بنانا شروع کیا ہے اور اسلامی کانگریس کے ذریعہ سے وہی حقوق اب طلب کئے جاویں گے جن کو ۲۲ برس سے مانگتے مانگتے ہندوؤں کا گلا بیٹھ گیا ہے۔ یہ سب کچھ صحیح اگر مسلمان اصحاب اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس میں نہ شریک ہوں گے۔ اس اسلامی کانگریس کا نام "آل انڈیا مسلم لیگ" ہے۔ لیکن بقول شیکسپیئر کے گلاب کا نام آپ کچھ ہی رکھیے رنگ و بو میں فرق نہیں آ دے گا۔

- دین اک ایمان ہے جس کو ہم ترنم تار کہتے ہیں
 کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنار کہتے ہیں

اصلیت یہ ہے کہ جیسا میں اوپر عرض کر چکا ہوں جن اسبابات نے سر سید کو مصلحتِ وقت کا

لحاظ کرکے چند روز کے لئے "خاموشی" کی پالیسی قائم کرنے کی ترغیب دی تھی، وہ اسباب اب موجود نہیں ہیں اور سرسید کی پالیسی آزمائش کے بعد غلط ثابت ہو چکی ہے، پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ساری آزمائشوں کے بعد بھی آپ اس بات کے روادار نہیں ہیں کہ "ہندوستان کی دو آنکھوں" میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی پیدا ہو؟ وہ کون سی بات ہے جو دو بھائیوں کو خوشی خوشی ملنے اور پیاری ماں کی خدمت کے لئے تیار ہونے سے مانع آتی ہے؟ اس کی وجہ سوائے اس کے کہ حکام والاشان سے خوشنودی مزاج کے پروانے حاصل کئے جاویں اور کچھ نہیں ہے۔ اور جیسی جیسی ذلتیں کہ اس جدوجہد میں نصیب ہوتی ہیں اس کا حال کچھ چوٹ کھائے ہوئے دلوں سے پوچھئے۔ اے میرے مسلمان دوستو خدا اپنے عنایت فرماؤں سے ہوشیار رہنا۔ اینگلو انڈین اخبارات اس وقت اپنی مطلب کے لئے تمہاری خوشامد کر رہے ہیں ان کے فقرے میں کہیں نہ آجانا یہ یقین رکھئے کہ جس دن آپکے گروہ میں اصلی قومی زندگی کے آثار پیدا ہوں گے اسی دن آپ کو بھی "تلواروں کی آنچ" کی دھمکی دی جاویگی۔ گو دو چار اعلیٰ عہدے آپکے ہم مذہبوں کو مل گئے، تو کیا ہوا بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا اس میں نفع نہیں ہے۔ بلکہ نقصان ہے۔ قومی ترقی سرکاری عہدوں کے بھروسے نہیں ہو سکتی۔ اس کا راستہ دوسرا ہے: ؎

چھو لیا دھوکے سے دامانِ صبا تونے تو کیا — غنچۂ گل کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

ضرورت اس بات کی ہے کہ آپس کی بے اعتباری دور ہو اور دونوں جماعتوں کے لیڈر خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ مل کر کام کرنے کی کوشش کریں۔ جس دن یہ ہوا اسی دن ہندوستان کے سارے مسلمان اور ہندو شیر و شکر ہو جاویں گے اور اتفاق کی قوت ان کو ایسا قوی بنا دے گی کہ دنیا دیکھ کر عش عش کرے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا اور مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے اسی طرح لڑتے جھگڑتے رہے، تو وہ کبھی اس قعر ذلت سے نہیں نکل سکیں گے جس میں کہ اس وقت دونوں پڑے ہوئے ہیں۔

زمانہ گذشتہ میں جو کوششیں دونوں جماعتوں کے لیڈروں کو یکجا کرنے کی، کی گئیں، وہ بیسود ثابت ہوئیں۔ مثلاً ۱۸۹۵ء میں شاہزادہ سر جہان قدر مرزا محمد واحد علی بہادر نے کونسل میں سوال کرکے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ لوکل گورنمنٹوں کو ہدایت کی جاوے کہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد و اتفاق بڑھانے کے لئے مختلف شہروں میں کمیٹیاں مقرر کریں۔ گورنمنٹ کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا گیا تھا کہ گورنمنٹ کا کام ملک میں امن و امان قائم رکھنا ہے ہندو و مسلمانوں میں اتحاد پھیلانے

ان کے لیڈروں کا کام ہے، تاہم گورنمنٹ کی طرف سے خصوصاً ممالک مغربی و شمالی میں مذہبی اختلافات دُور کرنے کی غرض سے لوکل کمیٹیاں قائم کی جارہی ہیں۔

جو کچھ گورنمنٹ نے مذہبی اختلافات پر کہا تھا، وہی پولیٹکل اختلافات پر بھی صادق آتا ہے مجھ کو نہیں معلوم کہ ان لوکل کمیٹیوں کا کیا حشر ہوا، اور ان کو اپنے کام میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی بہرحال اس وقت اس قسم کی کمیٹیاں موجود نہیں ہیں اور مذہبی جھگڑوں کے دور کرنے کے لئے ان کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ خوش قسمتی سے مذہبی جھگڑے روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن اگر اس قسم کی کمیٹیاں یا انجمنیں پولیٹکل اختلافات کے دُور کرنے کے لئے قائم ہوں تو ان سے بہت کچھ فائدہ کی امید ہو سکتی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اپنی اسپیچ کے شروع میں کانفرنس کے متعلق لوکل کمیٹیاں قائم کرنے کی رائے دی ہے، ہر ضلع کے ہندو اور مسلمان لیڈروں کو ان کمیٹیوں میں شریک ہونے کی دعوت دی جا سکتی ہے اور یہی کمیٹیاں اتحاد و اتفاق کا آلہ بن سکتی ہیں۔ بشرطیکہ جو لوگ ان میں داخل ہوں، وہ داخل ہوتے وقت اس بات کا صدق دل سے وعدہ کریں کہ مذہبی اختلافات و تعصبات کو کمیٹی سے دور رکھیں گے۔

یہاں تک تو کچھ زیادہ دقت نہیں ہے۔ اصل مشکل اس وقت پڑتی ہے جب کہ ہندو مسلمانوں کے پولیٹکل اختلاف پر غور کیا جاتا ہے۔ اختلاف زیادہ تر دو معاملوں کی نسبت ہے اول سرکاری نوکری دوسرے کونسلوں، میونسپل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں ممبروں کا انتخاب۔ یہ سب تو مانتے ہیں کہ سرکاری کام بہترین طریقے سے اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ لائق سے لائق آدمی جو مل سکتے ہوں نوکر رکھے جائیں۔ اسی بنا پر ہندو چاہتے ہیں کہ امتحان مقابلہ سرکاری ملازمت کا ذریعہ قرار دیا جاوے۔ مسلمان اس کے خلاف دو اعتراض کرتے ہیں، اوّل یہ کہ مقابلہ کے امتحان میں ہر طرح کی قابلیت، لیاقت کا پورا پورا اظہار نہیں ہو سکتا اور دوسرے یہ کہ مسلمان ہندوؤں سے تعلیم میں پیچھے ہیں۔ پہلا اعتراض صحیح ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ امتحان مقابلہ گو ناقص ہے تاہم امیدواروں کی لیاقت دریافت کرنے کا کوئی طریقہ اس سے بہتر آج تک دریافت نہیں ہوا ہے۔ انگلستان میں سرکاری ملازمت کے لئے اور نیز انڈین سول سروس کے لئے یہی طریقہ رائج ہے۔ رہا دوسرا اعتراض، اس کے متعلق مجھ کو یہ عرض کرنا ہے کہ مسلمان ہندوؤں سے اتنے پیچھے نہیں ہیں، جتنا کہ وہ سمجھے ہیں۔

ممکن ہے کہ وہ ہندوؤں کے بالکل برابر نہ ہوں، لیکن وہ روز بروز ترقی کر رہے ہیں، ان میں اچھے اچھے مدبّر، جج اور مقنّن پیدا ہو چکے ہیں۔ ابتدائی تعلیم میں ہندو اور مسلمان دونوں یکساں پیچھے ہیں ان صوبجات کی پچھلی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں دس ہزار میں ۱۹۷، اور مسلمانوں میں ۱۸۲ ایسے ہیں جو پڑھ لکھ سکتے ہیں۔ دس ہزار میں پندرہ کا فرق کچھ بھی نہیں ہے۔ اصلی فرق دونوں گروہوں کی تعداد میں ہے۔ اگر ہم ان صوبجات کی آبادی کو لیویں تو دس ہزار میں ۸۵۲۲ ہندو اور ۱۴۱۲ مسلمان اور باقی جین، سکھ، آریہ اور بدھسٹ ہیں، جن کو اگر سچ پوچھیے تو ہم ہندوؤں میں شامل کر سکتے ہیں۔ دونوں جماعتوں کی جب تعداد میں اس قدر فرق ہے، تو اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی تعداد کیونکر برابر ہو سکتی ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی تعداد ضرور مسلمانوں سے زیادہ ہوگی۔ اس وجہ سے نہیں کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے ہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ پس امتحان مقابلہ کے خلاف جو دوسرا اعتراض پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی کچھ وقعت کے قابل نہیں ہے۔ جو تناسب اس وقت فریقین کے تعلیم یافتہ گروہوں کی تعداد میں قائم ہے وہ ہمیشہ قائم رہے گا اور امتحان مقابلہ کے لئے جتنے مسلمان آج تیار ہیں تعداد کا لحاظ کر کے اس سے زیادہ تیار کبھی نہیں ہو سکتے۔ اور جتنا ہی جلد وہ ہندوؤں کے ہم آواز ہو کر مقابلہ کے امتحان کی اجرا کی کوشش کریں، اتنا ہی ملک کے لئے بہتر ہے۔ نامزدگی کا طریقہ جو آج کل جاری ہے اس کے معنی محض یہ ہیں کہ سرکاری نوکری میں خاص خاص حکّام کے آوردوں کی بھرتی کی جاوے۔

اور پھر یہ بھی سوچیے کہ ملازمت سرکاری سے کسی قوم کا بیڑا پار نہیں ہو سکتا، اب وقت آگیا ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی توجہ دوسرے شعبوں کی طرف مائل کریں۔ سرکاری عہدوں کی تعداد اتنی بھی تو نہیں ہے کہ اگر وہ محض ایک ہی جماعت کے لوگوں کو دیئے جاویں، تو اس جماعت کے کُل تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے کافی ہوں۔ اس لئے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو یا تو وکالت، ڈاکٹری اور دیگر علمی پیشوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، یا صنعت اور حرفت کے میدان میں قدم رکھنا چاہیئے۔ اگر کام کرنے والا ہو تو اس میدان میں ابھی بہت گنجائش ہے۔ سرکاری عہدوں کے لئے جھگڑنے میں جو وقت اور قوت صرف ہوتی ہے، وہ اگر کسی اچھے کام میں لگائی جاوے، تو اس سے کچھ نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں کو اس معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ رعایت کرنی چاہیئے۔ اس دقیق مسئلہ

کا حل یوں ہی ممکن ہے کہ دونوں طرف سے رعایت کا خیال پیدا ہو اور دونوں کو ایک دوسرے کا پاس خاطر مدنظر ہو۔ امتحان مقابلہ کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمانوں کی خاطر سے ہر دو فریق کے لئے ایک خاص تعداد سرکاری عہدوں کی مقرر کردی جائے۔ مگر یہ تبھی ہو سکتا ہے جب ہندو اور مسلمان لیڈر نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو کر اس کے طے کرنے کی کوشش کریں۔ ایسے موقع پر ہندوؤں پر فرض ہوگا کہ وہ ملازمت سرکاری کے معاملہ میں آبادی کے تناسب پر زور نہ دیں اور مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ آبادی کے تناسب کا خیال رکھ کر مساوات کا خیال چھوڑ دیں۔

دوسرا سوال کونسلوں کے ممبروں کے انتخاب کے متعلق پیدا ہوتا ہے، اور اس کے لئے بعض ہمارے مسلمان دوستوں کے بڑے بڑے دعوے ہیں۔ ان کی طرف سے یہ خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ نہ صرف مسلمان ممبروں کے انتخاب کے لئے مسلمانوں کی انتخاب کرنے والی جماعتیں الگ مقرر کی جاویں بلکہ باوجود آبادی کے بیّن فرق کے ہندو مسلمان ممبروں کی تعداد مساوی رکھی جاوے۔ یہ ضرور ہے کہ جس گروہ کی تعداد کم ہو اس کے حقوق کی حفاظت کا خاص طور سے خیال رکھا جانا چاہیئے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے انتخاب کا اصول اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ جس گروہ کی آبادی زیادہ ہو اس کے حقوق کو کم تعداد والے گروہ کے مقابلہ میں قربان کر دیا جاوے۔ اس موقع پر اس مسئلہ کی بحث فضول ہے۔ کیونکہ یہاں اس صوبہ کے مسلمان لیڈر موجود نہیں ہیں اور ان کی غیر حاضری میں کوئی نتیجہ اس مباحثہ سے پیدا نہیں ہو سکتا، میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ یہ بھی بآسانی طے ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہندو اور مسلمان لیڈر ایک جگہ جمع ہو کر خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اس کے طے کرنے کی کوشش کریں۔

حضرات! اب تک میں نے آپ کے عزیز وقت اور گراں بہا توجہ پر مداخلت بیجا ایسے امور کے متعلق کی ہے، جنہیں اندرونی یا داخلی کہہ سکتے ہیں۔ میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے ہم اپنے گھر کا انتظام درست کریں اور اس کے بعد خارجی اصلاحات شروع کی جاویں۔ آپ نہایت قابلیت کی تقریریں، مختلف تجاویز کی تائید میں جو کانفرنس کے سامنے پیش ہوں گی، سنیں گے، اس لئے میں نہایت ضروری مسائل زیر غور پر اس وقت مختصر سی بحث کرنا کافی تصور کرتا ہوں۔

ان مسائل پر بحث کرنے سے قبل اور سب سے پہلے ہمارا یہ فرض ہے کہ جو کچھ سرکار نے ہمارے

فائدہ و نفع کے لئے کیا ہے، اس پر اظہار شکر و امتنان کیا جائے۔ گذشتہ چند روز کے اندر گورنمنٹ کے طرف سے چند ایسی کارروائیوں کا جو عمل میں آچکی ہیں یا جو عنقریب عمل میں لائی جائیں گی، اعلان کیا گیا ہے۔ نمک کا محصول تخفیف ہو کر ایک روپیہ فی من رہ گیا ہے۔ جس کے لئے سچے دل سے ہم احسان مند ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ اس محصول کی تنسیخ کی طرف قدم اٹھایا جائے گا۔ کیونکہ یہ محصول گو کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو، ہمیشہ غربا کے لئے باعث تکلیف ہے۔

اس کے بعد انتظام قحط کے متعلق ایک نظام جدید کی اشاعت کی گئی ہے۔ اس کا انتظام یوں ہوگا کہ ہر صوبہ میں ایک مستقل فنڈ قائم کیا جائے گا اور سالانہ ایک رقم خاص ہر صوبہ کو دی جایا کرے گی تاکہ ضرورت کے وقت اور حالت قحط و تکلیف میں کام آئے۔ اس کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ اگر سخت قحط پڑنے کی وجہ سے کسی خاص صوبہ کی جمع شدہ امانت ختم ہو جائے، تو ملکی خزانے سے نصف خرچ ادا کیا جائے گا۔ ان صوبجات کو ساڑھے چار لاکھ روپیہ سالانہ اس فنڈ کے لئے ملے گا اور کل رقم جمع ہو کر آخر میں تیس لاکھ ہوگی۔ یہ بیشک ایک نہایت عادلانہ انتظام ہے اور موجودہ طریقہ سے کہیں بہتر ہے جس کی وجہ سے اکثر صوبوں کا قریب قریب دیوالیہ نکل جایا کرتا تھا اور لہٰذا ہم کو انتظام جدید کے لئے شکر گذار ہونا چاہیے۔ لیکن اگرچہ یہ انتظام عین سخاوت پر مبنی ہے، تاہم اس کا مجوزہ علاج کافی نہیں ہے۔ ابھی کچھ اور کرنا باقی ہے، جس کا ہم کو نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار ہے۔ وہ یہ کہ خوشحالی کے زمانہ میں اس قسم کی امداد رعایا کو دی جائے کہ تکلیف یا مصیبت کے وقت وہ اس کی چنداں پرواہ نہ کریں اور اس کا مقابلہ زیادہ آمادگی کے ساتھ کر سکیں اور اس کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ سرکاری مال گذاری کو کچھ ہلکا کر دیا جائے۔

صیغۂ تعلیم میں جو اصلاح عنقریب رائج ہوا چاہتی ہے وہ بھی نہایت اہم اور قابل غور ہے۔ ابتدائی تعلیم تمام ہندوستان میں بلا فیس جاری کر دی جائے گی۔ اس کا ذکر سب سے پہلے آنریبل مسٹر بیکر نے اپنی تقریر میں وائسرائے کی کونسل میں بجٹ پیش کرتے ہوئے ۲۰ تاریخ ماہ حال کو کیا تھا۔ اس امر کا اعلان کیا گیا ہے کہ اگرچہ بجٹ میں کوئی رقم اس مد میں متعلق مہیا نہیں کی گئی ہے جس کا خرچ تنسیخ فیس مدارس ابتدائی مدارس کے وجہ سے بڑھ جاوے گا۔ تاہم سکریٹری آف اسٹیٹ ہند نے یقین دلایا ہے کہ اگر مالی حیثیت سے کوئی مناسب انتظام و ترکیب قابل عمل تجویز کی گئی تو وہ سال کے اندر ہی اس کا نفاذ

کردیں گے اس اعلان کے بعد ہی نہایت قابلِ تعریف سرعت اور تیزی کے ساتھ گورنمنٹ ہند نے ایک "گشتی" چٹھی تمام لوکل گورنمنٹوں کے نام ان کی رائے دریافت کرنے کی غرض سے جاری کی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک ایسی اصلاح منجملہ دیگر اصلاحات کے ہے جس کے لئے ہم کو موجودہ لبرل گورنمنٹ کا نہایت شکرگزار ہونا چاہیئے۔ فیس کی تنسیخ کے بعد جبریہ تعلیم کا نمبر ہے۔ جب ہماری معلومات بتلاتی ہے کہ مفت کی تعلیم کا انگلستان سے ملک پر اس وقت تک چنداں اثر نہیں پڑا اور نہ اس کو کافی ہی سمجھا گیا جب تک وہ جبریہ قرار نہ دی گئی، تو ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے عوام الناس بھی اس سے بغیر بالائی جبر و دباؤ کے منتفع نہ ہوں گے۔ نظر بریں امر کہ تجویز زیرِ غور کا نفاذ صرف موجودہ مدارس سے متعلق ہوگا جن کی تعداد اس وقت بہت زیادہ نہیں ہے، میرے خیال میں خرچ کے لحاظ سے بہت تھوڑا فرق ہوگا اگر ان خطوں میں جہاں ابتدائی مدارس موجود ہیں، لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم جبریہ کردی جائے۔ یہ تو اصلاح کی ابتدا ہی ہو، اور بعد ازاں اس انتظام کو ان حصص ملک میں بھی جاری کیا جائے جہاں فی الحال اسکولوں کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا یہاں تک منشاء ہے کہ ہندوستان میں ہر درجہ و طبقہ کے لئے ابتدائی تعلیم جبریہ قرار دی جاوے۔

دو اور نہایت ضروری اور بڑی اصلاحیں گورنمنٹ کے زیرِ غور ہیں۔ یعنی اصلاح و توسیع مجلس واضعان قوانین اور ایگزیکٹو و جوڈیشل اختیارات کی علحدگی۔ ابھی یہ نہیں معلوم کہ دونوں مسئلے کس طرح کی صورت و شکل اختیار کریں گے، لیکن اینگلو انڈین ممبر پارلیمنٹ کی گھبراہٹ ان اصلاحات کے متعلق کہے دیتی ہے کہ ان کے متعلق کوئی مفید تغیر جلد واقع ہونے والا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ گورنمنٹِ ہند کی مراسلت مجلس واضعان قوانین کی اصلاح کے متعلق انگلستان روانہ ہو چکی ہے، لیکن اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم فیصلہ قطعی کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ ہمیں اپنے دعاوی و خواہشات کے اظہار کو برابر جاری رکھنا چاہیئے، جن کا بجا ہونا اب بلاشبہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔

یہ دو نہایت ضروری اصلاحیں ہیں، جن کا افتتاح گورنمنٹ کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ لیکن ہم اپنے صوبہ کے گورنمنٹ کی ان مساعی کو جو اس جانب ہوئیں نظرانداز کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ ان کے نہایت شکرگذار ہیں۔ ان مساعی کی تفصیل یہ ہے کہ ترقی زراعت کی انتظام میں روپیہ خرچ

کرنا، وڑکی آلات کا بہم پہنچانا، وہاں کے کالج میں ٹکنیکل کلاس کھولنا، میور کالج میں تعلیم علم الحیات کے لئے خاص معلم کا تقرر، اور ان صوبوں کی صنعتوں اور حرفتوں کو ترقی دینے کے لئے پچیس ہزار روپوں کی منظوری۔ اس صوبہ کا مالی نقشہ ابھی شنبہ گذشتہ ہی کو کونسل میں پیش ہوا تھا اور کل اس پر سخت بحث ہو گی۔ میں اس پر اس وقت تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن تین خاص مدّات پر میں توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہ واقعی نہایت تعجب انگیز ہیں۔ وہ مدیں حسب ذیل ہیں:

ہز آنر لفٹیننٹ گورنر کے لئے ایک نئی ٹرین کی تیاری کا خرچ ۷۰۰۰۰

لکھنؤ میں گورنمنٹ ہاؤس کے باغ کی توسیع ۱۵۰۰۰

دیرہ میں نئی سرکٹ ہاؤس کی درستگی ۷۵۰۰۰ میزان ۲۹۵۰۰۰

اب ملاحظہ فرمایئے کہ اس تقریباً تین لاکھ روپے کی منظوری کو اس ۲۵۰۰۰ کی رقم سے کیا نسبت ہے جو ۴۸۰۰۰۰۰ رعایا کی صنعتی و حرفتی ترقی کے لئے منظوری ہوئی ہے۔ ہم کو امید کرنی چاہیئے کہ آئندہ اس سے بہت بڑی رقم حرفت وصنعت کی ترقی اور ضروری اصلاحات کے لئے منظور کی جاوے گی۔

اب میں چند دیگر سوالات کے جانب متوجہ ہوتا ہوں۔ جن پر ہمیں غور کرنا ہے اور جو بہت ہی ضروری اور مفید ہونے کے علاوہ نہایت ہی وسیع بھی ہیں۔ وہ مسائل یہ ہیں:

صوبہ کی مالی حالت ۔ لوکل اور میونسپل بورڈوں کی حالت ۔
مال گذاری ۔ تعلیم ۔ مجالس واضعان قوانین ۔ سرکاری ملازمت ۔
عدالت ۔ تحریک سودیشی ۔ ہائی کورٹ اور عدالت جوڈیشنل کمشنر کا الحاق ۔ طریقہ بیگار ۔ آب پاشی ۔ آبکاری ۔ اور تیسرے درجہ کے مسافرین ریل کی تکلیفات ۔

یہ سب وہ امور ہیں جن پر ہم بحث کریں گے۔ میں نے ابھی ان میں سے چند کا ذکر گورنمنٹ کے طرزِ عمل کے متعلق کیا ہے اور اگر میں ہر ایک مسئلہ پر کچھ نہ کچھ بحث کروں تو میری تقریر ضرورت سے زیادہ طویل ہو جاوے گی۔ مگر میں تھوڑا تذکرہ صوبہ کی مالی حالت اور تعلیم کے متعلق جو باہم دیگر متحد ہیں اس وقت کرنا چاہتا ہوں۔

ملکی اصلاحات جاری کرنا بہت کچھ روپیہ پر منحصر ہے کوئی اصلاح خواہ کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو ہم شروع نہیں کر سکتے جب تک کہ اس کے اجرا کے لئے ہمارے پاس روپے موجود نہ ہوں۔ مختلف صوبوں کی گورنمنٹیں بہت کچھ کتر بیونت اور کاٹ چھانٹ اپنی آمدنی کے اس حصہ میں کیا کرتی ہیں جو موجودہ معاہدہ کے مطابق گورنمنٹ ہند ان کو عطا کرتی ہے۔ کیونکہ اسی کے اندر ان کو سب خرچ پورا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جو سلوک گورنمنٹ ہند اس معاملہ میں ہمارے صوبجات کے ساتھ کیا کرتی ہے وہ نہایت ہی قابل شرم ہے۔ ہم شاہی خزانے کو سب سے بڑی رقم ادا کرتے ہیں اور اس کے عوض میں اس قدر قلیل عطیے ہمیں ملتے ہیں کہ وہ ہمارے روزافزوں ضروریات کے لئے بالکل ناکافی ہیں۔

ان قلیل عطیات کا نتیجہ یہ ہے کہ ضرورت کے موافق ہم تعلیم، حفظ صحت، لوکل سلف گورنمنٹ اور دوسری اندرونی انتظامات میں ترقی نہیں کر سکتے۔ گورنمنٹ ہند کے اس ناواجب سلوک کے معاملے میں لوکل گورنمنٹ اور مختلف محکموں کے حکام کی ہمدردی ہمارے طرف تھی انہوں نے وقتاً فوقتاً ناکامیابی کے ساتھ مگر نہایت زور سے اس معاملہ میں ہماری وکالت کی ہے۔ مگر ہم موجودہ حالت پر صبر و شکر کئے بیٹھے رہے ایک لفظ بھی اس کی مخالفت میں نہیں زبان پر لائے۔ پائنیر تک نے مجبوراً اس عطیہ کے متعلق جو امداد قحط کے لئے گورنمنٹ ہند نے اس صوبہ کو دیا ہے یہ کہا کہ گورنمنٹ ہند بھی بالآخر مجبوراً ہوئی کہ ان مصیبت زدہ صوبجات کی حالت پر غور فرمائے جو باقاعدہ حکومت کا ایک نمونہ ہیں اور جن سے ایام گذشتہ میں دل کھول کر روپیہ وصول کیا گیا ہے۔ سچ ہے نیکوں کے ساتھ اکثر ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔

کسی مہذب ملک کی گورنمنٹ کا سب سے پہلا اور مقدم فرض یہ ہے کہ مناسب ذرائع تعلیم اور حفظ صحت کے بہم پہنچائے۔ جو جسمانی اور دماغی ترقی کے لئے اشد ضروری ہے۔ مگر انہیں معاملات میں ہم نہ صرف دوسرے ممالک کے بلکہ خود ہندوستان کے دیگر صوبجات سے کافی فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے بہت ہی پیچھے ہیں۔ اگر اب تک کوئی بات بھی طاعون کے متعلق یقینی دریافت ہوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ بیماری ایسی ہی جگہوں پر پھیلتی ہے جہاں کہ حفظ صحت کا انتظام قابل اطمینان نہیں ہوتا۔ مگر تاہم مقامی اور میونسپل مجالس کو علیحدہ اور تنہا چھوڑ دیا گیا ہے کہ وبا کو دور کرنے کے لئے اپنی محدود ذرائع سے کام لیں۔ پاس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ سال بسال

برابر یہ ظالم مرض جس کے اب ہم عادی ہوتے جاتے ہیں، برابر اموات میں ترقی کرتا جاتا ہے۔

تعلیمی معاملات میں مسٹر لیوکس صاحب سابق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ہمارے بہت بڑے معاون تھے۔ ۱۹۰۱ء کے سالانہ رپورٹ میں انہوں نے اس صوبہ کی ان تعلیمی حاجتوں کو بیان کیا تھا جو اس وقت اشد ضروری خیال کی جاتی تھیں۔ ان سب اصلاحات و ترقیات کے اجرا کے واسطے جن کی انہوں نے سفارش کی تھی (جس میں یونیورسٹی، صنعتی، حرفتی، عام، ابتدائی و درمیانی تعلیم اور خرچ تعمیر وغیرہ سب شامل تھے) ۲۰ لاکھ سالانہ زائد تخمینہ کئے گئے تھے اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ باوجود اس زیادتی کے بھی کل خرچ تعلیم پر سرکاری خزانہ سے ۱/ فی کس سالانہ پوری آبادی پر پڑے گا۔ اس پیمانہ سے اگر سب نہیں تو اکثر صوبوں میں تعلیم کا خرچ بڑھا ہوا ہے۔ مگر اس صوبہ کی گورنمنٹ اس قدر خرچ کی منظوری بھی نہ دے سکی۔

تین سال کے بعد اسی مضمون پر بحث کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں مسٹر لیوکس نے پھر بیان کیا کہ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ سرکار کی توجہ بار بار ایسے نقص کے جانب مبذول کراؤں، جو سب خرابیوں کی وجہ موجب ہے۔ اس برائی کی جڑ اصل میں تعلیمی مد میں ناکافی خرچ کا ہونا ہے جو اس سے بہت کم ہے جو اسی مد میں دیگر حصص ہندوستان میں ہوتا ہے۔ میرے اس دعوٰی میں اب گنجائش بحث کی نہیں ہے تاہم یہ ظاہر ہے کہ اصلی حالت واقعات تک ابھی کوئی نہیں پہنچا ہے۔ ہندوستان کے تمامی حصص میں صوبجات متحدہ کی پرورش سب سے کم کی گئی ہے اور اس کو ۸۰ روپیہ فی ہزار آبادی پر تعلیمی خرچ کے لئے ملتا ہے۔ حالانکہ بمبئی میں ۲۴۵ روپیہ فی ہزار آبادی پر اسی غرض کیلئے صرف ہوتا ہے، یہ حالت ۲ برس ہوئے کہ تھی۔ مسٹر لیوکس کا بیان ہے اس نقص کو دور کرنے اور صوبجات متحدہ کو بمبئی کی شاہ خرچی تک پہنچانے کے لئے تعلیمی خرچ کو ۳۸ لاکھ کے بجائے ایک کروڑ ۱۱ لاکھ کر دینا چاہیئے۔

اس کھلی ہوئی غیر منصفانہ زبردستی کو ظاہر کرنے کے بعد مسٹر لیوکس فرماتے ہیں:

"اگر یہ اعداد صحیح ہیں، تو یہ کہہ کر وہ نہایت تحیر خیز ہیں چھٹکارا حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ ضروری ہے کہ ان پر غور کیا جائے۔ ان کی لاجواب منطق کا اقرار کیا جائے اور ایسی وجوہ غیر منصفانہ غیر مساویات کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہندوستان کی مسلمہ تعلیمی ضروریات اس وقت تک تکمیل کو پہنچی ہوئی نہیں کہی جا سکتیں جب تک کہ ان صوبجات کے بعید نقصانات کی تلافی نہ کی جاوے جو بہ لحاظ آبادی و رقبہ کے ہندوستان کے کسی صوبہ سے کم نہیں ہیں۔"

ایک سال بعد اپنی آخری رپورٹ میں قبل پنشن لینے کے مسٹر لیوس اس دعویٰ کا پھر اعادہ فرما کر واقعی حالات کا بیان یوں فرماتے ہیں:

"آٹھ سال کے بعد اب بھی ہم صوبجات متحدہ کو اسی حالت میں پاتے ہیں جس میں کہ وہ ابتدا میں تھے اور اس کی جگہ اب بھی باستثنا، جدید صوبہ سرحدی کے فہرست کے آخر میں ہے۔ لیکن آخر الذکر بھی ابتدا ہی میں اس منزل کے قریب پہنچ گیا ہے جہاں ہمارا صوبہ مقیم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس آٹھ سال کے زمانہ میں فی ہزار آبادی پر تعلیمی خرچ ۸۰ روپیہ سے بڑھ کر ۹۹ تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس کے مقابل میں بمبئی کا خرچ جس کا نمبر اول ہی ۱۸۳ روپیہ سے بڑھ کر ۲۴۵ روپیہ کی رقم پر جا پہنچا ہے۔"

ان سب واقعات پر غور کر کے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے صوبہ کے ساتھ نہایت بدسلوکی ہوئی ہے۔ یہ عین موقعہ ہے کہ ہر قسم کی بے انصافی کو لوکل گورنمنٹ ہند دور کرے۔ آخر الذکر کے ساتھ ہمارے معاہدے کی ترمیم ضرور ہونی چاہیئے جس کا وقت سال رواں میں آئے گا، تاکہ تعلیمی اخراجات کے لئے زیادہ رقم مہیا کی جا سکے۔

میری رائے ہے کہ ہم لوگوں کو مسٹر لیوس کا نہایت مشکور ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے زمانۂ ڈائرکٹری میں برابر مردانہ دار ان واقعات کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کرتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ اخراجات تعلیم کی رقم کے مقرر کرنے میں انصاف سے کام لیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ اپنی رپورٹ میں مسٹر لیوس لکھتے ہیں:

"میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں، لیکن اس کے قبل کہ میں ان صوبجات کو الوداع کہوں میں یہ چاہتا ہوں کہ جن لوگوں کے درمیان میں میں رہا ہوں اور جن کے حقوق کا میرے نزدیک کافی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ان کی طرف

سے ایک آخری خط لکھ کر اپنے تئیں اپنے فرض سے سبکدوش کروں''۔

کاش جن صاحبوں کی مُہر کہ خزانہ سرکاری پر ہے ان کے دلوں پر مسٹر لیوس کے کہنے کا اثر ہوتا۔

تعلیم بلافیس کے مسئلہ پر میں نے گورنمنٹ ہند کے اس چٹھی کا تذکرہ کیا ہے جو لوکل گورنمنٹوں کے نام جاری ہوئی ہے۔ بلافیس تعلیم دیئے جانے کے موافق تحریک اب برابر تیزی سے پھیل رہی ہے جیسا کہ مسٹر لیوس نے لکھا تھا فیس کی آمدنی کی میزان ابتدائی مدارس میں نہایت قلیل ہے یہ رقم ۶-۱۹۰۵ء میں صرف ۵۸۴۳۱ روپیہ تھی اور چونکہ شرح فیس اپر پرائمری درجوں میں زیادہ ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالباً صرف ۳۰۰۰۰ روپیہ آمدنی لور پرائمری درجوں کی فیس سے ہوتی ہے۔ جن میں ⅞ حصہ کل طلبہ کا پایا جاتا ہے۔ اس لئے گورنمنٹ کو بہت ہی تھوڑا خرچ کرنا پڑے گا، جس سے لوکل بورڈ اس قابل ہو جاویں گے کہ ہر جگہ ابتدائی تعلیم بلافیس دی جاسکے، اور اگر تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جاوے تو تمام صوبہ میں ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں ہی قسم کی تعلیم بلافیس ہو سکتی ہے۔ نظر بریں کہ یہ خرچ اس ترقی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے جو تعلیم کو بہ حیثیت مجموعی حاصل ہوگی ہم لوکل گورنمنٹ پر زور ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ ہند کی اس تحریک کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کرے اور اس کی تائید کرے۔ ابتدائی تعلیم کو جبریہ قرار دینے کے متعلق ہمارا یہ فرض ہے کہ گورنمنٹ پر یہ اچھی طرح سے واضح کر دیا جائے کہ رائے عامہ نہ صرف اس کارروائی کے لئے آمادہ ہے بلکہ عملاً اور نہایت جوش وخروش سے دعویٰ کرتی ہے کہ اس پر فی الفور سرعت سے عمل کیا جائے۔

اب ہم تعلیم نسواں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مسٹر لیوس کے اس رپورٹ پر نظر ڈالتے ہوئے جس میں انہوں نے بیان کیا تھا کہ لڑکوں کی طرح سے تعلیم نسواں کے لئے یہ صوبہ دیگر صوبہ جات کے بہت پیچھے ہے۔ گورنمنٹ نے اپنی حمایت کی کوشش ان الفاظ میں کی ہے:

> ''ڈائرکٹر صاحب کہتے ہیں کہ تعلیم نسواں پر بھی ان صوبجات میں بہ نسبت دیگر صوبہ جات کے کم خرچ ہے، لیکن روپیہ ایسے مصرف میں نہیں خرچ کیا جا سکتا جس میں حسب خواہش اور خاطر خواہ نتائج پیدا کرنے کے لئے ذرائع موجود نہ ہوں''۔

ممکن ہے کہ ۱۹۰۲ء میں اس بیان میں کچھ صداقت ہو۔ لیکن آج بلاشبہ یہ اصلیت سے دور ہے، جیسا کہ ۱۹۰۶ء کی رپورٹ میں نہایت مشرح طور سے مسٹر لیوس نے ظاہر کر دیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اب تعلیم نسواں کی ترقی کے لئے معتدبہ رقوم کامیابی کے ساتھ خرچ کرنے کے طریقے اور راستے موجود ہیں۔

کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ لوکل گورنمنٹ نے واقعی اس امر کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کمیٹی کی قابل تعریف رپورٹ جو بصدارت رائے بہادر بابو گیانندر ناتھ چکرورتی گورنمنٹ کو عملی اور یقینی طریقہ توسیع تعلیم نسواں کے متعلق صلاح دینے کے لئے منعقد ہوئی تھی صرف یہ بات ہی ظاہر نہیں کرتی کہ اب تعلیم نسواں کی مانگ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ بلکہ یہ بھی واضح کرتی ہے کہ کیونکر عقلاً و عملاً اس کو ترقی دی جائے اور نیز قابل عمل طریقوں کا نہایت مفید خاکہ بھی اس میں موجود ہے۔ اس کی تمام سفارشوں پر واقعی اور پوری طور سے عمل کرنے میں مسٹر لیوس کے بیان کے بموجب چھ لاکھ روپیہ سالانہ کا صرف ہے اور یہ رقم ایسے کام کے لئے کسی طرح زیادہ نہ تھی، لیکن چونکہ یہ رقم گورنمنٹ کے بساط سے بڑھ کر تھی اس لئے مسٹر لیوس نے ایک ترمیم شدہ نظام تیار کیا جس کے متعلق نصف رقم یعنی صرف تین لاکھ سالانہ خرچ کرنا پڑتا۔ لیکن یہ رقم بھی بہت زیادہ تھی اور گورنمنٹ نے افسوس کے ساتھ اعلان کیا کہ سال آئندہ کے واسطے زائد منظوری کے لئے روپیہ موجود نہیں ہے۔

اس موقعہ پر پھر وہی بدنصیب پالیسی ان صوبجات میں صیغہ تعلیم کو بھوکوں مارنے کی برتی گئی جو متعدد بار ظاہر اور مردود ہو چکی ہے۔ بےشک یہ زیادہ تر بوجہ ہماری معاہدہ کی ان سخت شرائط کے ہے جو گورنمنٹ ہند سے کیا گیا ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے اس کی زیادہ انصافانہ اور مساویانہ شرائط پر ترمیم کرنے کے لئے زور ڈالنا چاہیئے جو ہماری آبادی اور محصولات کے حسب حالی ہو۔ لیکن ہماری لوکل گورنمنٹ بھی الزام سے بری نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اس معاملہ کو ہم ہر طریقہ اور ہر ذریعہ سے اپنے حکام کے قلب پر نقش کر دیں۔ بلا زائد منظوری کے عام یا نسوانی تعلیم میں کچھ ترقی نہیں ہو سکتی۔ آخرالذکر قسم کی تعلیم کے متعلق ہماری گورنمنٹ کا برتاؤ نہایت بے دردی کا ہے۔ اب ہم کو صرف

یہ کرنا باقی ہے کہ زور ڈال کر خالی خولی ہمدردی کو سخاوت اور کشادہ دلی کی شکل میں تبدیل کرا دیں کہ کم از کم اس ترمیم شدہ نظام کو بغرض ترقی تعلیم نسواں جسے سابق ڈائرکٹر صاحب نے تیار کیا تھا عمل میں لاوے۔

الغرض ہم کو یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس نیک کام میں ہم کو خود بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ سب سے پہلے ہمارا کام یہ ہوگا کہ عوام میں دلچسپی پیدا کریں اور بعد ازاں گورنمنٹ کو وہ عملی اور ہمدردانہ مدد دیں جس کے بغیر ہماری عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ جو ہمارے وطن کے لئے بیحد ضروری اور مفید ہے اطمینان کے ساتھ حل نہیں ہو سکتا۔

صنعتی تعلیم و تربیت کا مسئلہ میری رائے میں ان سب مسائل میں بہت زیادہ ضروری اور مفید ہے جس پر اس کانفرنس کی توجہ منعطف کی جائے گی۔ اس کے فائدہ کا انحصار نہ صرف اس کے اس اثر پر ہے، جو ملک کی اصلی اور تجارتی فلاح پر پڑے گا بلکہ اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم از کم اسی قدر اس عام اثر پر بھی جو ہماری تمامی قومی زندگی پر پڑے گا۔ کیونکہ جب تک ہمارے یہ نوجوان یہ یقین رکھیں گے کہ اس جہاں میں نشو و نما حاصل کرنے کے لئے اصلی اور اعلیٰ درجہ کا طریقہ اگر سرکاری ملازمت کے سوا کچھ ہے تو وہ طبابت اور پیشہ قانونی ہے، اس وقت تک یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ سچا جوش آزادی کا اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے کا قوم میں پیدا ہو سکے۔ اگر ہمارے نوجوان سرکار کی ماتحتی میں حصول معاش پر نظر رکھیں گے تو یہ ظاہر ہے کہ وہ تمام عمر دوسروں پر بھروسہ کرتے رہیں گے اور حکام کے عنایات پر ترقی اور حصول معاش پر نظر رکھیں گے تو یہ ظاہر ہے کہ وہ تمام عمر دوسروں پر بھروسہ کرتے رہیں گے اور حکام کے عنایات پر ترقی اور حصول معاش کے لئے ان کی نظر رہے گی، اور بدیں وجہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکیں گے۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ حالت برابر جاری رہے گی خواہ کتنی ہی زیادہ تعداد عہدوں کی کیوں نہ ہو اور کتنے ہی اعلیٰ درجہ کے عہدے ہندوستانیوں کے قبضہ میں کیوں نہ ہوں۔ جب تک کہ ہماری تعلیم یافتہ جماعت ان بیڑیوں میں پھنسی ہے اس وقت تک کوئی اصلی قومی زندگی اور خود مختارانہ طرز عمل و احساس حاصل نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں سارے جدید ممالک میں اصلی عمل طاقت اور اثر روز بروز ان طبقوں سے نکلا جاتا ہے جو سرکاری ملازمت کی جستجو

میں رہتے ہیں اور ان لوگوں کو حاصل ہوتا جاتا ہے جو حکام سے کسی عنایت کے خواہاں نہیں ہیں اور گورنمنٹ سے کچھ نہیں چاہتے ہیں۔ بلکہ نہایت مضبوطی اور زور کے ساتھ اپنے ہی پیروں کے بل کھڑے ہو کر اپنی لیاقت اور قوت کے بھروسہ پر معاش اور رتبہ حاصل کرتے ہیں لیکن ایسا طبقہ زمینداروں اور تاجروں اور صنعت و حرفت پیشہ لوگوں ہی میں سے بن سکتا ہے اور انہیں کے لئے صنعتی تعلیم اور تربیت اعلیٰ درجہ کی نہایت ضروری اور مفید ہے، کیونکہ وہ زمانہ بہت عرصہ ہوا کہ گذر چکا ہے جب پرانے مروجہ قاعدوں کا علم اور ناتربیت یافتہ ذہن صنعت و حرفت کے میدان میں کامیابی کی تکمیل کے لئے کافی سمجھے جاتے تھے۔

اس لئے یہ ہمارے لئے بحیثیت ایک مجلس کے بالخصوص ضروری ہے کہ کسی ممکن الحصول موقع اور مدد کو ان نوجوانوں کے ہاتھ سے نہ جانے دیں جو ہمارے جانشین ہونے والے ہیں تاکہ وہ ہماری قومی زندگی کے اس بڑے بھاری نقص کو دور کر سکیں۔ میرے خیال میں ہمارے وطن کی آئندہ ترقی کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اس کو خوب اچھی طرح سے سمجھ لے۔ واقعات کے معاملہ میں آنکھیں بند کرنا یا یہ خیال کرنا کہ ہم واقعی ایسے لوگوں سے جو ضرورت زمانہ کے لحاظ سے ہمیشہ حکام کے پاس اپنی خواہشات اور ضروریات کے لئے دوڑا کرتے ہیں مضبوط قوم بنا سکیں گے ایک فضول اور عبث فعل ہے۔

خوش قسمتی سے گورنمنٹ نے اس جانب کارروائی کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے جس کی تکمیل کے لئے ایک نیا کلاس رڑکی کالج میں کھولا گیا ہے اور حرفتی اسکول لکھنؤ میں قائم ہے۔ اس سے گورنمنٹ کی صداقت اور نیک نیتی ثابت ہوتی ہے۔ گورنمنٹ نے محض سڑک بنوا دی ہے، چلنا اس پر ہمیں کو ہے اور وہ ہم ہیں جو اپنے گرم جوشی اور ہمدردی اور عملی مدد کے ذریعہ سے عوام الناس کو سکھا پڑھا کر سمجھا بجھا کر اس تحریک میں جان ڈال دیں گے اور اس کی سرسبزی اور زندگی کے لئے ضروری طاقت مہیا کریں گے۔ اس لئے ہم کو فوراً کسی قابل عمل فرض کا اظہار کرنا چاہیئے اور یہ خواہش کرنی چاہیئے کہ کل ساز و سامان سے لیس ایک صنعتی مدرسہ ان صوبجات میں قائم کیا جائے اور ایک اسکول ہر قیمت میں بنایا جائے۔ یہ خواہش کچھ غیر مناسب نہیں ہے اور نہ اس سے کم پر ہم قناعت کر سکتے ہیں۔ اگر گورنمنٹ روپیہ کی کمی کا عذر کرے تو ہم بار بار یہ

بتادیں گے کہ صوبجات متحدہ تعلیمی حیثیت سے بہ نسبت جو دوسرے صوبوں کے کتنے پیچھے ہیں اور کیسا بُرا سلوک اس معاملہ میں ان سے کیا جاتا ہے اور اپنے منصفانہ اور عاقلانہ دعوی کو گورنمنٹ کے سامنے بغرض توجہ برابر پیش کرتے رہیں گے۔

حضرات! مجھے خوف ہے کہ میں نے آپ کے صبر و تحمل کی انتہا کر دی ہے۔ لیکن میں التجا کرتا ہوں کہ تھوڑا سا اور عرض کرنے کی اجازت ہو۔ اس وقت ہمارا کام اور ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم ایک ایسی قوم بنا کر تیار کریں جو اقوام دنیا میں معزز رتبہ حاصل کر سکے۔ یہ کہنا آسان ہے لیکن کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک خاص قومی کیریکٹر بنا دیا جائے، افراد اور فرقوں کے اختلافات مٹا دیئے جائیں اور مشترکہ خیالات کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جائے، جو کل اقوام اور مذاہب پر حاوی ہو اور جس میں اختلافات کی گنجائش نہ ہو، جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ ملکی معاشرتی اور تمدنی ترقی کی کوشش کی جاوے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم نے کس قدر ترقی ہندوستانیوں کو ایک قوم بنانے میں کی ہے۔ میرا جواب تو یہ ہے کہ اب تک بہت تھوڑا کام کیا گیا ہے۔ لیکن اس وقت بالخصوص ہم کو اس سوال کے دو جوابات پر غور کرنا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے بالکل مخالف ہیں اور مخالفت انتہا اور حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ ایک طرف تو ہمارے انگریز دوست دعوی کرتے ہیں کہ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور یہ کہ ہندوستانیوں کی زندگی میں قومیت کا نشان تک نہیں ہے۔ دوسرے جانب فریق گرم کے اصحاب ہیں جو اپنے طرز عمل سے یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ کام گویا اختتام کو پہنچ گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ دونوں باتیں بالکل لغو اور سخت شر انگیز ہیں۔ میں اپنے انگریز دوستوں سے عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ ذرا آنکھ کھولنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے، تو آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ ایسی قوتیں اس وقت بھی برسر کار ہیں کہ اگر ان کو مجتمع کر کے ان سے کام لیا جائے تو وہ وقت دور نہیں کہ ایک بڑی شاندار قوم دنیا میں پیدا ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ عوام الناس جاہل ہیں اور ہندوستان کے ہر صوبے میں مذہبی اور ذاتی اختلافات موجود ہیں۔ لیکن یہ بحث کرنا ایک فعل عبث ہے کہ ہر شہر اور قصبہ میں حتی کہ خود ہمارے کم ترقی یافتہ صوبے میں ایسے افراد ہر مذہب اور ذات کے جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے موجود نہیں ہیں، جن میں قومی روح پوری طور سے حلول کر گئی ہے اور مناسب موقعوں میں ان کو یہ قابلیت حاصل ہے کہ وہ اپنے سارے

ہموطنوں کے دلوں کو اسی نور سے منور کر دیں۔ اپنے "گرم" دوستوں سے یہ کہوں گا کہ اگرچہ ہر انصاف پسند شخص ان طاقتوں کی موجودگی کا اقرار کرے گا مگر اس کے ساتھ ہی اس امر کا بھی اقرار کرنا ہوگا کہ یہ طاقتیں بالذات توم نہیں کہا سکتیں۔ انگریزوں سے ہم یہ کہتے ہیں کہ ان طاقتوں کو آپ نے ہی بنایا ہے جو نہایت استقلال او رتیقن کے ساتھ ہند کی نجات کا باعث ہو رہی ہیں۔ آپ نے نہ صرف ان کو خلق ہی کیا ہے، بلکہ ان کو ایسی قوت اور کثرت کے ساتھ مجتمع ہونے دیا ہے کہ اب ان کا روکنا اور دبانا آپ کی طاقت سے باہر ہو گیا ہے۔ نہایت احسان مندی کے ساتھ ہم اقرار کرتے ہیں کہ انگلستان نے ہم کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم اپنی زبان، اپنے علم ادب، اپنے علوم و فنون اور سب سے زیادہ اپنے آزاد اصول حکومت کے ذریعہ سے دی ہے۔ ایک صدی سے ہمارے دماغ کی پرورش اسی تعلیم سے ہو رہی ہے۔ اب ہم بلوغ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اب ہم اس قابل نہیں ہیں کہ وہی بچوں کے سے کپڑے پہنیں، جو انگلستان نے ایک زمانے میں ہم کو عطا کئے تھے اور فطرتاً ہم نہ صرف مردانہ لباس کے خواہشمند ہیں بلکہ اپنی ان دن دونی رات چوگنی ترقی کرنیوالی تحریکات کے لئے زیادہ آزادی چاہتے ہیں، جن کا تعلق اس دائرہ علوم سے ہے جس میں ہم نے پرورش پائی ہے۔ موجودہ لبرل گورنمنٹ کو اس تنبیہہ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے جو ۳۰ برس پہلے ایک کنسرویٹو وائسرائے کی زبان سے نکلی تھی۔ ایک نہایت مشہور تقریر میں لارڈ ڈلفن نے دربار کونسل میں فرمایا تھا:

"گورنمنٹ ہند ایک اعلیٰ درجہ کی کنسرویٹو گورنمنٹ ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ لیکن میں ایک ضرب المثل کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں جس کی صحت پر آپ کی کہنگی دلالت کرتی ہے، وہ یہ کہ تبدیل واقعات سے بالاصل جو ترقیاں وقوع میں آتی ہیں، وہ ایک کنسرویٹو حکمت علمی کی بہترین بنیاد ہیں اور کسی طرح بھی اس کے مخالف نہیں ہیں۔ کوئی حکومت واقعی کنسرویٹو ہو سکتی ہے جبتک اس کی حکمت نہایت دور بینی اور پیش بینی کے ساتھ چارہ ساز نہ ہو۔ وقت پر چارہ سازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سخت انقلابات رک جاتے ہیں۔ قضا و قدر نہایت ایماندار شاطر ہیں اور کسی قوم کو، کسی گورنمنٹ کو اور کسی طبقہ کو شہ رکھے بغیر مات نہیں دیا کرتے۔ یہ ہمارا فرض ہے اور بہتری اسی میں ہے کہ اس اطلاع سے مطلع ہو کر اپنے مہرون

کو نکالیں، نہ صرف سیاست بلکہ سب امور میں یہ قانون ناطق ہے کہ قوی اور بہتر کمزور اور بدتر پر غالب آتے ہیں۔ جو لوگ واقعات کے نشوونما سے اپنی معاشرت کی اصلاح نہ کر کے ان کے مطابق اپنے تئیں نہ بنادیں گے، ان کو فرمان عالم کے بموجب قبل از وقت فنا ہونا لازم ہے۔"

حضرات! تقدیر نے اب تک بہر طور نہایت دیانت کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس نے آہستہ (بقول لارڈ ملٹن کے) تبدل واقعات قائم کر دیا ہے اور اب جیسا کہ اس تبدیلی کا منشا ہے وہ ترقی اور اصلاحات کی مدّعی ہے۔ اس نے طبقۂ حکام انگریز سے باواز بلند "ششہ" کہہ دیا ہے۔ گو یہ فرق اتنا آہستہ رَو ہے کہ واقعات کے نشوونما کے مطابق یہ اپنے آپ کو اب تک تبدیل نہیں کر سکا ہے۔ اس نے ہمارے ان ہموطنوں سے بھی پکار کر "ششہ" کہہ دیا ہے، جو اس سے زیادہ تیز چلنے کے خواہشمند ہیں جتنا کہ واقعات کی نشوونما اجازت دیتی ہے۔ دونوں کو لازم ہے کہ اس تنبیہ سے متنبہ ہو کر اپنے مُہرے ان کی زد سے ہٹا لیں۔ ان دونوں میں سے کسی کو بھی تقدیر کے عظیم الشان کام کے پورا ہونے میں رکاوٹ نہ پیدا کرنی چاہیے اور لارڈ مکالے کی اس پیشین گوئی کے پورا ہونے میں حارج نہ ہونا چاہیے جو ان قابل یادگار الفاظ میں موجود ہے:

"جب کبھی وہ دن آویگا انگریزی تاریخ میں وہ سب سے زیادہ قابل فخر ہوگا ایک ایسی بڑی قوم پر جو غلامی اور ضعیف الاعتقادی کے قعر میں پڑی ہو، حکومت کو اس کو اس قابل بنا دینا کہ وہ آزادی کے حقوق کی خواہشمند ہو اور ان حقوق کے حاصل کرنے کے قابل بن جاوے، بلاشبہ ہم کو تحسین و آفرین کا مستحق بنا دے گا۔"

تاریخ انگلستان کا وہ نہایت قابل فخر دن جو اس کے لئے خاص شوکت کا باعث اور قوم برطانیہ کی اعلیٰ ترین میراث ہوگا، اب محض خواب و خیال نہیں ہے۔ تقدیر ہمکو روز بروز اس دن سے قریب لئے جا رہی ہے۔ طبقۂ حکام کو اس صبح صادق کے نور سے آنکھ نہ چرانی چاہیے اور نہ ہمارے ہموطنوں کو غلطی سے اس کو آفتاب نصف النہار قیاس کر لینا چاہیے۔ بلکہ دونوں کو متفق ہو کر تیرہ اختری کی سیاہی کو شمع خاوری کے سامنے سے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دونوں کو جھک کر مؤدبانہ سحر طالع کا استقبال کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ: اے امید باعث آبادی ما!

کشمیر درپن، الہ آباد، جلد ۵، شمارہ ۳، ضمیمہ ملحق ۱۹۰۷ء

یوپی میں انڈین نیشنل کانگریس کی
پہلی صوبائی کانفرنس کا خطبۂ صدارت

●●

مطبوعاتِ جدیدہ

رہبرِ تحقیق

تبصرہ: از قاضی عبدالودود

رہبرِ تحقیق[1] (= رہبر) اُردو سوسائٹی، شعبۂ اُردو، لکھنؤ یونیورسٹی (= سوسائٹی) کی شائع کتاب ہے۔ سوسائٹی کے "نگراں" ایک پروفیسر ہیں، اس کی مجلس مشاورت میں ایک پروفیسر اور ۲ پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں، اور مجلس ادارت ایک پی۔ ایچ۔ ڈی اور ۲ "ریسرچ اسکالروں" پر مشتمل ہے۔ رہبر کی اشاعت غالباً ان طلبہ کی رہبری ہے، جو تحقیق کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں، یا رکھنے والے ہیں۔ یہ ۱۷ اصحاب کی تحریروں کا مجموعہ ہے، ان میں صرف ایک خاص طور پر رہبر کے لئے لکھی گئی ہے اور نگراں کے رشحات قلم سے ہے۔ "حرفِ چند" بھی ان ہی کا لکھا ہوا ہے، اس میں "چیف ایڈیٹر" کو الفاظ میں داد دی گئی ہے: ڈاکٹر کی شخصی دلچسپی، بے اندازہ مشقت اور پسپائی سے مسلسل انکار کی وجہ سے یہ مجموعہ ترتیب و طباعت کے ہفت خوان[2] طے کر سکا۔ صـ ب۔ سطورِ ذیل سے ناظرین کو اس کا اندازہ ہو سکیگا کہ لکھنؤ میں "ہفت خوان" کسے سمجھتے ہیں، اور مرتبین نے انھیں طے کس طرح کیا ہے، مگر میں بہت اختصار سے کام لونگا، اور جو عبارتیں رہبر سے نقل ہونگی، ان کا املا وہی ہوگا جو رہبر میں ہے۔

فہرست مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ صـ۱۶ میں ایک خطبۂ صدارت کا اقتباس بعنوان "اردو تحقیق" درج ہے، لیکن، نہ یہ اس صفحے میں ہے، نہ کہیں اور، صـ۳۸ میں ایک دوسرے خطبۂ صدارت کا اقتباس البتہ موجود ہے۔

"حرفِ چند" صـ ج سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتبین نے جو کچھ جمع ہوا تھا، سب کا سب نہیں، اس کا انتخاب رہبر میں شامل کیا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد کے ۲ مقالوں (ان کا ذکر بعض مقالوں میں ہے) کا عدم شمول حیرت انگیز ہے۔

سیم ولر (ڈکنس کا ایک مشہور مخلوق ذہنی، رجوع بہ پکوک پیپرس) نے عدالت میں گواہی دیتے ہوئے اپنے خاندانی نام کے متعلق کہا تھا I spells it with V۔ لوگ اسے W سے لکھتے تھے، اس موقع پر اس نے انلوگوں سے بے پروائی کا اعلان ہی نہیں کیا، ساتھ ساتھ ایک مسلّمہ قاعدے کی خلاف ورزی بھی کی، یعنی یہ کہ ضمیر واحد متکلم کے لئے فعل جمع کی جگہ فعل واحد استعمال کیا۔ اُردو میں سیم ولر کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہزاروں ہیں، اغلاط املا کا ذکر ہی فضول ہے، مگر ایک انگریزی لفظ catalogue کی جو ایک نئی شکل رہبر میں صـ۱۲۶ میں ۳ جگہ ملتی ہے، اس سے میں ناظرین کو ناواقف نہیں رکھنا چاہتا، یہ "کٹیالاگ" ہے۔

۱۔ دو چار صفحوں میں "حرفِ چند" وغیرہ، مقالات وغیرہ ۷۵ صفحات میں تقطیع $\frac{۲۲\times۱۸}{۸}$ قیمت ۱۰ روپے

۲۔ خوان، کی جگہ "خان" چاہیے۔ رجوع بہ فرہنگ فارسی جلد ۴ مؤلفہ ڈاکٹر محمد معین، طبع ایران

میری مضمون کی اشاعت کی اجازت مجھ سے لینا غیر ضروری متصور ہوا، مگر یہ بتایا گیا ہے کہ آج کل کی تحقیق نمبر سے ماخوذ ہے۔ یہ اس وقت پیش نظر نہیں اور میں یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ جو اغلاط طباعت رہبر میں ہیں، وہ اس میں بھی ہیں، یا نہیں۔ اگر ہیں، اور اشاعت کی اجازت مجھ سے لی گئی ہوتی، تو میں اس کی تصحیح کر دیتا، اور یہ بھی ممکن ہے کچھ ترمیم کرتا۔ میرا مضمون رہبر میں بہت غلط چھپا ہے۔ بعض اغلاط کا اس جگہ ذکر کیا جاتا ہے۔ میں نے دہلی کے رسالے "ہما" کا ایک اقتباس یا اس کے مطالب اپنی عبارت میں پیش کیے اور اس کے بعد میں نے اپنی طرف سے کچھ اضافہ کیا تھا، رہبر میں یہ سب اس طرح چھپا ہے کہ پڑھنے والا اگر وہ پہلے اس مضمون کو دیکھ نہیں چکا ہے، تو لازماً یہ سمجھیگا کہ میں نے جو اضافہ کیا تھا، وہ بھی 'ہما' میں تھا۔ میں نے جو کچھ لیا تھا وہ "دوست بن گیا" پر ختم ہو گیا ہے، اس کے بعد جو کچھ ہے، وہ اضافہ ہے۔ مضمون کے اقتباس ذیل میں "موصوف نے" سے قبل ایک لفظ چھوٹ گیا ہے۔

"جناب ڈاکٹر ذاکر حسین جس زمانے میں دانشگاہ برلن کے متعلّم تھے ایک استاد سے ٹکرا گئے۔ اس کی زبان سے صرف ایک لفظ نکلا گدھا؛ موصوف نے (اس کے مدّعا کے خلاف اس کا یہ غلط مطلب لیا کہ وہ اپنا تعارف کرا رہا ہے، اور گدھا اس کا نام ہے) فوراً کہا ذاکر حسین، وہ بہت خوش ہوا اور ان کا دوست بن گیا۔ مسٹر نور الدین احمد مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے موصوف سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا، انہوں نے کہا کہ یہ جرمنی کا پرانا لطیفہ ہے، میرا اس سے کچھ تعلق نہیں۔" ص ۱۲۱

میری مضمون میں غالب کی تیغ تیز کا ایک اقتباس درج ہے، اس کا خاتمہ اس فارسی مصرع پر ہوتا ہے۔ "چشم مخالفان بیازن بتیر" یہ اقتباس رہبر کی ۶ سطروں میں آیا ہے، سطر ۵ میں صرف یہ الفاظ ہیں "چشم مخالفان بیازن"، اور اس کے بعد جگہ خالی ہے۔ (ایک سطر میں عموماً ۱۵، ۱۶ اسطور) مصرع سطر ۶ میں تمام ہوا ہے، اور "بتیر" کی جگہ میز مرقوم ہے، مگر اس کے بعد "نہیں۔ ص ۱۲۲ میں کاکو کے عوض کاکوری چھپا ہے۔

ایک صاحب نے "حالی بحیثیت شاعر" پر تبصرہ لکھا تھا، اس کا ایک اقتباس رہبر کے ص ۱۲۵ میں درج ہے:
"ڈگری حاصل کرنے کے لئے جو مقالے لکھے جاتے ہیں، ان میں عموماً دو قوتیں کام کرتی ہیں؛ ایک تو قوتِ حیوانی ہے جس کا تعلق ماخذوں کی ورق گردانی ہے (کذا)، دوسری قوت ذہنی و فکری ہے جس کا تعلق محاکمہ و اخذ نتائج سے ہے، لیکن ایک تیسری قوت اور بھی ہے، جو اس تمام استقرا و استنباط کو ایسے اسلوب سے پیش کرتی ہے کہ مقالہ خود اپنی جگہ پارۂ ادب ہو جاتا ہے، اور اس قوت کا نام قوت عبقریت ہے۔ پھول چن چن کر دامن بھر لینا آسان ہے،

لیکن ان کو خاص سلیقہ و حسن کے ساتھ گلدستہ (کذا) کی صورت دینا بڑا ذوقِ سلیم چاہتا ہے۔"

اس سے بھی بحث نہیں کہ کس "قوت" کی کیا اہمیت ہے، اگر کوئی صاحب یہ بتا سکیں کہ تبصرہ نگار کے نزدیک تیسری قوت کس مقالہ نگار میں ہے، تو میں ممنون ہونگا۔

ایک صاحب لکھتے ہیں "اور جہاں تک میرا سوال ہے میں اس احساس برتری سے محروم ہوں کہ رشید حسن خاں، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر فہمیدہ سلطانہ، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر نور السعید اختر، ڈاکٹر تنویر علوی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر انصار اللہ نظر اور ان جیسے دوسرے حضرات کی تحقیقات کو نظر انداز کر سکوں" ص ۱۱ اس سے رشید حسن خاں وغیرہ کی جو توہین ہوتی ہے، ممکن ہے کہ انھیں اپنی "برتری" کی طرح، اس کا احساس نہ ہو کہ وہ جن کی تعریف کرنا چاہتے ہیں، ان کے الفاظ سے ان کی توہین ہو رہی ہے۔ ان کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے اس کی جگہ یہ لکھا جا سکتا تھا "رشید حسن خاں وغیرہ کی تحقیقات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں"

یہی صاحب ص۱۰ میں رقمطراز ہیں "یہ ضروری ہے کہ اغلاط کی نشاندہی میں احساس برتری یا طنز و تمسخر کا شائبہ نہ ہو۔ غلطی کون نہیں کرتا، اغلاط کی طرف ہمدردی و دلسوزی کے ساتھ اشارہ کیا جائے، تو اس سے اصلاح ہو گی۔ چبھتے ہوئے الفاظ میں وہی بات کہی گئی، تو مشارٌ الیہ چڑھ کر اپنی بات پر اڑ جائیگا۔ گویا انشائیہ[1] کا حق تو ادا ہو جائیگا۔ لیکن اعتراض کا مدعا خبط[2] ہو جائے گا۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ تحقیقی بحث میں ذاتی حملے نہ کیے جائیں۔ دشت تحقیق کو انشاء و مصحفی کے معرکوں کا میدان نہ بنایئے۔"

اگر کوئی اس مشورے پر عمل کرنا چاہے، تو کتاب خواہ اغلاط فاحش سے کتنی ہی مملو کیوں نہ ہو، اس پر تبصرے کا آغاز کچھ اس طرح کرے "جناب والا کو نہایت ادب سے اطلاع دیجاتی ہے کہ جناب والا کی کتاب (نام) میں بکثرت اغلاط فاحش نظر آتی ہیں، یہ تو ممکن ہی نہیں کہ جناب والا سے یہ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں، کاپی اور پروف کی تصحیح کا کام جن صاحب کے سپرد ہوا بظاہر کثرت مشاغل کی وجہ سے، وہ اس کے لیے کافی وقت نہ نکال سکے۔ جناب والا اس سے بیخبر نہ ہوں گے کہ اس ملک میں حاسدوں کی کمی نہیں، وہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں، اور چھاپے کی غلطیوں کو لکھنے والے کی غلطیاں قرار دینے میں انھیں مطلق تامل نہیں ہوتا، احقر کا باادب مشورہ ہے کہ آیندہ تصحیح کا کام ایسے لوگوں کے سپرد ہو، جو اس کے لیے وقت نکال سکیں۔

۱۔ "انشائیہ" سے کیا مراد ہے؟ اور طنز و تمسخر سے کس طرح اس کا حق ادا ہوتا ہے؟

۲۔ خبط نہیں، فوت کا محل ہے، مگر ممکن ہے چھاپے کی غلطی ہو۔

مضمون نگار نے شاید شوپنہار کا یہ قول نہیں سنا کہ بُروں کو بُرا نہ کہنا اچھوں کے ساتھ زیادتی ہے، اور بظاہر وہ اس سے بھی ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ میتھو آرنلڈ نے انگلستان کا المانیہ و فرانس سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان دونوں ملکوں میں علمی مباحث کی سطح انگلستان سے اس لیے بلند تر ہے کہ وہاں مقابلتہً سختگیری زیادہ ہوتی ہے۔ ہندوستان میں نرمی کی نہیں سختی کی ضرورت ہے، بلکہ بہتوں سے طنزیہ الفاظ میں نہیں صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ تحقیق آپ کے بس کا روگ نہیں، آپ کو کوئی اور کام کرنا چاہیے۔ بہتوں کا دماغ جھوٹی تعریف نے خراب کر دیا ہے، وہ محققین کی صفِ نعال میں بھی بیٹھنے کا حق نہیں رکھتے، لیکن وہ اپنے کو صفِ اولین میں ایک ممتاز جگہ کا سزاوار سمجھتے ہیں، ایسے لوگ اپنی اصلاح کیا کریں گے؟ کتنے ہی نرم الفاظ میں اغلاط کی نشاندہی کیوں نہ ہو، وہ معترض کے دشمن ہو جاتے ہیں۔

مضمون نگار سے میری گزارش ہے کہ میرے مقالے متعلق مصحفی و انشا (شائع کردہ اردو ادب) کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی ایک شخص کا بھی نام بتائیں جس نے دشتِ تحقیق کو انشا و مصحفی کے معرکے کا میدان بنا دیا ہے۔

ایک مضمون نگار نے ص ۱۸ میں EVALUATIVE کا ترجمہ توضیحی کیا ہے، کتنی گمراہ کن بات ہے۔

مبادیات کا لفظ مختلف اصحاب نے استعمال کیا ہے ص ۲۸ ص ۸ وغیرہ، یہ کوئی لفظ نہیں، اس کی جگہ مبادی لکھنا تھا۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، جو یونیورسٹیوں میں ریسرچ کے معیار کو .... (رہبر میں اسی طرح) حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میرے نزدیک یونیورسٹیوں میں اچھی اور معیاری ریسرچ کے نمونے خاصی تعداد میں مل جائیں گے"۔ ص ۳۸ انھیں تحقیق سے دور کا بھی سروکار نہیں۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہو گا کہ وہ کن مقالوں کو معیاری ریسرچ کا نمونہ سمجھتے ہیں۔

ایک مضمون میں ہے کہ غالب "نظیر آبادی کے متعلق بہت بری رائے رکھتے تھے"، ص ۴۶ رکھتے ہوں گے مگر اس کا ثبوت کیا ہے؟ ایک مضمون میں کئی جگہ ہجری سنہ کے ساتھ ایک عیسوی سنہ دیا گیا ہے ص ۵۶ وغیرہ۔ میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ خاص سنین سے جن کی تعداد کم ہے، ہٹنا (اور بعض کی تاریخ بھی) معلوم نہ ہو، تو دو عیسوی سنہ لکھنے چاہئیں۔ بیسویں صدی عیسوی میں اس جنت نشان ملک میں مدح سرائی کس حد تک جا سکتی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس مضمون میں شبلی کی ۶ کتابوں المامون، سوانح مولانا روم وغیرہ کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ "اب ان موضوعوں سے متعلق کچھ اور لکھنا محال ہے"۔ ص ۶۳

یہ نہ سمجھا جائے کہ مضمون نگار عربی سے ناواقف ہیں اور ' محال ' کے معنی سے بے خبر۔

ایک اور صاحب فرماتے ہیں "معیار اور مثال تک رسائی ناممکن ہے" ص ۱۳۶ "مثال" سے کیا مراد ہے اور "ناممکن" کے کیا معنی لکھنے والے کے ذہن میں تھے، اس کی خبر نہیں، مگر یہ واضح رہے کہ وہ عربی سے قطعاً ناواقف تھے اور فارسی برائے نام جانتے تھے۔

کتاب میں تکرار مطالب اس قدر ہے کہ پڑھنے والا اکتا جاتا ہے، مختلف الانواع اغلاط بھی موجود ہیں، اگر لکھنے والے ان کے ذمہ دار ہیں، تو ان کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح کرا لینی تھی اور اغلاط طباعت کی درستی کے لیے غلط نامہ ہونا تھا۔ اس سے نہ ڈرنا تھا کہ بعض اصحاب اس سے چڑتے ہیں اور غلط نامے کا شمول ان کی برہمی کا باعث ہوگا۔

قاضی عبدالودود (بار ایٹ لا)

تصحیح و اضافہ

دیوان رضا

کتبخانہ خدابخش کی فہرست مخطوطات فارسی جلد ۳ کے ضمیمے میں دیوان رضا عظیم آبادی کا ذکر ہے (۲۹۴۴، صفحہ ۲۵۷) فہرست نگار کی رای میں یہ دیوان رضا عظیم آبادی کا ہے، جس کے حالات کی زندگی انھوں نے نشتر عشق تذکرۂ شعرای فارسی کے حوالے سے درج فہرست کیے ہیں:

"میر محمد رضا، معروف بہ میر محمدی نے ابتدائی تعلیم میر ضیاء الدین شاہجہان آبادی سے پائی۔ میر محمدی عظیم آباد سے مرشد آباد گئے، جہاں ۱۲۱۶ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مادۂ تاریخ وفات "افسوس از رضا" اس وقت ان کی عمر ۵۳ سال کے قریب تھی۔

یہ صحیح نہیں کہ ابتدائی تعلیم میر ضیاء الدین سے پائی۔ نشتر عشق میں مرقوم ہے:

"در بدو حال صرف و نحو فارسی تحصیل نمودہ، رغبت بانشای نظم ریختہ پیدا کرد، و اصلاح از میر ضیاء الدین ضیا تخلص شاہجہان آبادی کہ شعر ریختہ بسیار خوب میگفت، و بعد از خرابی دہلی بعظیم آباد آمدہ بود و باش اختیار کردہ بود میگرفت"

نشتر عشق میں رضا عظیم آبادی کے دیوان فارسی کا مطلقاً ذکر نہیں، اور ان کا صرف ایک فارسی شعر مندرج ہے:

"کشتن چہ لازم است بایں خشم و کین مرا — از ناز چون نمیکشی ای نازنین مرا"

یہ شعر نسخۂ زیر بحث میں نہیں، اور ورق ۲۹ الف میں شعر ذیل ہے، جس سے رضا کا بلگرامی ہونا قطعی طور پر ثابت ہے:

از شفائی ببرد گوی سخنگو یہا — بلگرامیست رضا گرچہ صفاہانی نیست

رضا بلگرامی کا صاحب دیوان فارسی ہونا صفیر بلگرامی سے ثابت ہے اور نسخۂ زیر بحث انھیں کا ہے۔ صفیر نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، درج ذیل ہے:

"اگرچہ یہ اردو میں مصحفی کے شاگرد تھے، مگر فارسی کہتے تھے اور فارسی کے شاعر تھے۔ لکھنؤ میں

مدّتوں تشریف رکھے اور سرکار سعادت علی خاں میں بہت دنوں تک توسّل رہا۔ آخر اپنی شادی کی وجہ سے آرہ ضلع شاہ آباد میں آئے اور پھر نہ گئے۔ یہاں ایک انگریز نے ان کو زبان اُردو سیکھنے اور فارسی پڑھنے کے لئے نوکر رکھا۔ آخر اوس کے ذریعہ سے گماشتۂ افیون مقرر ہوے اور برس روز قبل غدر کے بہ نیکنامی تمام و فراغت مالا کلام علیگنج سیوان سے بیمار ہو کر آئے اور آرہ میں انتقال کیا۔ یہ مولّف کے بزرگوں میں ہیں۔ سیّد تبارک حسین والد سیّد محمد رضا بلگرامی کے ہیں۔ میرے پر دادا کے والد سیّد خورشید علی خورشید ان کے حقیقی ماموں تھے۔ خاندان نواب نور الحسن خاں بلگرامی کا اہتمام بعد سید خورشید علی کے سید تبارک حسین کے ہاتھ سے ہوا۔ اور وقت انتقال نواب صاحب تک یہی مدار المہام رہے۔ سید محمد رضا بڑے طبیعت دار اور خوش خلق اور منکسر اور متین تھے۔ فارسی میں ایک دیوان اور دو مثنویاں فارسی ایک کا نام دلآشوب عاشقانہ دوسرے کا نام ..!.[1] اس میں اپنے بھائی سید غلام رضا مولّف کے حقیقی خالو پر مکان کے گرنے کی کیفیت بہت فصاحت کے ساتھ لکھی ہے اور ایک قصہ گنجینۂ محبت نام بزبان اُردو اور چند اوراق غزلیات اردو کے۔ مولّف نے ان سے پڑھا بھی ہے اور اصلاح بھی لی ہے۔ کلام اردو آپ کا یہ ہے:

گر کرے زیب گلو وہ نوجوان سبزہ رنگ — فیض رنگ سبز سے تسبیح مرجاں سبز ہو
ماہرویں نے کہا تم کو تو عالم نے کہا — میرے ہی کہنے سے صاحب عرش کے تارے ہو
ناصح نہ سنیں گے لب نوشیں کی قسم ہے — شیریں سخنی تیری ہمارے لئے سم ہے"[2]

۱- کذا، بیاض - ۲- جلوۂ خضر ج ۱: ص ۱۹۸ - ۱۹۷

صحت نامہ فارسی اور ہندوستان

صفحہ/سطر	غلط	صحیح
۵/۸	تخت	تاخت
۶/۴	جہاں	جہان
۶/۱۳	فرس کے	فرس کی
۷/۸-۹	کیا کیا	کیا
۱۳/۱۷	ہیں	میں
۱۵/۲۰	فارسی یہ	فارسی سے یہ
۱۷/۵	یگم	گُم
۱۷/۸	مرد	مردہ
۱۷/۱۲	رود ؛ چوں	رود چوں
۱۷/۱۸	چند ؛ پی	چند پیٔ
۱۹/۲۰	دل چلا	دل جلا
۱۹/۲۳	کھینچا نانی	کھینچا تانی
۲۰/۲	PRCPIXES	PREFIXES
	SUPPIXES	SUFFIXES
۲۰/۴	دول	ڈول
۲۰/۱۵	اوپادھیا	اوپادھیای
۲۴/۱۷	بحریں	بحرین
۲۵/۴	خولیستن	خویشتن
۲۵/۵	محبت	صحبت
۲۵/۱۳	عام میں	عام ہیں
۲۶/۱۲	سہتی	بہتی ہے
۲۶/۱۳	ملتا	ہلتا
۲۸/۶	ابری ؛ جرش	ابر ؛ جوشش
۳۰/۸	EPIBRAPHIEA INDO MOSLEMICE	EPIGRAPHICA INDO MOSIEMICA
۳۱/۳	حزاروں	ہزاروں
۳۱/۱۳	کونی خط	کوفی خط
۳۱/۱۶	کنبے	کتبے
۳۲/۲۲	سنتہ	سنہ

صفحہ/سطر	غلط	صحیح
۳۳/۱۴	نو بیر	نوبر
۳۳/۱۶	حریم	حرم
۳۵/۶	کے	کہ
۳۵/۹	حط کے	خط کہ
۳۷/۱۵	جچیزی	بچیزی
۳۸/۲۱	اپی	ابن
۳۹/۱	بپنای	بنای
۳۹/۹-۱۰	کتبہ	کتیبہ
۳۹/۱۲	سنہ	سنتہ
۴۱/۱۰	خطو	خطوط
۴۱/۱۷	آکاریوز	آر یوز
۴۳/۲۲	نفوز	نفوذ
/۲۳	تغمیر	تعمیر
۴۵/۱	عبارتیں	عمارتیں
۴۶/۴	چترراامن	چترمن
۴۶/۱۶	اس کا کام	اس کام
۴۷/۱	میں پیرس	پیرس
۴۷/۵	Miniiture	Miniature
۴۷/۸	coure	court
۴۸/۱۳	اُن	آن
۵۰/۶	معاصری	معاصرین میں
۵۲/۲	ہو جاتا	ہوتا
۵۳/۴	ہے ۔ اس	ہے، اس
۵۶/۴	نودہ	نمودہ
۵۶/۷	کشتند	گشتند
۵۶/۹	حانط	حافظ
۵۷/۲	قال	فال
۵۷/۴	شاع	شاء

صفحہ/سطر	غلط	صحیح
۶/۵۷	لسان اللعیب	لسان الغیب
۲۲/۵۷	تاریخ سے نکلتی	تاریخ نکلتی
۵/۵۸	آخیر	اخیر
۱۲/۵۹	کو تاریخی	تاریخی
۷/۶۰	نعیس	نفیس
۴/۶۱	۱۰۱۴	۱۰۱۴ھ
۸/۶۱	والار	والد
۲۳/۶۱	بیشہ	پیشہ
۷/۶۳	عفر	غفر
۱۱/۶۶	ملا سلطان	ملا سلطان
۱۴/۷۲	شاہزادویں	شاہزادیوں
۶/۷۳	میں اور اردو	میں اردو
۷/۷۳	کی وجہ	کی وجہ سے
۸/۷۳	ہوا	ہوتا
۱۸/۷۳	الفیقرا	الفقرا
۱۰/۷۴	صاحب قران	صاحبقران
۱۹/۷۵	پٹھالہ	پٹیالہ

صفحہ/سطر	غلط	صحیح
۵/۷۶	فرستاد	فرستادم
۵/۷۷	بڑھی	پڑھی
۱۶/۷۷	سگ	سنگ
۷/۷۸	صفخہ	صفحہ
۷/۸۶	الابیہ	الانبیہ
۲۳/۸۸	اول	اول میں
۱۳/۹۰	التمش	التتمش
۱۶/۹۱	فارسی۔ فارسی	فارسی بہ فارسی
۱۵/۹۲	معلوم ہیں	معلوم کیے ہیں
۲۱/۹۲	متن	منطق
۸/۹۳	خلخانی	خلخالی
۴/۹۵	متن کیا	متن تیار کیا
۵/۹۶	ذریعے نہیں	ذریعے سے نہیں
۱۳/۹۶	الملتہ	الملۃ
۲۱/۹۶	ظرائف	ظرایف

۱۱ - کولوٹولہ اسٹریٹ - کلکتہ

جناب مکرم

افسوس ہے کہ کثرت کار اور ہجوم احباب سے اتنی فرصت نہیں ملتی

کہ خود حاضر خدمت ہوتا۔ پریس کی نسبت ضروری معلومات بہم پہنچ گئی ہے

اور صرف ایک گھنٹہ کا کام رہ گیا ہے - میں اسکو ابھی طے کر دیتا

مگر ہجوم احباب ایک گھنٹہ کی فرصت نہیں دیتا - اسلئے آج شام کو ڈھاکہ

روانہ ہونگا اور پھر جنوری کو یقیناً واپس آجاؤنگا - پہلے سے ۱۷ تاریخ

کا مقرر وقت ہے اور ان شاء اللہ تب جلد قیام پریس کی صورت ہو جائیگی

لیکن ایک نہایت ضروری معاملہ ہے جو اس وقت اس خط کے

لکھنے پر مجبور کر رہا ہے - اگر ضرورت شدید تقاضی نہ ہوتی تو میری خودداری اس خط

کے لکھنے سے سخت مانع آتی

میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک ماہ کی تنخواہ متعلقِ "اخبار" مجھے اسی وقت بطور پیشگی

دیدیں تو جبکہ پیشگی دیدیے میں کوئی امر مانع ہو تو ماہ کے واپسی پر

LIBRARY PUBLICATIONS

(Handlists & Descriptive Catalogues of the Mss. of the Library)

Persian Manuscripts General :

1. *Handlist of Persian Mss.*, 3 vols. (in Persian language) 279, 177, 295p — Rs. 30/-

Persian Poetry :

2. *Catalogue of Arabic and Persian Mss.* Vol. I : Persian Poets : Firdausi to Hafiz (in English language), 274p — Rs. 35/-
3. *Catalogue of Arabic and Persian Mss.* Vol. II : Persian Poets : Kamal Khujandi to Faydi (In English language), 222p — Rs. 35/-
4. *Catalogue of Arabic and Persian Mss.* Vol. III : Persian Poetry : 17th, 18th and 19th century, (in English language), 280p — Rs. 35/-
5. *Supplement to the Catalogue of Arabic and Persian Mss.* Vol. I, 267p — Rs. 35/-

Arabic Manuscripts General :

6. *Handlist of Arabic Mss.*, 3 vol., (in Arabic language) 291, 561, 210p — Rs. 30/-

Quranics & Traditions :

7. *Catalogue of Arabic and Persian Mss.* Vol. XXIX : Arabic Mss., Quranic Science (in English language), 104p — Rs. 15/-
8. *Catalogue of Arabic and Persian Mss.*, Vol. XXX : Arabic Mss., Tradition (in English language), 157p — Rs. 10/-

Urdu Manuscripts :

9. *Handlist of Urdu Mss.* 29p — Rs. 5/-

Printed at Tara Press, Tripolia, Patna-800007 and Published by Mahboob Husain for Khuda Bakhsh Library, Patna-800004.

Notes : Of the five copies of the Maktubāt, seen by the present writer, he Abdāli manuscript of Manersharif is incomplete; that of Biharsharif is now no longer available, while the Patna manuscript of Khudabakhsh Oriental Public Library, though complete is defective in that a few folios are disarranged, and the missing and torn portions of many pages, here and there, have been pasted by white or tissue papers. Its first three folios contain the copies of the 56th and some other letters of Shah Husain Muiz entitled Nausha-i-Tauheed, the compiler of the Maktubat of his peternal uncle, Maulana Muzaffar Shams Balkhi. The fly leaf gives 1264 F, 17 Safar as the date of the binding and also the name of the seribe as Masihullah. The colophon gives the name, parentage and the geneological table of the transcriber, alongwith the final resting place of his ancestors, including Saiyed Ahmed Jajneri. The variations in the contents of this and those of the Balkhi manuscript of Fatuha Khanqah which is by far the best, the oldest, and the most reliable of all that the writer has come across, are very few, almost negligible. The first seven folios of this manuscript consist of a very well written copy of the table talks of Makhdum Shāh Āmun, one of the Chief disciples of Hazrat Shaikh Makhdūm Maneri. The colophon also contains many seals and what are more important, miscellaneous scribblings of the original owners, particularly of the famous theologian, mystic and logician of mid 18th century Bihar named Maulana Ghulam Yahya. There are many marginal notes of this well known Bihari, Scholar. This manuscript, written in good Nastaliq, has a full list of the contents in the beginning as is the case with the manuscript of Khuda Bakhsh Library.

•

gales whereas the invincible house of the sustainer of the cosmos is strong. The ridge pole of the house is low. It is leaking and the drops are falling like strings of pearls (the worn out home gives way to the torrential rains which break it in the middle.

5. Jārun Tor Chalkai Jālun Bikat Katār; Jehi Karot so tas Bhākhe Tehi Bha'o Bhinsār i.e. The unsteady glittering overflowing water appears as a clawlike dagger; whatever one does or performs, one continues to speak about that till the coming of the dawn.

6. Āmi Kaun Tan Pakherwān Jangal Karanh Udās; Kankar Chunh Jal Beenh Dhani, Na Chho'u Na Bās i.e. Of what body am I; the bird in my physical frame is like a forest which becomes desolate when forsaken. I pick up the pebbles to purify or raise the level of the water without there being any temptation or desire to remove all obstacles in the path of knowledge or union.

7. Jaith Asādh Na Ā'inyān Pātan Bhar Bhar-Bānh Tai'yi Bhari Bisār (Tusār) Dhani Tehki Jal thal Nānh i.e. Even before the advent of the oppressive months of Jaith and Asadh there has been a luxuriant growth of the leaves (infinite blessings of the Lord). For him it is not a big thing to make a marshy ground half covered with water and to keep plentiful frost or snow concealed within the clouds.

In a fairly long letter (63) full of highly abstruse, mystical and spiritual sentiments regarding self-abnegation and absorption in the Deity, the writer refers to what may have been an important Hindi Distich, for we are told "the lives of hundreds and thousands of travellers of this high path may be offered as a sacrifice (qurbān) for the sake of this single Duhra (Doha). Unfortunately, only a portion of it, and even that difficult to decipher and render correctly, has been given : "Sāyeen Aik Halak Rāji Taras Kun Teh Ā'o" (The worshipful Lord is one; cling to Him; and come in the row; and lose yourself in Him (Sic !).

•

led him to foreshadow the coming debacle of the Ilyās Shāhi dynasty. The history of this period of Bengal history is very confused and controversial.

We may conclude this paper which has already become too long, with a very important feature of this collection of correspondence, and that is the occurrence of more than half a dozen of Hindi Dohras, in three or four letters, 121, 172, 173 and 63. It is difficultt to determine the exact or correct reading of these Dohras specially the first of the series though they appear to be much like the same in the two manuscripts which have been consulted and collated. Nor is it possible to say anything about their authorship. What can be said at best is that both the writer and his Pir who have been mentioned in connection with the first verse, despite their orthodoxy, were quite familiar with, and even appreciative of, the indigenous language what ever it might be, which was current in their environment. It is for the Hindi scholars, specialists in linguistics, to give them a correct reading and also rendering, and to see if they are or are not specimens of old Brijbhasha with some sprinklings of the two of the triple Behari dilaects, Bhojpuri, Maithili and Magahi. They read as follows :

1. Aikat Kandi Bedhiya Bahutar Bhar ke Gā'in; Jatā (Chintā) Heen Man Ranjhiyā(Ichcha) Maran Tetahi Nahāin, i.e. Strictly collecting one's self (gathering together of ideas) in various ways, and to his heart's content, he sang (glories of the Lord). Being free from anxieties and attachments, and abandoning his desires he became submerged in the great mysterious unknown.

2. Bāt Bhali Par Sānkari, Nagar Bhalā Par Dūr; Nānh Bhalā Par Pātlā, Māri Kar Har Chūr i.e. The path is good, but it is narrow and difficult. (The road to infinity is glorious but shrunken); the town (other world) is good, but it is at a distance The Lord is good and beningn, but He is subtle, one has to break one's self into pieces to reach Him.

3. Sānkar Ku'e Patāl Pāni, Lākhanh Bund Bikā'e; Bajar Paro Teh Mathura Nagari, Kānhā Piyāsā Jā'e i.e. The well is narrow; the water is deep down the earth; and drops are well over lakhs. May lightning fall on the town of Mathura from which Krishna has to go thirsty.

4. Kahā Yon (Kahā Pavana) Āpan Ghar Thatthar, Kahā yon (Kahā pavana) Nisat Tuhār (bahtar); Beech Balandya Ghar Chuve, Bund pare Ratanhār i.e. To such a degree is my thatched house (frail frame of my body) tottering that it cannot withstand the terrific

would fall into misfortune and difficulty (from which you cannot extricate yourself). When you admit them in your nearness they would like to involve you in sin. Don't entrust a work into the hands of the infidels by reason of which they would become a wāli (Governor—ruler or superior) over the Musalmans, exercise their authority in their affairs, and impose their command over them. As God says in the Qurān, 'It is not proper for a believer to trust an infidel as his friend and wāli, and those who do so have no place in the estimation of God'. Hear God and be devout and pious; very severe warnings have come in the Kitāb (holy book) and traditions against the appointment of infidels as a ruler over the believers. For the pious and the abstinent God opens out such a path of support and subsistance as can scarcely be thought about".

Historically, the mention of the end of the eighth century (Hi-sad tamām shud) and the warnings given to the Sultan by the writer, who claimed to speak under divine guidance, against elevating a Hindu official to the highest place and nearest to himself, are of capital importance. There is some controversy about the date and manner of the death of Sultan Ghayāsuddin Azam Shah. His coins have been found with dates as late as 813-1411. As his reign in Sonargaon and Satgaon ran parallel to that of his father during the last four years of the latter who died resisting his rebel son in 795, the references in the letter to the timing and to the martyrdom of Sultan Sikandar are in accord with what is given in recorded history. The last farewell letter dercribed as Widā'ī or valedictory, must have been written in or just after 800 for he soon left for Aden where he died in 803. Sultan Ghayāsuddin is said to have been succeeded by his son, Saifuddin, who was followed by two other non-entities, the last of whom was dethroned after an ephemeral reign of barely a year by the dominating Hindu Wazir, Kans or Raja Ganesh of Bhaturiah. If the author of Riyāz-us-Salatin is to be believed, this powerful Hindu chief had risen to great height, even under Sultan Ghayāsuddin, and after causing his death by his machination and treating his sons and successors as mere puppets on the throne, usurped the regal position. The pretender had, however, to give way before the joint pressure of Nur Qutb Alam, the saint of Pandua, and his supporter, Sultan Ibrāhim Sharqi of Jaunpur; and he handed over power to his twelve years old son, a Muslim convert, who founded a new dynasty of rulers in Bengal. The saintly writer cannot be credited with predicting the future events in any way, but there was probably much in the then exciting situation which might have

come he had become very old, aged about ninety. The sultan caused a proclamation to be issued at Delhi to the effect that whosoever had any grievance against him, he should come, catch hold of his shirt, and put forward his claim, and he would be too glad to satisfy him.

"The extent of affection which the poor fellow bears for you is best known to you. He is your well-wisher. Correct affection and well-wishing lie in speaking the truth and disclosing prudent measures : otherwise it would be a betrayal of just claims. The eighth century has passed out and the signs of the coming Resurrection are increasingly visible. An Empire like that of Delhi with all its expanse and abundance, spiritual and physical comfort, peace and tranquillity has turned upside down (is in a topsy-turvy condition). Infidelity has now come to hold the field; the condition of other countries is no better. Now is the time, and this is the opportunity. I, the slave of God, used to see that Sheikh-ul-Islam Sheikh Sharful Haq, may God sanctify his secrets in his grave! had ever been favourably inclined towards this land and this country had also been favoured by God. He had kept Sheikh Sharfuddin, the advance guard (of spirituality) in this land. Howsoever much Sultan Firoz (Tughlaq) and others on his side wished that he should write something specially for them so that they might keep these as a memento he never wrote anything specially for or sent that to them On the other hand, he felt hearty pleasures in writing letters to the martyred Sultan (Sikandar, father of the addressee). You have had the effects and legacy of those blessings on yourself."

The long letter concludes with the following important observation and counsel. "God the great and Almighty has said 'Oh believers, don't catch hold of the lining of the garment of those who are low and vile'. The substance of what has come in the tradition and commentaries is this : Oh believers, don't make strangers, that is infidels, your confidential favourites and ministers of state. They say that they don't allow any to approach or come near to them and become favourite courtiers; but it was done evidently and for expediency and worldly exigency of the Sultanate that they are entrusted with some affairs". To this the reply is this that according to God it is neither expediency nor exigency but the reverse of it; that is an evil and pernicious thing (tending to disturb or corrupt). Therefore it was incumbent on us that in this matter we should listen to what God has said and keep our flimsy pleas aside. He says 'Wadoo mā 'anittum', i.e. they would choose for you that by which you

"One or two important affairs (Muhim) which you had to face due to your obvious position in the state were really momentous, and they may be taken to be affairs of Islam. The Darvesh is with you and is a virtual sharer with you, and physical separation does not count. By the grace of God you will accomplish your purpose. Whenever any important affair confronts you, you may send the information about that to me at Mecca either through letter or through individual messenger. After achieving success you should occupy yourself with the uprooting of heresies (bida'āt) and suppression of all innovations not prescribed by Law (Muhaddasāt-i-nā-mashru); you should enforce the payment of the prescribed alms (Zakāt). Oh my son ! you should keep in mind the counsels offered by this humble poor man, Muzaffar Shams, who is your well-wisher from the earliest time upto this day. It has been a tradition that such men as were learned, worthy of company and love had nearness for spiritual secrets and opinion, in the eyes of the Prophets, saints, and Sultans have been God-fearing, pious and just people and they have wished well for the slaves of God, and not every self-centred, haughty and avaricious persons... In my opinion among the rulers of the earth, these gifts have been bestowed by the Almighty God upon you, for your good deeds have been met with approbation. Those wretched people who take pride in the apparent dominion they have and that has been given by God even to infidels are totally destitute of all good things of great signification. The fitting robe of learning, liberality, munificence, intrepidity and a heart of lion have been gifts of God to you.

"Sultan Firoz (Tughlaq), may God pardon his sins, had been very much devoted to Mashā'ikhs (saintly personages). For a few days His Holiness Saiyid Jalāluddin (Bukhāri), may God keep the place of his eternal repose cool ! had come to him. He was associated with him and derived many (spiritual) things from him, and he constantly acted upon the same. He had developed a habit that when he was in a furious mood he talked about punishment by killing and retribution. But before the order could be put into execution he hastened to admit that his words should not be construed as his orders, for what he had said might be taken as wrong accusations (Qazaf). On this occasion in such matters he sought the Decrees of judges and the expositions of laws by their expounders, and he pressed them for precedents, and then issued his orders. He would exclaim "Oh God, it is not your slave, Firuz, who gives orders; it is the religious law (Shara) which so orders. At the time the Saiyid had

concerned this is just the beginning and serves as a preamble of love; and God willing, the fruit would one day ripen and you may some day partake of it".

Leaving aside the numerous allusions in other letters which are not absolutely devoid of interest and are pregnant with observations and instructions on matters mostly spiritual and mystical, we may proceed to letter 163 which was sent in reply to one received from the Sultan. It contains many statements not necessarily linked on to one an other in a consecutive chain; and statement is complete in itself. "In the previous letter something has been written about the path of God pursued by goers (Sabil-ul-Lāh) By God the great... this kind of attention and favours which the King has displayed and the affection and yearning for meeting me that you have evinced has been expressed repeatedly in all the Farmans, specially the one just in hand, which deals with pangs of separation in lyrical poems, bidding farewell, give indication of maturity of composition. This would have influenced me, had the matter lain in my hands, and I would not have passed out of the King's threshold. But God's will overcomes all other affairs. Ill-circumstanced and afflicted in mind as I am I, nevertheless, know that such sonnets are not to be taken as merely metaphorical or superficial, but are the outcome of genuine and real feeling. The tone of the farewell poem is like a heart-piercing arrow; but what can this slave of God do; the reins of action and decision lie elsewhere. You did a great thing in that you did not give me a place very close to yourself, but have found a place in me, a madman; because of me you have become a beloved of my friends......

"In my opinion, by the gifts of God, the cherisher of mankind, you have developed a capacity of looking at the inside of things of the pure faith and the understanding of things of manifold signification. It appears that my heart would be opened out to you. A pious inspired man, Abdul Malik, has been a recipient of my letters which might form a volume: It may be at Pandua or at Muazzamabad, but I don't remember where it exactly is. Oh my son, get the permission and go through its contents. Something of my inward part may be opened out to you. You are the second person on whom I have poured out my secret (mystic) thoughts. It behoves you not to disclose my discourses to anyone else. Everytime that you go through my writings you will have fresh and new pickings and you may think that you had not correctly comprehended the real import on the earlier-reading.

We, however, get an interesting reference to SultanFiruz Tughlaq which is confirmatory as well as supplementary. Not the least in importance is the opinion expressed and the advice offered to the royal addressee, on the perusal of which it is likely for one to question as to whether catholicity of views, broad-mindedness and the spirit of toleration had as strong a hold on this Firdausi saint of Bihar as on most of the Sufis of major orders, with possibly a single exception of Abdul Quddus Gangohi of the Sabiria section of the Chishti order, as is revealed from the gratuitous counsel he offered to Emperor Babar. Considering the time and condition under which the two wrote about not appointing Hindus to high places in administration and the need of preventing them from domineering over the Musalmans much can be said by way of allowances and explanations.

It is not possible to deal with even the important extracts of all the letters and, therefore, we would confine our attention to two. The moving references in the following passages in letter 151 speak for themselves. "The auspicious farman has been received. It is beyond the writer to couch the reply with words and expressions which are polite, suitable and affable. For both the hand and the pen are weak and infirm and the love-sick heart is in anguish". The farman of the King was charged and replete with pearls and jewels of significations. It included a quatrain which is this "Ai-mast-i-Sharāb i-Zauq-i-bātin—Sarkhush ba madām shauq-i-bātin—Yak jur'a ba kām-i-īn gadā rez--Ai Khusraw-i-jooq jooq bātin" (i.e. "oh you who are intoxicated with the wine of esoteric tastes (flavour)—you who are merry-headed having a perennial yearning for the inward parts of things; Pour a drop on the palate of this beggar—Oh kingly soul fully imbued with secret (mystic) thought which come to you in lots (groups)". Although I was sober and sensible, the quatrain threw me into a state of inebriation. How and by whom can the drop be offered and to whom—the cups and the goblets are bound to come close to the goers (travellers : Sāliks) who set aside ego and self-conceit and traverse the road of the dictum "Die before death comes". I can bear witness to the fact that the sacred and the Almighty God has granted to the King plentiful dozes of tastes and pleasures in mystical and spiritual matters, and has endowed him with an increasing share in understanding the import of apparently enigmatical discourses of the Darweshes. In the farman you have referred to your affection for me and your eagerness to see me, the poor fellow...... By God it is the love of God and yearning to meet God which really counts, with this poor man. So far as you are

the saltish shore and thus come out purified of all my contamination. But my black (vicious) sins followed my steps. I do not know when such a thing would happen. Ah. Alas! I know not whether I would achieve my object through the will of God or in the desire I would die....one thing is certain. If God so wills, and I proceed towards that place for a second time I would go there to die". There is a cryptic reference to the first visit in letter 140, "this poor man has always had blessings and prayers of friends from the land of Arabia to this land". There is a reference in letter 165 also to his having bid adiu to the Sultan and left for the house of God to be devoutly employed (Mujāwarat) there. In letter 165 the writer refers to a dream in which the Prophet appeared to have invited him to the Arabian land. These dreams, as he writes. "have brought me upto this place in this far off kingdom and placed me in the auspicious royal threshold during the past two years. Now I request for leave so that by way of charity the king may give me a send off towards Chatgaon, and to this effect a farman may kindly be issued. All the hairs of this helpless one have become completely white; the teeth have left off their roots; the old age has brought blindness very near".

Apart from the theological, moral and mystical essences which form the central theme and are the heart of the work, there are thus certain biographical touches and incidental references which shed some light on the practical aspects of social life which attract one's attention. But more important to a student of history and culture are the dozen letters addressed to the third Sultan of the Ilyās Shāhi dynasty of Bengal, containing matters which show the Sufism of the writer in its historical form. In two or three letters there is no clear mention of the addressee's name but the context establishes his identity. The letters are numbered 148, 163, 165-167, 179, the last being the longest. They reveal that Sultan Ghayāsuddin Shah was a religious-minded ruler, deeply interested in Islamic mysticism, and he was also a man of literary tastes who could compose good and meaningful verses in Persian. He was frequently in correspondence with the Balkhi saint, the distinguished and prolific writer of mystic letters, as his father, Sultan Sikandar, had been allowed by H. Sharfuddin Maneri to be in communication with him on religious and mystical subjects. The saint of Bihar loved Bengal and there was frequent exchange of letters, written and received by the Bengal ruler. Unfortunately, all traces of such written dialogues between the two are now lost and the various volumes of the Maktubāt of the Maneri saint give no clue to such a thing.

Bihar near the Rauza (shrine) so as to make frequent religious visitations. Such a thing is open and is being resorted to by both Musalmans and Hindus". Thus this refers to his visit of some places in Oudh. In letter 42 he tells us about his wanderings, "I flee from a city to city, from a village to village, from one wilderness to another". In letter 115 he refers to a 'Kunj' (a corner or confined place) in which he, "a resourceless, totally destitute, without domicile, had kept himself confined for some years", and he had no such body of men for whose "necessary expenses for living (Nafaqa) he might be responsible according to the religious law (Shara)"; and as for those who were around him, "they were as helpless and unprovided for as he himself". By the blessing of the Sheikh, may his grave be hallowed, he had, however, no worldly attachments.

This 'Kunj' must have been somewhere in Bengal. In letter 152, addressed to Sultan Ghayāsuddin Āzam Shāh he writes, "I, the helpless one, have already bid adiue to you, exalted of God, at Gangura. Now the season is near at hand. You may do the favour of sending a farman to the agents or directors (Kārkunān) of Chatgāon to the effect that this poor man, along with a few Darveshes, is intent upon undertaking a journey to Ka'ba; that all the Faqirs have been assembled; and all should be put into the ship of the first season". Addressing the same Sultan in letter 148, he writes, "the four months of the ship season are ahead of us; there are eight months still left; during all this while I have spent my life as a guest in the auspicious threshold of your majesty; may not your exaltation lessen ! I have revived from my illness after four months; it is for God Himself to afford cure and give illness". In letter No. 167 which deals mainly with the question of Zainab, a wife of the Prophet there is an important personal reference. "This house where the King, may God the most high preserve him ! has made me halt is outside this city. It is an airy solitary place a pleasent corner of retirement without hinderaces whatsoever. Was it in the vicinity of Chittagang ? In letter 180 we get a more definite information. "This poor man arrived at Muzzamabad by the grace of God. A further march forward of the bridle of design lies in the hands of impelling destiny as in the past".

Reference here is to the earlier journey to Arabia and the first visit to the holy sanctuary at Mecca. Letter 81 says, "It has been the ardent desire of this helpless man that he should again undertake a journey towards the Qibla (Ka'ba in Mecca towards which the Muslims turn their face when in prayer). Perhaps I may fall into

'Āstāna' and carried the contamination of myself from that place". The question arises as to when and where he went. In an important letter (132) he acknowledges the addressee's letter along with a present in the form of an Egyptian prayer-carpet (Musalla-i-Misri) through Khwaja Hisāmuddin Bazzāz (a dealer in clothes) and says "It is about five months that I came here and have occupied a place in old Delhi (Dehli-i-Kuhna) under the conviction and in expectation of pursuing the paths of the mendicants". It is difficult to say as to when this happened. In letter 101 he practically invited a disciple to Delhi, "what measure of distance lies between him and Dehli? Let him fasten the girdle, come and stay there for sometime and gain something from associations with religious Divines who are mendicants". The author of Manāqib-ul-Asfiā says that his Pir had advised him to leave Bihar for his old place; this time to acquire spiritual learning for he was already a past master in worldy learning. We get also some details of the journey. But we get nowhere any reference to this in the letter.

But this letter was written when the eighth century was about to end for among many other things it says "Hi-Sadi Tamām Mi-Shawad", the day of resurrection is near; death lies in ambush; and provisions for support in the journey is lacking". It appears that after he suddenly left Bihar he first travelled towards the West and then turned towards the East. He writes in letter 138, "I, the helpless one, by reason of ill-luck had been held captive in this land of Hindustan amidst creatures with Satanic, ignoble, and lustful desires..... However much as I wanted to come out of this country and land in Arabia, such a fortune did not come to my hands". The letter 78 addressed to Maulana Alam says, "your letter contained a friendly reproof for abandoning the Pir's ground (Qadam) and settling down here in Awadh. Oh my simple friend! You are keeping your pace below the foot of the Pir; but does this imply mere presence in front of the doors and walls or in the neighbourhood of the Pir's shrine? Know it for certain that had I really found the track or trace of effects under the feet of the Pir I would never have abandoned that place. As I was thousands of farsakh distant from the feet of my spiritual guide I decided to cast away at a distance from that holy vicinity of the pious personage my own contaminated and impure self. As regards what you have hinted about my firmly staying in Awadh, you should know that for one so luckless and distracted person as me there is no firm or chief place of stay. You take 'Qadam-i-Pir' to mean that one should remain constantly in

self with questions of date and location. Therefore, it is dificult to say exactly as to when the letter 21 saying "for twenty and some years that I pursued this one way track" letter 42 telling "this was the confounding twentieth year of this luckless fellow"; and letter 71 indicating "I, the helpless one, had been straying and felt stupified, night and day, for 20 years in this very pursuit", were written. The letter 118 also says, "for years in the past I had heard from my spiritual Master, the Sheikh, may God sanctify his grave, that these were times bubbling (overflowing) with mischiefs and calamities, and the latest that I heard such a thing would be about twenty years". How are all these to be reconciled with what we get in letter 85, which appears to have been addressed to his Pir or Murshid obviously before his death in 782/1381, "for about 30 years I stirred about and struggled, sometimes in all sincerity, and sometimes under false pretences; but I, your attendant, by sitting at your feet and following your ways, was in a position to realise and ascertain it as a truth and as a verified verity that whosoever, either outwardly or inwardly, showed any clinging, even in the least, to things other than of Allah, he would remain attached to and hanging upon that to the last, and would be farthest from God". There are, however, some letters shedding light on time and location. In letter 2 the writer refers to "Haft-Sadiyān" or men of the 7th century, and says "Mā Hi-sadyān aim" i.e. we are men of the eighth century; and also that "the people of Delhi are nearer than us, the people of Bihar, to the sanctuary of Kaaba". Letter 23, addressed to one Prince Khizr, says, "the period of repose and rest of mind is over; O my brother ! today is the end of the eighth century (hi-sadi); that Qarn (ten Qarns generally identified with a sadi) is over; and the people of that age are gone away". This proves conclusively that the commonly accepted date of death of the Balkhi saint, 782 or 785 is without any basis.

Letter 80, addressed to somebody in Bihar on the commotion of love says "You have asked as to what made me come to this side without bidding farewell to the friends—verse; my ill-luck did not spare me to remain in your lane; otherwise I would have continued my stay longer in your threshold". Letter 82 indicates that for some time after the death of his Pir he kept on rendering spiritual service at the place of his eternal rest, for he says, "I was bodily close to and devoutly employed as an attendant (Mujāwir) at the shrine, but really and in my heart I was at a distance of thousand farsakhs (each a league—1800 ft.), and, therefore, I lessened my troubles in the

"But you must keep in mind this one word. In regard to the garment for your self and your family members you should shun exhuberance. If you can get the wearing clothes of Khadi (coarse cloth) worth 3 Jitals (a small coin, 25 of which make a Dām), the same should be put on your body and those of your wife and children; more if more be necessary; less if less be needed. In the matter of costume you should abstain from the ways and habits of other people so that you may be at rest and contented".

"Two things count in the life of a man", says a passage in letter 47 on poverty, "and they are either advantageous or harmful. One finds life to be profitable who had delicious food and had enough of it for full satisfaction, enjoys a sound sleep for long hours, and possesses good wearing garments, a spacious house, lovely women, gardens, orchards to walk in, cultivated agricultural land, trades and business, from all of which they derive comfort and satisfaction. As regards the harms received, these arise from destitution, frustration, infamy, disparagement by God's creatures of tattered clothes, hunger, starvation and from all these they fear and refrain".

There are also many revealing references such as the clapping of the hands (Dastaki zadan) and inducing men to rotate on their legs (raqs) in audience assemblies (74). Sama (117) with and without musician (Mutrib), was forbidden to the worshipper of lust and ego and was counted dangerous (makhtur) in law. It was, however, permissible under certain condition to men of piety given to solitude. Then there is the question of auspiciousness or omens of days and times which has come from astronomers and astrologers. In orthodox Islam there is no day or week which is auspicious or inauspicious. Another thing of importance is the reference to the accumulation of the works of Hadis on Traditions with the spiritual guide of the writer. He wanted on loan the copy of Sahih Muslim and some other books on Hadis which had been brought to his Pir by Maulana Zainuddin of Dewa and also permission to take some notes therefrom (139). We are also told (154) that the Jāma (garment) sent by the Sultan of Bengal was worn by the writer who, however, sent probably as a return (151) a valuable present in the form of the mirror which once the barber while dressing the hair of H. Sharfuddin Maneri used to show him (151).

We have no means of information to fix a chronological order for the letters in the present volume, nor do we know the places of their origin as to whence they were despatched from. Neither the writer nor the compiler of the religious correspondence vexed him-

lasts this might be a necessity and in this there is no blemish either in this world or the next". In this letter he also writes---"I'tikāf (seclusion in house for devoting) does not mean that you should refuse to meet persons who come to you; you should appologize for the delay, if any, and even put up with if there is anything unpalatable". To Qāzi Zainuddin, "the dearest son", he writes (125)—I have heard that you have been vexed much by sexual urge and the ascendancy of youthful passion, and consequently you are highly discomposed, disturbed in mind. May it be known to you that Taqi, son of Sirāj, had also fallen in such a condition, and my spiritual guide, the Sheikh, had directed him to observe the 'Tai' (continuous) fasts. He did so but felt hopelessly exhausted. The matter was again put before the venerable Sheikh, and he directed him to fulfill the great need and purchase a slave-girl so that he might escape from this evil (affliction). Subsequantly he might give her up. This he did not do; had he done that he would have been spared from what you are now experiencing; he suffered for not heeding the advice. Now I have to say some similar things to you. It behoves you to purchase a slave-girl. Beware; otherwise when you are in the anguish of soul and gasping in agonies of death the austerities of years would become fruitless and would be blown away by the wind of lust; then you would have to bewail and face a misfortune; what would you gain ? Your mother and friends do not take cognizance of your condition and you are helpless; be sober and sensible".

Again, dealing with the point that wives and sons are not necessarily to be taken as a veil or curtain he writes in letter 169 to a disciple, Khwaja Hamid—"It has been reported to me that you have performed a good action; you sent letters about it to your friends, but perhaps felt shy and did not write to me anything concerning it. Why should you be bashful ? One should feel ashamed in doing something contrary to the law (religion; but you, my son, have done what is necessary to be performed, according to tradition. Nikāh or lawful matrimony is in accord with the apostolic traditions. Many pious religious men of probity and honour have been householders, possessing a numerous family (Ma'īlān) and some remained celibate and unmarried. Family or household can be no screen covering God from Man.

Emphasizing upon the need of having trust in God and resignation to the Divine Will he inculcated on his disciple, Qāzi Zainuddin, the need of thrift and avoidance of extravagance (129)

(Divan) and on the other hand those who tread the path pursued by religious mendicants. The seeker of a livelihood takes to business and brings all his deeds and knowledge to bear upon acquisition and earning. But the Faqirs (Darweshes) entrust themselves, their wives and children to God. There are many infidels who have dedicated and devoted themselves entirely to their idols but God gives them livelihood without work or earning. Three things were inevitable, resurrection day, death and support or subsistence. A much more explicit observation occurs in letter 132 wherein we get a reference to Khwaja Hisāmuddin (a cloth merchant: Bazzāz), "Oh brother! do look well at this. If your apprehensions are set on the next world most of your deeds would be for that other invisible world; and if you are more concerned with the thoughts of trade and professions of this world and in regard to the food that you are to take and the garments that you are to wear and the profession that you have to pursue then you are to be said as one of concourse and a man of the world...But If anyone labours to earn with the motive that he should acquire the necessary expenses of living for his family and children and does not throw his own burden and needs upon others and his labour or earning provides and supplies what is needed and suffices for his worldly necessities so that his faith and action should be pure and be a responsibility of God, then such an earning with such intention, I hope, would be conjoined with the recorded deeds of the other world. Such a toiling acquirer would be reckoned upon as other-worldly not worldly". The writer gives in letter 177 some details about the three prophets of the past, David, Solomon and Joseph who were kings but ate what they earned by their hands. As regards the Prophet of Islam, wedded to poverty as he was, he swept the house with broom, helped a slave-girl in grinding corns, lit the fire under the cauldron, slept on a mat, put on clothes which were short of the body, and the Izār (trouser) quite above the ankle, covering only about half of the leg. He used to go to the market to have what was absolutely necessary for the living of his family and carried the things himself.

The self-restrained, dedicated, religious zealot was also a practical person, who was quite concious of the promptings of sex and did not advise total abstinence in such matters. Giving his advice to a young disciple, he writes (130)—"You, my son, are in the prime of your youthful life, and it behoves you not to keep yourself off from the slave-girl that has been taken. I am glad that you have had her; and you have my approval. So long as the age of adolescence

Khāns and Maliks with something written to them. Why should I, a contaminated dog, make myself known, and why should I set my steps near them and at their lofty vestibule so as to recall something to their mind? But what can I do? My excuse lies with two verses cited above. It would have been a better sign if Almighty God had enabled me to become unmindful of them, and them to give up all thoughts about me, so that this should not have occurred. But it so happens that I had to write something and send it to persons of worldly positions. But I know not how to write with propriety and politeness in soft worded, appropriate and deserving terms of reproof. This much is, however, certain. I have no desire or covetiousness of any kind from them. It was on the request of a dear friendly person who was going towards that side that I had to write something.

In the preceding (113) letter, on seeking the will of God, he writes, "Even the path or Suluk which a man pursues without any greed and desire for worldly recompense, is 'Sabilul-lāh', such as exertions made in the affairs of the poor and distressed ones, providing food for the hungry, placing water on the roads for the thirsty, founding mosques, running about to acquire the necessary means of supporting the life of his family and children so as to discharge his duty, and so on and so forth. The saintly writer gave a letter for a Malik to Qāzi Sadr Sharaf who had suffered from an accident and recommended him to the addressee's notice so that he might not be put to blush among his relations (32). Similarly, in letter 171 he recommended the case of a man named Kabiruddin Naqib who carried the letter to an addressee and was described as a good and pious person, dedicated to devotion and service to God who had at that time become so disspirited and tired of the affairs of the world that he had given up his job and was on his travels with a view to paying a visit to the mausoleum of the Sheikh (in Bihar Sharif). This was his main object. The addressee was requested to help him in his affairs.

Now let us see what the saintly writer with all his self-effacing other-worldly attitude thought and said on the question of 'Kasb' (avocation, earning. and acquisition). In his very first letter on true faith and trust in God he distinguishes between the habit of the common folk who are deeply concerned with those things which are necessary for the support of life, such as good clothes, lodging for the family and children, those who take to trade or cultivation and earn their bread by serving as learners or teachers or in civil administration

matter of significance anywhere; I resemble the drum which is empty from within and without but fills the world with its sound....I wished that I should have this town spared from my malignancy and arrive at that land. But I feel broken-hearted at the thought that even after such troubles and vagrancy from town to town if I die here what would be my condition".

Khāspur appears to have been an important place at the time in Bengal for it has been mentioned in several letters. The distinguished Balkhi letter-writer must have paid a visit to it, and he had several friends there. In a recommendatory letter (92), addressed to Khawaja Bahrām, we get this—"There is in Khāspur Khwaja Sirāj, an old, abstemeous man of probity and honour who is popularly known as Saudāgar (merchant), but is really a Darwesh in the true sense of the word, as his house is a virtual hospice for poor and indigent travellers and way-farers. His 'Kurar' land (a plot of ground with a raised border for sowing vegetables) had been subjected to a tax by an innovator against what is prescribed by law and the officers of the Diwāni began to realise it. The writer had brought him out of this plight, and the agents of Government (Kārkunān) after entering into some argument had at last granted him an exemption. Now it is being reported that this affair has been entrusted to you. I request you to exempt the aforesaid Khwaja Sirāj, his men and dependents, as they were excused by others. A man should be judged not by his external appearance but by his inward qualities."

Amidst the plethora of such themes as theological devotional, mystical and spiritual experiences, abstruse matters of esoteric Islam requiring knowledge of hidden and the manifest meaning of words and expressions of the Quran and apostolic traditions as well as lofty moral ideas of self-sacrifice, dedication to, and love of, God, there are many revealing passages in several letters indicating that the writer lived in but was outside the world. The letter addressed to 'dear son', Maulana Karimuddin (114) on the subject of rendering assistance in the affairs of Musalmans begin with the verse "with every breath the emperean heaven, liable to be stricken, changes its hues—every mean arranger of words (loose-talker) becomes more despisable for his vile words". Then he writes, "From continual apprehension that such and so may happen, the heart in the bosom of a wise man bleeds; oh friend and fellow-wearer of patched habits! know for certain that I, the ill-fortuned one, obscure, ignorant, unemployed, idle and inactive, have had no business to approach

God...... I am an humble poor fellow having no son or family, am seeking not the world, rank or position, and have in this world no work, concern or commendation. I, the slave of God, keep my madness concealed under the Dastār (turban) and Bārāni (cloak for keeping off rains) and have taken vow before my God that I would not come out of my seclusion except for three places—congregational assembly, Friday prayer, and grave. I have settled that the grave would be my place of residence and I am moving and measuring my steps in such a way as to die before death......" To an addressee in Bengal he wrote, "In my seclusion I pray for your Lordship (Khidmat Malik) but am reluctant to render you any open service. I hope you would excuse and exempt me from your invitation and assembly".

In a letter to Qāzi Alam in Bihar (83) he writes from Bengal, "I, the poor man, came to this side, having made up my mind to undertake the journey towards the Qibla (the sanctuary of Mecca). My relatives and friends stood in my way and I had to postpone it and stay on for sometime waiting for the suitable opportunity, and also for some words through my brother from my Sheikh (spiritual guide) who is there in his Āstāna (saintly threshold)....though you had written that many friends there had become displeased with me for leaving that place, I myself feel displeased with myself; they need not feel angered against me; what should I do; there is no rest or stability in my mind; but I want that this restlessness and instability should increase further."

To one, brother Rājan, he writes in letter 79, "your letter has been received and its content has been learnt. There was much of eagerness to meet and affliction at separation which was, however, destined by fate. Much as you, my brother, endeavoured that I, the resourceless, wandering one, should have rest and repose, and stay somewhere there, and I, whose affairs are in a bad train, also made much effort, but it could not happen.. .Now there should not be some such suspicion that if this helpless one did not settle down there he would have some stability here. Far be the day when such a thing should happen. It has come as alms from the Sheikh and the Godly persons that there lies no thought in my mind for staying quietly in any place; there is nothing but perplexity and distraction". The letter No. 107 on Tajrid and Tafrid says, "It has taken me a long time to write any letter to you; some find fault with me for I am ill-fortuned (badroz) as all my life I have been measuring the air (acted as a traveller); I have had no specific work nor any

Hindi *Dohras* including one which was sung and played upon by an itinerant fiddler at which his spiritual guide had been moved with tears trickling down his cheek. A student of linguistics cannot but feel attracted towards the language of the Hindavi Dohras, and a student of history cannot but feel interested in the new information supplied by the saintly writer about Firuz Shah Tughlaq in letter 167.

Thus a close and careful study of the letters can enable one to dig up many things which are quite new and real discoveries of historical and cultural import. Turning from general to particular, we may consider the passages which contain personal references, his agitated mood and movements and from which the personality of the writer comes into view. Fettered by traditional views and mainly concerned with things of mystical and ethical standard, the Sufis are generally reticent and noncommunicative about themselves; but the present Maktūbāt enable us to piece together something about the life and conditions of the writer. That his family had not only the odour of sanctity but also the royal blood in the veins of its members is evident from letter 30 wherein he refers to his ancestor, Ibrāhim Adham, the Abu bin Adhem of the poem of Leigh Hunt. That he had forsaken his throne and kingship along with his wife, sons, territory and land has been referred to. Again, in letter 73 on the theme of recall and bestowal he writes, "whoever parts with one dirham in the way of God which is all that belongs to him", that dirham is on a level with that which the King of Balkh, Ibrāhim Adham, abandoned in the land of Balkh the whole of which belonged to him". He also refers to himself in that very letter "I, the helpless one, dedicated to the Darweshes, felt so much agitated and distracted in the head that I abandoned" the means of subsistence, some cultivable land, left nothing in that country, made a good bye to the ancient home and habitation, came out with a certain motive and made an entry into this city". I, the remediless one, have no wife or son, brother or family, nor have I with me money nor materials. I want neither spiritual leadership or discipleship, nor asceticism or renunciation for devotion. What I want is to do away with the infidel ego which makes one an enemy of God...... . It has taken me, helpless one, twenty years to be straying as a vagabond, night and day, in such a quest. There are four veils between the Creatures and the Almighty God, namely world, creations, satan or ego and carnal desires, and these constituting as great idols remove repose and tranquillity from those who are distracted in the path of

threads running through the book are matters spiritualistic and mystical of the usual pattern. To some the repetitive passages, and serried array of quotations from the Quran and Hadis may seem to be arid, tiresome and monotonous; but to others who have made special studies of Islamic mysticism there is much in these 'Lettre Familiarie' which are meaningful and illuminating. Many of the letters are self-explanatory but one comes across some obscure references due to the highly abstruse matters dealt with therein. Though the contents defy any effort at analytical summarization of the main drift and detailed exposition of views, comments and observations, a student of history and culture can break the components into some such categories as affairs of mystic discipline, personal references, and things descriptive and narrative. For him the charm and interest of the letter lies in numerous bits and flashes such as the personality and nobility of the character of the writer who seems to have been an ideal spokesman of his age, and there are occasionally some new and original information, which the letters provide. Of special interest to a student of history is the body of dozen letters, iucluding one which is the longest in volume, which was addressed by the saintly writer to Sultan Ghayāsuddin A'zam Shah, the son of Sultan Sikandar, and the third of the Ilyās Shahi Kings of Bengal. A very valuable and original tid bid is furnished by the reference to the letters which the celebrated Firdausi saint of Bihar, Sharfuddin Maneri, wrote to Ghayāsuddin's father, Sultan Sikandar, who used to be in correspondence with him and had become his favourite. Another original, though very laconic reference, is found in letter No. 162 on the subject of the Diwānagān or inspired and distracted ones, mostly antinomian in practice. Such a venerable personage was Sheikh Sharfuddin Bu-Ali-Qalandar of Panipat who is alleged to have abstained from cooked food for about three decades. He had a great hold on the masses, and Sultan Alāuddin Khalji managed to employ Amir Khusrau to convey a letter to the saint of Panipat to get some word from him for himself. After writing that the saint had referred in his reply to the Sultan as "Alā-e-Khalj, Khūta-e-Dehli" he stops short with the remark "this story is quite well-known and is widely spread in our land". He quotes the Persian verses of the Panipat's saintly Qalandar and explains the real hidden meaning of the verses spoken extemporaneously; but he does not give the dialogue in the Panjabi emanating from the saint "Khusrau Pheri Kotrā" and "Munda Hunh Bujhanda Hunh". But the Balkhi saint of Bihar compensates for this, as we shall see hereafter, by giving us as many as seven

ning pride in his scholarship subjected him to very strict austerities and severe discipline. After the purgative period he became a changed man. He married more than once, but when he found himself excessively attached to any, he divorced her and got her married with some one else. He would not allow any one to stand between him and God. Being without any issue of his own, he bestowed his utmost care and attention on his brother's son, Maulana Husain Muiz Balkhi. On several occasions he gave away in charity everything that he had in his house. As a true Sufi he believed in disinterested service, love and benevolence, abandonment of the world, and its vanities, and self mortification. He paid visits to the Arabian land more than once and at one time during his four years' stay in the sacred enclosure of the sanctuary of Mecca he imparted lessons on Hadis or Tradition. The one great desire that he had was to spend the last years of his life in the precincts of the sacred sanctuary of Kaaba, but in his last journey, undertaken via Chittagong through sea, he had not gone beyond Aden when he died and was buried there in 803/1400. One of his last acts was to grant a written authority and certificate for lecturing on Traditions (Sanad-i-Hadis) to Maulana Husain Muiz Balkhi, the original copy whereof has come down to us.

As regards the Maktubāt or Collection of Correspondence there are two manuscripts, the one in Futuha Khanquah library, and the other in Khuda Bakhsh Oriental Public library, Patna, before us, giving in most cases the names of the addressees, and indicating what is exactly intended in each letter. Each of the volumes, one of 206 folios, the other of 213, embraces as many as 181 letters which vary in length, the shortest hardly exceeding a page and the longest spread over about 16 pages. The longer letter breaks into several sections, designated with the heading of 'Hadis' which perhaps means new or newly given.

And so far as concerns the contents of the letters which are the copies of the autographs of the writer's later years, it is difficult to fix any certain boundries between staggering variety of topics of mystical theosophy, dealing mostly with love, Repentance, contentment, retiring and solitude, or devotion, putting away worldly things, Musalmāni, Sheikhi, Darweshi, Qalandari, the way and definition of a Sufi etc. These are all concerned with mystic discipline, moral and religious ideals, and ritualistic observances. There is some overlapping in the treatment which may be accounted for by the need felt for emphasis and clarity demanded by the topics. The dominant

(a hospice) by the then military Governor, Muqti Zainuddin Majdul Mulk, at the order of Emperor Muhammad Tughluq. Courted by Kings and nobles, but keeping himself aloof from them, he continued till his death, in 1381, to expound his views on Wujudi or Unitarian Theory of Hama-ūst (Everything is Him) as distinct from the Shuhudi doctrine of Hama as-ūst (everything is from Him) and act as the religious preceptor of all and sundry. Deeply absorbed in thoughts of God he was also a practical mystic, quite alive to the reality of the situation and even ready to give correct guidance to the devotees for rendering service to the people as a part of mystic discipline. Though a Wujudi he followed in the wake of Junaid (d. 900) and Al-Ghazzāli (1057-1112) in reconciling Sufism with orthodox Islam and saying that the basis of Sufism was the Quran, the Shara or religious law, the tradition, and that God stands in the same relation to phenomenal objects as the spirit to the body. He used to say "he who knows more stands closer to Him than he who knows. less" "In the stage of immediate vision......a slave remains a slave and God remains God". His Maktūbāt-i-Sadi has been highly extolled by the learned posterity including Abul Fazl and was ever kept by his side by scholarly Aurangzeb.

But it is not his letters but those of his most learned spiritual disciple and his first and immediate successor, Maulana Muzaffar Shams Balkhi, which forms the main subject of this paper. He has been noticed briefly in Akhbār-ul-Akhyār, Akhbār-ul-Asfiā, Mirat-ul-Asrār, Ā'īn-i-Akbari, and more particularly in Manāquib-ul-Asfiā, Munis-ul-Qulub, Ganj-i-Lā yakhfā, Kāshif-ul-Asrār, Risala-i-Bahram, Matlub-ul-Mubārak and also in later published works like Khazinat-ul-Asfiā, Muqtabas-ul-Anwār, etc. He is said to have been born at Balkh and was ninth in direct descent from the famous mystic, Ibrahim bin Adham, and twenty-fourth from Ali and Fatima. Nothing definite is known about the date of his birth, education, teaching and learning and domestic life except that while his father, after the immigration of his family, settled down at Biharsharif and became a disciple of the Suhrawardi saint of Amber, Ahmad Chirmposh, he stayed at Delhi, and being an erudite scholar, was employed in the College of Firuz Shah and began to lead a married life. On the invitation of his father he gave up the Lecturer's job, came to Bihar, and turned a new leaf in his life by attaching himself to Chirmposh's first cousin, Sharfuddin Yahyā Maneri. The Spiritual Guide of his choice used always to address him as Maulana but in order to assuage his restless spirit and put down his overwea-

thought was the organisation of Sufis into Silsilas or Orders whose founders were those who were regarded as having travelled the farthest through virtue and practice of devotion, and were supposed to be nearest to God for their saintly virtues namely seclusion, service, love, knowledge, resignation; and it is they who offered spiritual guidance either in groups or alone to those who sought for it. Hujwiri has marked 12 such figures from whom new orders had emerged. Abul Fazl gives 16. Each Order was distinguished by some specific discipline which the founder and his successors called Sheikh, Pir, or Murshid had laid down for the novice and the disciple called Murid. Another category of confraternity—Sufi Brotherhood—mentioned was that of the Derveshes or Faquirs (poor in the sight of God rather than of Man) who were divided into two great classes; the Bā-Shara (with the Law), or those who governed their conduct according to the principles of Islam, and the Be-Shara (without the Law), or those who did not rule their lives according to the principles of orthodox Islamic creed and were sometimes designated as Malāmatis. These latter allowed themselves to be reproached by concealing their devotions; they made no parade of anything good and hid nothing bad.

Not only the Bā-Shara Order such as the Chistis, the Suhrawardis, the Qādris, and the Naqshbandis and also the Firdausis and the Shuttāris, flourished in Bihar, but also one of the best representatives of the Be-Shara Order rose in the person of Jaman or Jamal Jati, a saint of Hilsa, one of the chief disciples of Badiuddin Madrās, the saint of Makanpur. Bihar, however, was the chief centre of the activities of the Firdausia Order and here emerged the remarkable mystic personality of Hazrat Sharfuddin Yahyā Maneri, a spiritual disciple of Khwaja Najībuddin Firdausi. A long-lived (661-782 A. H.), erudite scholar and a prolific writer, whose numerous Malfuzāt and Maktubāt and the Magnum Opus, Sharh-i-Ādābul-Muridīn, popularised the principles of mysticism and the idea of the Unity in essence of the Creator and the created (Wahdat-ul-Wajud) of Ibn-i-Arabi (1165-1240) and of the Ishrāqian (illuminities) like Shihābuddin Maqtul and Ain-ul-Quzẓāt Hamadāni in plain and simple language. Having completed his education at Sonārgaon (Bengal), under his namesake, Sharfuddin Tawwāma, one of the greatest savants of his time, he returned to Bihar, practised severe austerities and self-mortification in the hills and jungles of Rajgir for about 12 years, and then was persuaded to settle down at Biharsharif where a Do-Chapra, the place of his sermonization. was replaced by a Khānqah

and being to the soul itself, which thus sought to gain a conformity to the Supreme Being, and more and more to severe itself from the things of earth, like a wearied traveller, seeking to terminate the period of exile from its original. The final object of the Sufi devotee is to attain the Light of Heaven, towards which he must press forward till perfect knowledge is reached in his Union with God, to be consummated, after death, in absorption into the Divine Being."

Islamic mysticism or the School of inner spirit, giving an inner and esoteric interpretation of the teachings of the Quran and the sayings and practices of the prophet, and challenging very often the power of the school of formal or externalist theologians, arose as a revitalising current in Islam between the 9th and 10th centuries and attained its fullest and classical form in the 12th and 13th centuries from the works of a group of intellectuals to whom the terminology of Mystics could be applied. They consisted of most educated men, emotional writers, and poets in Persia, Central Asia and throughout the East. By the time it came to India Muslim mystic thought and philosophy, regarded as embodying the vital flexible spirit of Islam, the core of the belief whereof was the relationship of 'I' and 'Thou' had already been well established outside our country. The great theorists were Abu Nasr Sarrāj, Qushairi, Muhāsibi, Junaid, Māruf Karkhi, Zunnun Misri, Abu Tālib Makki, Abu Yāzid Bustāmi, Shihābuddin Suhrawardi, Abdul Qādir Jilāni, Ibn Arabi, Al-Ghazzali and Ali Hujwiri etc; they had already set a pattern to the Sufi thought. Of these the last, popularly called Dātā Ganj Bakhsh of Ghazna, lies buried in a mausoleum built by Sultan Ibrahim Ghaznavi, a successor of Masud, son of Mahmud, outside the Bhatti Gate in Lahore; his death occured in 1072 A.D. His book Kashful-Mahjub or Revelation of the Hidden, translated by Nicholson, is the earliest compendium containing the essentials of Sufi principles and practices in Persian as al-Luma' was the first of its kind on the subject in Arabic language. Khwaja Muinuddin Ajmeri (1142-1236), the pioneer of the Chishti Order in India, practised Chilla or 40 days meditation and austerities at his tomb before proceeding towards Delhi and thence to Ajmer. Some of the above great Sufi personalities were the founders of the Sufi Confraternities or Orders like the Chishti, Qādri, Suhrawardi. The earliest and the most celebrated Sufi of Suhrawardi Order in India was Sheikh Bahāuddin Zakariā of Multan. The Shuttāri and the Firdausi Orders were branches of the main Suhrawardi Order. Perhaps the most important phase of the development of Sufism next to the mystic

The Maktubat of a Sufi of Firdausi Order of Bihar

By PROF. S. H. ASKARI

The advent of Islam in India was followed by that of Sufism, the name given to the mystical, humanistic, speculative or rational and spiritual movement in the religion founded by the Prophet of Arabia. The suffix 'ism' suggests it to be a sect or creed, dogma or doctrine, definite and systematised; it is neither. Mysticism in Islam as in other religions, is less a doctrine than a certain mode of thinking feeling and acting. It is an art or way to find out and attain God. The term mystical signifies a doctrine concerning the way to God in perfections derived from inner experiences, and interpretations rather than from deduction or reasoning. The earliest Sufis were a sect of ascetics and quietists as well as those whose aim was to purify and spiritualise Islam from within and give it a deeper mystical interpretation' and infuse in it a spirit of love. Prof. Arberry defines Mysticism as a "constant and unvaryling phenomena of the universal yearning of the human spirit for personal communion with God". Sufism was originally a practical system of religious beliefs and not a speculative system. It was a system of thought or action based on the noble ideals of human nature, holding that man is capable of self fulfilment and of ethical conduct. It absorbed the essence of Islamic teachings, the wisdom of the ancient Masters and the learning of the humanists. It assimilated many a divergent ingredient and presented them in a new dress. A time soon came when it broke with the formal, dogmatic theory by giving a new and fresh interpretation of the Creator and the Creation. It became Monistic rather than dualistic, believing in identity and fusion rather than separation like orthodox Islam. The theologians, jurists and traditionalists adhered to the letter of the law and detailed formulas and set rules of rituals and ceremonies which were fixed and were to be followed in daily life. There grew a new tendency of pantheistic mysticism which, according to Stobbart, "developed itself chiefly in a search for metaphysical purity for illumination of the mind, for calmness of soul, and for subjugation of passions by the exercise of painful austerities and the adoption of ascetic life". The adherents of the system believed that the Divine nature pervaded all things and gave its very essence

Khuda Bakhsh Annual Lectures, 1976

Khuda Bakhsh Annual Lectures
are delivered every year
by some eminent scholar of
Persian, Arabic or Islamic
Studies.

Mr. Qazi Abdul Wadood,
Dr. Md. Zubair Siddiqui,
Prof. A. A. A. Fyzee,
Dr. Nazir Ahmad, and
Dr. S. A. H. Abidi
were the forerunners
in the series to which

Prof. Syed Hasan Askari
contributed in 1976.

Khuda Bakhsh Annual Lectures Series—6

Maktub Literature
As a source of Socio-political History
—The Maktubat of a Sufi of
Firdausi Order of Bihar
—*A case study*

by
Prof. S. H. Askari
Patna

A powerful mind in ruins is the most heart-breaking thing which it is possible to conceive, and such, indeed, was the case with him during the last two years. These were the years of trouble, of sorrow, even of gloom, due chiefly to his self-imposed poverty. "Failing health, failing eye-sight, the sense of being helpless and useless after an active and beneficent career; the consciousness of dependence upon others at an age when the moral disadvantages of poverty are felt even more keenly than youth feels its material discomforts;—such were the clouds that darkened the close of a life which had never been without its trials."

When, at last, the end came, he passed from this vale of tears as peacefully as he had lived in it, nobly and gloriously; illustrating the well-worn principle, strong with the strength and immortal with the immortality of truth, that to the just and the God-fearing death inspires neither terror nor the grave the uncertainty that lies beyond it.

One word and I have done. To the long list of distinctions which the late founder of the Oriental Public Library achieved in his illustrious career, there was added, on Monday, the 3rd of August, 1908, the crowning honour, namely, of burial within the library premises. There, amid all the associations which the library enshrines; there, under the shadow of that literary pantheon, in the exalted companionship of the great writers of Islam, he rests at the end of his life's voyage. A more fitting or a more worthy place could not have been selected for him !

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھہ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرض ستمہاے جدائی کا

●

Hassan Khan;[26] and Moulvi Syed Wahiduddin,[27] with whom he had the privilege of free social intercourse, fail to produce great and indeed abiding influence on his habits and character. Evening after evening, after the day's work was done, did my father, still young in years, enjoy the benefit of their society. They were the old class of Indians who, unaffected by the modern spirit of materialism, with its concomitant vices of ambition, jealousy and self seeking, never acted but in accordance with the dictates of honour and humility, of ardent public spirit and lofty public virtue. Such a conclave of pure and disinterested and virtuous men, who would ornament any society, were the guardians or guides of my father in his early youth.

Ever since his enrolment at the Patna Bar public life divided his thoughts with literature, and when in later years the world loaded him with its envied prizes, he never ceased to mention that those privileges were the fruit, not of favour or inheritance, but of personal industry and ability.

He stood at the confines of the fast retreating old world and the incoming new world of ours, and as such his life is of special interest and value. I greatly deplore the loss of the autobiography which he commenced to write shortly before his death. Though only fragmentary—death did not enable him to complete it—it was yet a store of information which the world would not have willingly allowed to perish. I am therefore left to my own recollections of that lost treasure, but I do not propose, at the end of my paper, to draw upon my memory and thereby exhaust the patience, and perhaps the indulgence, of my reader. I reserve my information for a fuller and a more complete life which I hope before long to publish.

I have not discussed his work as Chief Justice of Hyderabad, Deccan, nor have I dealt with him as a poet. Four stout volumes of odes, elegies, and *kasidas* he has left behind him, composed at intervals during the last five years of his life; and these, indeed, lead me to believe that his rank in the profession, his position in public life would not have been ill-exchanged for a place in the world of letters. Situated as he was, the distractions of the profession allowed but little leisure for the peaceful pursuit of pacific culture; but though not voluminous, his writings are enough to ensure for him a niche in the temple of fame.

---

26. Father of Syed Husain Bilgrami, of India Council.

27. Father of Shamsul Ulama Syed Imdad Imam, of Patna.

encouraged in the study of their own language and literature, and that result can only be achieved by making those studies profitable and attractive. Surely it is not an extravagant request to ask the Government to consider the question of establishing a professorship of Arabic and Persian at Bankipur, where the students might receive direction in regard to their studies and learn to carry on Oriental researches upon European principles under the professor's control and supervision. Perhaps it will be urged as an objection to my proposal, that even if the Government were prepared to appoint a professor,—where are the students? But there will be no scarcity of students if Oriental learning receive patronage from the Government.

It is strange, nay, deplorable, that while Indian students are throughly conversant with the history of the American War of Independence and thrilling stories of the Freneh Revolution, they know nothing or next to nothing about their own history and its abiding lessons. Could we not have Bankipur, with its magnificent library, as a centre of Oriental learning, for at least the province of Behar?

VI.

In this short sketch I have given nothing but the merest outline of my father's life. Nor was it possible to do more in the space at my disposal. It would require almost a volume to deal fully and exhaustively with the history of a career which was alike instructive in lessons and fruitful in results. The period covered by the lives of my father and grand-father—almost a century—has been the most significant and the most important in the literary history of the Muslims of India, and the biographer has not merely to recount the events of Khuda Bukhsh's life but to discuss them in their relations to the literary and intellectual activity of his co-religionists; to compare, to contrast and to illustrate the conditions and circumstances as they stood before the Mutiny with the conditions and circumstances as they stand now. A whole generation of Indians has passed away, and with them the old order of things, yielding place to new. It was directly under my grand-father that my father was brought up and trained, and it was under him that he learnt those lessons of self-knowledge, accuracy of mind and habits of strong intellectual exertion which throughout his life stood him in good stead and which made him what he became. Nor did the society of a select and distinguished band of Indians, such as Nawab Syed Feda Hassan Khan,[25] Syed Azmuddin Hassan Khan, C. S. I., Syed Zainuddin

25. Afterwards Chief Justice of Nizam's High Court.

Oriental texts are too costly to be within the reach of ordinary students, and the result is a very superficial scholarship. If the Government, however, could see its way to establishing a printing press at Bankipore or elsewhere, for the publication of Arabic and Persian books, under the supervision of a competent staff, it would do a lasting service to Oriental learning which, the present writer apprehends, will otherwise either completely disappear from India or in course of time be reduced to a mere mockery. Even on political grounds the Government should seriously consider this proposal. So far the **Mohamedans**, as a body, have kept aloof from politics, and this, the present writer is inclined to believe, is mainly owing to the want of English education among them. Ignorance, prejudice, call it what you will, has hitherto kept the Mohamedans back, as a class, from the study of English, which they, rightly or wrongly, believe to be destructive of their religious beliefs. But, decade by decade, sheer necessity and instincts of self-preservation are opening their eyes to the indispensability of English education, without which they can not hope for any rise or prospect in life. Arabic and Persian learning, however tempting, is steadily declining, inasmach as it offers no prospect. This, chiefly, because Oriental learning, out here now, is so sadly deficient and so thoroughly imperfect. It neither makes them finished scholars nor useful members of society; nor does it put them in a position to earn their livelihood in any respectable or lucrative walk of life. It merely turns out a band of unreasonable fanatics who rove about the country preaching the worst gospels of fanaticism and intolerance. The result, naturally, is that the so-called Oriental scholars have entirely ceased to command the respect of the educated public. They are discredited and distrusted, and are looked upon as fit only for either teaching in village schools or serving as registrars of births and marriages. The condition of Oriental learning imperatively demands the immediate attention of the Government. It must be made sufficiently scholarly and attractive to draw students to it, and this can only be done by placing it on a wide and broad basis.

Nothing is more desirable than to keep the Orientals as Orientals. Western learning is, indeed, a desideratum, but not at the sacrifice of Eastern culture. The thin veneer of European civilisation can scarcely regenerate the Indians. It will only tend to produce a class of people who are neither one thing nor another, and who will unite in themselves the vices of the two wholly opposed civilisations without the redeeming virtues of either. Mohamedans should be

This extremely valuable MS. was presented to the library by **Subhanullah Khan** of **Gorukpur** and bears marginal notes in the handwriting of the Emperors **Humayun** and **Jahangir** who, after consulting the odes (according to the popular belief of the Mohamedans they reveal the hidden secrets of fate like an oracle) have made notes on the margin which explain, in most cases, the particular reasons for consulting the odes and the results that followed after consulting them. There is an autographic note on a fly-leaf at the end by **Sultan Husayan Bayaqra**. True, the catalogue is now in the course of publication, but though Lord Curzon in 1903 wrote that "he discussed with the donor the means by which its advantages may be made even more accessible than they now are to the scholar and student" more than five years have rolled away and nothing has yet been done to bring nearer home the valued treasures of the library. The present writer, moreover, apprehends that nothing can be done unless the Government seriously addresses itself to the task of making some satisfactory arrangements for the publication of rare and useful MSS. Nor is this an unreasonable demand for us to make. The British Government has even more Mohamedan subjects than the Sultan of Turkey, and if the French Government, with only Algeria as its possession, can spend money for the publication of Oriental texts and their translation, might we not ask the Government of Bengal to follow the example of France in this direction. Let the Government first satisfy itself about the value and importance of the books I have suggested for publication, by appointing a committee, or otherwise as it thinks fit, and when once assured of their value and importance let the books be printed. A library, such as the Bankipore Library, can only be a useful institution if the public employ it as such. The Patna society is still too intellectually backward to appreciate its value, or to make use of its treasures. But such is not the case with the educated public outside Patna, who can neither afford time nor find opportunity to visit the library. For such persons, both here and in Europe, the publication of useful works in the Bankipore Library would be of incalculable advantage. It would be a solid acquisition to the domain of Oriental learning, which is almost dying out of India. Though India has produced some eminent Arabic scholars, who would have held their own with the choicest products of **Al-Azahr,** none perhaps would deny the fact that very narrow and circumscribed is the range of studies known to the average student of Oriental languages in India. This is due to two causes : to poverty first, and secondly to scarcity of books. European publications of

may well be congratulated on the success achieved by his pupil **Moulvi Muqtadir.** Among the remarkable works noticed in this volume Dr. Ross mentions—

1. A splendid copy of the **Shah Namah** (No. I.) which **Ali Mardan Khan** presented to the Emperor **Shahjahan**.

2. A copy of **Ruba'is** (No. 56) of **Saifuddin Bakharzi** of which no other copy is known[23].

3. A splendid copy of the **Haftband of Kashi**, notable for its superb caligraphy (No. 114).

4. A very old copy of the lyrical poems of **Salman Sawah**, written 33 years after the poet's death (No. 147).

5. A unique copy of the **Divan of Ruknuddin Sa'in** (No. 149).

6. A very valuable and interesting copy of the **Divan** of **Hafiz**, from which the Emperors Humayun and Jahangir took omens, and on which they made notes with their own hands (No. 157).[24]

---

23. I have edited the **Ruba'is** in Vol. 59 (1905) of the Z.D.M.G., pp. 345—354.

24. Here is a letter of Sir Charles Lyall which cannot be without interest to the reader.

32, Cornwall Gardens, S. W.
22nd November, 1906.

DEAR MAULVI SAHEB,

I was much pleased to get your letter of the 1st instant, though very sorry to hear that you were not well. I also am getting old—in my 62nd year, and shall begin my 63rd in March next.

اودى الشباب حميدا ذوالاعاجيب ◊ اودى و ذلك شأو غير مطلوب

The MS. of Hafiz which you describe in it must indeed be most interesting, and I congratulate you heartily on acquiring it for your library. I know the custom to which you allude of taking omens from the Divan of Hafiz. I hope you will be so kind as to let me have a copy of the commentary on ذوالرمة which you mention, when it is printed at Hyderabad. I daresay the **Kasidah** is the one beginning

ما بال عينك منها الماء ينسكب ◊ كأنه من كلى مفرية سرب

I know this poem very well and have copied and translated it; but it is a difficult piece, and I should be very glad to have a good commentary. There is a MS. from India of **Dhur-Rummah's Divan** in the India Office Library, but the text teems with stupid mistakes. There is another in the British Museum, two at Leiden, and one in Egypt. A good critical edition of the poet is very much wanted. It would be a work of some difficulty, requiring a good knowledge of the old poetry whence **Dhur-Rummah** drew his models. I am getting on with the المفضليات but the work progresses slowly, as I am very busy with other things.

Sincerely yours,
C. J. LYALL.

danger and by which its advantages may be made even more accessible than they now are to the reader and student. I hope that steps may be taken in both of these directions."

January, 1903. CURZON.

Lord Curzon's attention to the library was drawn by my friend Dr. Denison Ross of the Calcutta Madrassah, and I would add that had it not been for Sir Charlies Lyall and Dr. Ross, that valuable store-house of Oriental learning would have remained unnoticed and unknown. The present writer has enjoyed the friendship of the Principal of the Calcutta Madrassah ever since his arrival in this country, and as was expected of him, he was irresistibly drawn to my father's library, where he found more than he had hoped to see and find. He aroused the interest of Lord Curzon in the library; and, as I have stated before, that great scholar, antiquarian, and last but not least statesman, visited the library in 1903.

The sanction for the construction of the reading-hall and the preparation of the descriptive catalogue, under the supervision of Dr. Denison Ross, were the direct outcome of the Viceroy's visit. I would be guilty of the unpardonable sin of ingratitude were I to fail to mention the name of the Hon'ble **Mr. J. G. Cumming**, the then District Magistrate of Patna (now the Judicial Secretary). To him the library is most deeply beholden. An accomplished scholar, a graceful writer (as his report on the Industries of Bengal abundantly shows), a distinguisned officer, a man of liberal and catholic principles, Mr. Cumming has always taken the keenest interest in the library. It was during his time that the reading-hall was built, the lands adjoining the library were acquired, and the scheme of making a garden matured. But owing to Mr. Cumming's departure from Patna this has been left unfinished. It was my father's dearest wish that the reading-hall should be called after Mr. Cumming; in other words, it should be named 'Cumming Hall,' and the Library Committee would only be carrying out his cherished desire were they so to name it.

The reading-hall is built, and the catalogue of the library—thanks to Dr. Ross, and my esteemed friend Mr. J. A. Chapman—is in a fair way to completion. The first volume of the catalogue, which deals with Persian poetry from **Firdausi** to **Hafiz**, has just been published, and it does credit to Dr. Ross, Mr. Chapman and the compiler, **Moulvi Muqtadir**. It displays an amount of research and erudition which is, indeed, rare in the East, and Dr. Denison Ross

mentaries on the **Qur'an**. Among others we have **Tafsir Bahr-ul-Haqa'iq** of **Najmuddin Abdullah Dayah.** It is a commentary according to the **Sufi** principles and is absolutely unknown. No other library seems to possess a copy of it. Then we have the **Tafsir Haqa'iq-ul-Qur'an** of **Mohamed b. Hussain as Salami.**[22] It is dated 823 A.H. This list might be indefinitely multiplied, but I trust I have said enough to convey to the reader the importance of the Bankipur Liabrary.

In 1893 Sir Antony (now Lord) Macdonell visited the library, and on August 11th, 1893, he wrote to my father :—

BELVEDERE, CALCUTTA,
August 11*th*, 1893

DEAR MOULVIE,

I must write you a line of thanks for the great treat that you gave me in going through with me the Oriental Library which, with rare public spirit, you have presented to Patna. I had not expected to see anything so fine. The collection of English literature is very good and made with the excellent judgement, but the feature of the library is the magnificent collection of Oriental MSS. which it contains. **I have seen nothing like it out of Europe**, and it bears lasting testimony to your reverence for the great teachers of Islam and to your love of the lighter products of I assure you that I spent a delightful hour with you among these imperishable treasures. I shall direct that a copy of important literary works published by the Bengal Government shall be presented, as they appear, to your library.

I remain,
Dear Moulvie,
Yours sincerely,
A. P. MACDONELL.

In 1903 one of India's greatest Viceroys honoured the library with his visit, and his remarks, which I place below, are worthy of all attention : "While at Patna I inspected with great pleasure the library which the liberality of **Khuda Bukhsh** has presented to the public, and I was shown many of the rare and valuable treasures which it contains. **I discussed with the generous donor the means by which the collection may be preserved from risk of fire or any other**

22. Brockelmann, Vol. I, p. 200.

ul-Tasrif (كتاب التصريف لمن عجز عن التاليف), which is a complete copy of **Albucasis's** great work. The portion dealing with the practice of medicine is in **Maghrabi** character; that which treat of surgical practice is in an Old Arabian hand; 584 A.D. is the date of transcription. The illustrations of surgical instruments are splendidly drawn and beautifully coloured[14]. Then we have the **Talwih-ut-Tib** (تلويح الطب) of **Al Khujandi**, a very rare MS. dealing with the system of medicine current among the Arabs[15]; and **Kitab-ul-Hasha'ish** (كتاب الحشائش), **Dioscorides' Materia Medica** was, for the first time, translated by Stephen, the son of Basil, whose translation was revised by **Humayn Ibn Ishaq**. It was, further revised and improved upon by **Natili Husain b. Ibrahim b. Husain An-Natili**. Our copy is the last revised and improved version. It is a very rare and old copy with coloured drawings of plants and animals.

Specially interesting and note-worthy is our collection of biographical works. Among others we have the **Kitab-ul-Mu'talif-wal-Mukhtalif** (كتاب المؤتلف و المختلف) of **Ali b. Omar ad-Darqutni**[16] containing the lives of the Companions of the Prophet and the Traditionists generally. It is a very old and rare copy. Then we have the **Tabaqat-ul-Hanabilah** (a very rare copy) of **Mohamed b. Husain Abu Ya'la**[17] and **As-Suhubul-Wabilah of Mohammed Abdullah An-Najdi, a** modern writer. The latter is a continuation of **Ibn-Rajab's** biography of the Hambalites and covers almost six centuries (748—1295 A.H.).

Besides the historical works that I have already mentioned I shall here notice the **Kitab-ut-Tawarikh of Abu Ishaaq Ibrahim Abi'd-Dam**. It is a history of Islam from the time of Mohammed down to the Ayyubide **Sultan Muzaffur** (A.H. 1-628).[18] I must not omit to refer to the unique copy of **Abu Ali al Farisi's Kitab-ul-Hujjah** which our library possesses. Neither **Ibn Khallikan**[19] nor Brockelmann[20] mention this book in their list of Abu Ali's works. The only reference that I have been able to find to this book is in the **Al muhtasab fi arab-ush-Shawaz** (Bankipore MS.) of Abu Ali's devoted disciple Ibn Jinni.[21] The **Kitab-ul-Hujjah** treats of **Qiraat** or the seven early readings of the **Qur'an**. Equally valuable is our collection of com-

14. Ibid., Vol. I, p. 239.
15. Ibid., Vol. I, p 458.
16. Ibid., Vol. I, p. 165.
17. Ibid., Vol. I, p. 398.
18. Ibid., Vol. I, p. 346.
19. Ibn Khallikan, Vol. I, p. 39.
20. Brockelmann, Vol. I, p. 113.
21. Dr. Probster's Introduction to **Ibn Jinni's Kitabul Mugtasab**, p. viii.

theology, ecience and medicine, which are absolutely unique and in most cases unknown to the world of letters. On the life of the Prophet, among others, we possess **Kitab-ul-Wasila** of **Mulla** and **Zad-ul-Ma'ad of Ibn Qayyim** which throw a flood of light on his public and private life. Connected with the life of the prophet is the history of the **Qur'an**, and on this subject too we can boast of **Kitab Taisir-ul-Bayan fi Takhrij-Ayat-il Qura'n** of **Mauza'i** and **Ahkam-ul-Qura'n** of **Jassas Razi**[11]. Of the historical works among others, our library is the proud possessor of **Ibn Hazm's Jamharat-un-Nasab, Zahabi's Duwal-ul-Islamiyya**, and a whole mine of odd and interesting information in the unique MS. called **Kitab Ra'smal-in-Nadim**. The collection of works on **Fiqh** is specially noteworthy, but I shall only mention two : **Al Mahsul fil-Usul of Fakhruddin Razi**[12] and **Maratib-ul-Ijma** of **Ibn Hazm**. I have alluded to these books with no other object than this, that the Government may be pleased to consider, for the present at least, the scheme of their publication. These are rare and valuable books, and their publication would be an acquisition to Oriental learning. This list does not, by any means exhaust the rare curiosities of the Oriental Public Library, and as the catalogue comes out the Orientalists of Europe will undoubtedly discover more and more treasures and feel more and more interest in that depository of learning.

Permit me now to draw the attention of Orientalists to a few other rare MSS. of the library. In medicine we have the **Kitab-ul-Mushajjar** (كتاب المشجر), a treatise on medicine in tabular form by **Ibn Masawayh** who died A. H. 237 (A.D. 857) at Samarra[13]; **Kitab-**

---

were all greatly interested. It is full of information and very much to the point. You have a noble tradition in your family of booklovers, and your father and grandfather have done a splendid work in founding the library at Patna, of which you sent me the first volume of the judge's Persian Catalogue—full of interest to me. I hope he will get his wish and see a printing press established in connexion with the library. May I ask you to tell me whether H. E. Lord Curzon has been approached on this subject, and whether there is any chance of the Government taking it up. I hope to say something about it in a London Journal, and anything I can do in support of your father's public-spirited scheme I need not say will be a pleasure.

Yours truly,
STANLEY LANE POOLE.

11. Brockelmann, Vol. I, p. 191.

12. Brockelmann, Vol. I, p. 506.

13. Brockelmann, (Arab. Litt., Vol. I, p. 232) does not mention this in the list of Ibn Masawayh's works.

Of poetical works the library possesses over 400 MSS; some of them are sumptuously illuminated and magnificently bound in the oriental style. The Mohamedan works on religion—namely, the **Hadis** (tradition), the **Fiqh** (law), the **Usul** (jurisprudence), and **Tafsir** (commentary on the Koran)—are many in number, bearing the signatures of the best authors, such as **Subki**, **Zahabi**, **Ibn Hajar**, and others. The collection of historical works is worthy of notice. **History of India**, written by various Muslim writers, and also the biographies of the Emperors of the **Mogul** dynasty, constitute the most important portion of this collection.

These are rare books, and unless care is taken for their preservation they are likely to be all but extinct, after the lapse of half-a-century. The library would indeed fulfil its mission if an arrangement is made to edit and publish them. I fondly hope that before long the Government of India will turn its serious attention towards the publication of the important literary and historical works which lie buried in the library. It will only be doing its duty in bringing within the reach of the public books which deserve attention of every person who is at all interested in the history of the Eastern nations."[10]

Rare and charming as are the specimens of Eastern painting and Persian penmanship, the value and importance of the library lie in its vast store of works on law and history, philosophy and

---

employed for some time. When the work is printed, I shall take care that a copy is provided to the library at Bankipur. You will find some account of it in a paper which appeared in the Journal of the Royal Asiatic Society in April 1904. I am returning to the library, duly registered, the very valuable MS. of the commentary of **An-Nahhas** on the **Moallakat**, and beg you to accept my hearty thanks for having been allowed to keep it for so long. It is indeed a most valuable MS., better than any known to me in Europe. I should think from the character of the writing that it must date from about the end of the 5th or the beginning of the 6th century **Hegira**; and it is probably a MS. written in Persia. I have had in my hands for the **Mufaddaliyat** a MS. dated 471 H., which corresponds in a remarkable manner in its style of writing with your MS. of **Nahhas**; and I think that the two must belong to the same age and country.

With all good wishes,
I am sincerely yours,
C. J. Lyall.

10. In acknowledging the receipt of a copy of this article which I sent to Professor Stanley Lane Poole he writes to me :—

March 25th, 1902.

Dear Sir,

I am very much obliged to you for sending me a copy of your distinguished father's essay on Islamic Libraries which I read aloud to some friends, and we

The work of **Zahravi** on surgery is a manuscript which requires particular attention. This copy bears 584 A.H. as the date of execution. In this MS. the pictures of the surgical instruments are carefully drawn, and the marvellous similarity which some of the instruments bear to those which are supposed to be of modern invention tempts us to believe that the Muslims of Spain were not entirely unfamiliar with them. There is another old MS. which it may be worth our while to mention here. It is the work of **Dioscorides** on medicinal plants, and which was translated by the Arabs during the Caliphate of **Harun-ul-Rashid.** It is the very MS. which was once deposited in the charitable dispensary established by **Jalaluddin Shirwan Shah** in **Shiraz,** some six hundred years ago. **Muslim** writers made this book the basis of their future inquiries on medicinal plants, and the library possesses the most important and authoritative works written by **Muslims** on this subject. Further, this library possesses a very old manuscript of the treatises of **Thabit Ibn Kurra** and some of the writings of **Abu Nasr Farabi** and **Abu Raihan Bairuni.** I am told by a well-known Orientalist of England that our copy of **Nahhas's** commentary on the **Moallakat** is far superior to any that exists in the libraries of Europe[9]. There are moreover, MSS. which used to belong to the Emperors of Delhi : for instance the poetical work of **Mirza Kamran,** brother of **Humayun,** written by **Mohamed Ishaq Shabi,** was with the Emperors of Delhi from **Akbar** to **Mohamed Shah.** This MS. bears the signatures of **Jahangir** and **Shahjahan.** There are other books, too, bearing signatures of **Shahjahan Abdur Rahim Khan Khanan,** Kinds of the **Adil Shahi,** and some of the members of the **Kutub Shahi** family which are in the library.

Jahangir, in his autobiography, makes mention as a copy of the **Zulaikha,** which from the description given by him, I consider to be identical with the one in the library. This book, according to the estimate of **Jahangir.** was valued at 20,000 Rupees.

---

9. Here is a letter from Sir Charles Lyall which will be of some interest to our readers. It is dated 13th April, 1905.

My Dear Moulavi Saheb

I have to thank you for your letter received by last mail and your kind enquiries after my health. By God's blessing I am very well, though like all of us growing older. My family has also been spared the trials of illness; and we are able to take part in life with a quiet mind. I am very busy, partly with official work relating to the affairs of India, which give me plenty of employment, and partly with the preparation of an edition of the **Mufaddaliyat** (المفضليات) with the commentary of **Al Anbari,** a task on which I have now been

I hope I shall not be deemed guilty of want of modesty if I describe the library which I have given to the city of **Patna**. It is not vanity, but the desire of bringing it to the notice of the Orientalists in Europe, that impels me to mention it in this paper. Though the library is now under the control of the Government of India, and though every possible precaution which wisdom or foresight can dictate is taken to assure its safety and permanence, still the library is incomplete without a printing press. Let us hope that ere long we shall possess a press to multiply the copies of valuable works and so bring them within the reach of the reading public. The idea of founding a library long floated before the vision of my father. The greater portion of his income he spent in the collection of MSS. which numbered 1,400 at the time of his death in July 1876. On his death-bed he entrusted these MSS. to me, and asked me to convert his library for the use of the community, whenever I should find myself in a position to do so. I inherited to the fullest extent my father's passion for collecting books, and since his death I have been making large additions to it. In 1891 the library was opened to the public. It then contained nearly 4,000 MSS. The number of MSS. now is over 5,000. The collection of English books, though not very large, is indeed respectable, including nearly all the most important literary and scientific works. The library, further, possesses select MSS. which formerly belonged to great Orientalists like **De Sacy**, Sir Gore Ousely and Mr. Blochmann of the Calcutta Madrasah, and many indeed are the notes in the handwriting of those men.

I have spoken above of the destruction to which libraries in Muslim countries were constantly liable during the periods of political excitement. In addition to oft-recurring internal dissensions, the ravages of the **Moguls** and the fanaticism of the Christians obliterated countles books. Owing to these misfortunes productions of Muslim writers from the second to the seventh century of the **Hegira** have become exceedingly rare. The Mohamedan books now extant are chiefly the writings of the authors who flourished from the middle of the seventh to the end of the eleventh century of the **Hegira**. I have succeeded in securing some MSS. of earlier dates which treat of astronomy, surgery, medicine, metaphysics and mixed mathematics. Many of the manuscripts are written by the most famous scribes and are exquisitely done. In the first volume of the catalogue which I have published I have dealt at length with these manuscripts. If time and health permit me I shall soon bring out the second volume. I shall mention a few here as I have a limited space at my disposal.

Bengal Government to the worth and value of the library and induced that Government to become its patron and sponsor. I regret the loss of correspondence between my father and the Bengal Government which preceded the opening ceremony in 1891 by the then Lieutenant Governor, **Sir Charles Elliot**, when my father's and grand-father's collection of Oriental MSS. was opened to the public under the name of **Khuda Bukhsh's Oriental Public Library**. In 1891 the library contained 4,000 MSS., but the number has since then increased, and there are now over **5,000 MSS.**, besides the collection of **English books** amounting to over **2,500**. I may here mention that my father had a peculiar weakness for fine binding. He insisted on his books being excellently bound, and the library can boast of rare specimens not only of **Oriental** but also of **European** binding. It were idle to try to convey in a few pages any adequate idea of the imperishable treasures which the library possesses, and I shall not embark upon a task which I consider so hopelessly impossible, but, at the same time, this paper would lose its value if no mention were made of at least some of our literary gems.

Before I make my own observations I shall here quote from my father's article on the **Islamic** Libraries, published some years ago, in the **Nineteenth century**, and which has become all but unknown : "True it is, indeed, that the **Moguls** never rose to the same eminence in culture as the **Muslims of Baghdad** or **Cairo** or **Cordova;** nevertheless they held themselves up, after their iconoclastic work was done, as the patrons of letters. The descendants of **Gengis Khan** and grandsons of **Tamerlane** embraced **Islam** and encouraged learning. It was under them that **Nasiruddin Tusi**, **Kutbuddin Shirazi**, **Saduddin Taftazani** and others flourished. The **Mogul** dynasty in India likewise extended protection to arts and sciences, and took deep interest in the progress of culture. The Emperor **Shahjahan** was, indeed, a well-read man and extremely fond of books. The **Adil Shahi** and **Kutub Shahi**, Kings of the Deccan, also followed the example of the Mogul princes as far as the encouragement of learning was concerned. In India there existed several well-known libraries, but no traces of these libraries were found after the Mutiny. In those times, of which history has a doleful tale to tell, these libraries were either destroyed or books were taken out of the country. The few that remained in the country were sold at miserably low prices, owing to poverty no less than want of education. Thus, to-day in India, as far as I am aware, there is no library of Oriental books which can stand comparison with the libraries either at **Medina** or **Cairo** or **Constantinople**.

afterwards refused to return it, offering a large price for it. The owner indignantly declined but held his peace. When Elliot retired he packed his choicest MSS. in some cases and shipped them to England; while his worthless books were put in another case and left at **Patna** to be sold by auction. By the irony of fate or the Will of God, call it what you will, not only the extorted volume of the odes but some other rare MSS. as well (such as the **Majalis-i-Khamsa** bearing **Shah Jahan**'s autograph) got into the wrong case, and Mohamed Bukhsh bought them. On reaching England Elliot discovered his mistake, only to fret and fume in vain. One day when **Khuda Bukhsh** was driving back from the High Court at Hyderabad, his eyes, ever on the lookout for books, discovered a bundle of volumes on a sack of flour in a grocer's shops. He stopped, turned the books over, and asked the price. The owner shrewdly answered : "To any other man I should have sold these old and rotten papers for Rs. 3. But as your Lordship is interested in them they must contain something of value. I want Rs. 20 for them." A true guess, for along with some worthless things the bundle contained an old work on **Arabic** bibliography not to be found elsewhere. Immediately after **Khuda Bukhsh's** purchase Rs. 400 was offered for it by the **Nizam** but in vain." So far **Prof. Sircar** and I vouch for the correctness of these statements. Besides the rare MSS. with which **Mohamed Maqi** enriched our library, MSS. poured in, in torrents, from all parts of India, and my father paid fancy prices for them. As years went by the number of MSS. increased, and the idea of building a special house for his library laid hold of my father's mind, somewhere in 1886, and he at once commenced work. In 1888 that magnificent building, "a worthy setting for the jewels they contain," was completed, and the books were then removed from our dwelling-house to the building which is now known as the Oriental Library. It was about 1888 that he asked Mr. Campbell, the then Opium Agent of Patna, and a dear friend of my father, to bring the library to the notice of the Government. What the actual results of Mr. Campbell's negotiations were I am unable to ascertain, but within a year or so **Sir Charles Lyall** visited the library. An accomplished Arabic scholar, **Sir Charles** was charmed with the invaluable treasures that he found there, and since then he has taken a keen and lively interest in the library and its founder. It is impossible for us adequately to convey in words the gratitude which we feel for the many obligations under which that great scholar has laid us, and I am convinced that it was he who first drew the attention of the

September number of the *Modern Review*, **Prof. Jadunath Sircar** has forestalled me, and I shall here quote some of the romantic incidents connected with the library which the Professor has so admirably described in his article. "There are many romances connected with the growth and history of the library. The most precious MSS. in India were undoubtedly those of the Mogul library in Delhi. Thither, through the 16th and 17th centuries, came all rare and fine specimens of caligraphy and illumination in the East. Some were purchased, others were executed by artists retained in the Imperial service, some were secured by conquest (as of Golconda and Hyderabad in Aurangzib's reign); and many by the confiscation of the goods of great nobles on their death. (On the death of Akbar's poet-laureate **Faizi,** his 4,300 volumes were added to the Emperor's library). Thus was formed the largest library in the East at that period, for while Central Asia, Persia and Arabia were torn by incessant wars, India enjoyed peace under the **Moguls**. In the 18th century many of these found their way to the library of the **Nawabs of Oudh**. But the Sepoy Mutiny of 1857 brought about the fall of **Delhi and Lucknow.** The Imperial and Nawabi treasures were dispersed. The Nawab of Rampur (Rohil Khand), who had joined the English, got the best of the *loot*, as he had proclaimed among the victorious sepoys that he would pay oue rupee for every MS. brought to him. **Khuda Bukhsh** began his collection much later; but there was the greatest rivalry between him and the **Nawab**. At last **Khuda Bukhsh** won over from the Nawab's side that jewel of a book-hunter, **Mohamed Maqi**, an Arab, and paid him a regular salary of Rs. 50 a month besides commission for 18 years, and employed him in searching for rare MSS. (mostly Arabic) in Syria, Arabia, Egypt and Persia (specially Bayrut and Cairo). It was **Khuda Bukhsh's** invariable practice to pay double railway fare to every manuscript-seller who visited **Bankipur**. Thus his fame spread throughout India, and he was given the first choice of every MS. on sale in any part of the country. Curiously enough, one year the library was broken open by a former book-binder, and some of the best MSS. stolen. The thief sent them for sale to a broker or merchant at **Lahore**, and the latter unsuspectingly offered them to **Khuda Bukhsh** as the likeliest person to buy them. So in the end the honest man came by his own, and the thief was punished. In another case divine justice was secured by a similar round-about process. **Mr. J. B. Elliot** (a great book-collector and donor to the Bodleian) borrowed a unique MS. of the odes of **Kamaluddin Ismail Isfahani** from **Mohamed Bukhsh** and

principles which save one generation may be the ruin of the next. **There is nothing abiding in political science but the necessity of truth, purity and justice**. The evils by which the body-politic is threatened are in a state of constant change, and with them the remedies by which those evils must be cured. Such changes operate very rapidly in these days."

V.

I now pass on to the history of the Bankipore Oriental Library, which is the greatest achievement of my father's life, and upon which must rest his title to fame and his claims upon the gratitude of the literary world. My grandfather was essentially a man of letters,[8] and he spent the greater portion of his income in purchasing MSS. which at the time of his death, in 1876, numbered 1,400. "On his death-bed my falher (writes the founder in his article on the Islamic Libraries) entrusted them to me, and asked me to convert his library into a public library for the use of the community whenever I should find myself in a position to do so." My father never forgot this pious trust, and since 1876 his one constant endeavour was to carry it out. By his sketch of my father's life, published in the

---

8. My grandfather (1815-1876) was an excellent Persian and Arabic Scholar, and his Bayadh, which I hope to publish shortly, shows at once his wide reading and sound judgment. The Bayadh contains selections from Persian poets and covers the whole range of Persian poetry from the earliest times down to **Ghalib**, his contemporary. He himself occasionally composed verses which were mostly religious. His pcem on our **Saint Shaikh Mohiuddin Jilani**, I place here below :—

بحال خویش تنگم یا محی‌الدین جیلانی ◊ نگاهے از کرم سوے من اے محبوب سبحانی
بود سلطان و سید خواجه و مخدوم القابت ◊ بود در خلق نامت قطب عالم غوث صمدانی
غریب و شیخ و مولانا ولی درویش و هم شاهی ◊ که بر قد تو می زیبد لباس اعظم الشانی
بحسن خلق چون احمد علی سیرت حسن بانی ◊ بخوبی چون حسین و در صباحت یوسف ثانی
رخش تفسیر والشمس و دلش شرح الم نشرح ◊ دو دستش دستگیر خلق و قامت سرو ایمانی
همه موجود عالم حلقه در گوش اند پیش تو ◊ که دارد نام تو خاصیت مهر سلیمانی
غلامی از غلامانت گدائے از گدایانت ◊ منم محتاج محتاجان تو شاهنشاه شاهانی
علاجی کن مرا اے در لب تو معجز عیسیٰ ◊ که جان من بلب آمد ز اندوه گران جانی
ز گرداب غم برکش که هستی نوح کشتی بان ◊ بسیلاب حوادث زورق من گشت طوفانی
ز پا افتاده‌ام دستم بگیر و سرفرازم کن ◊ که نام تست پیرو دستگیر اے قطب ربانی
غلام خواجگان چشتیم تسلیم پیر من ◊ دلاور شاه صوفی حاجی و مقبول یزدانی

the manifold blessings of advancing civilisation, nor work together in concert and harmony. Nor is the Government ever likely to get at the real feelings and sentiments of the Indians so long as a social barrier divides the two races, notwithstanding the stupendous network of the espionage system and the Criminal Investigation Department.

Loyal addresses, flattering opinions, unqualified approval and assent, my father always distrusted, and refused to accept them as infallible guides. He traced three-fourths of these addresses and opinions to the industrious zeal of some aspirant or other to high office, a seat in Council, or, perchance, to some title or decoration. These are unsafe channels of popular opinion, and should rather be discouraged than countenanced.

He divided the Indian population into three classes : (1) the inarticulate masses who are only one remove from barbarism; (2) the over-zealous loyalists who are constantly professing deep devotion and passionate attachment to the Government; and (3) the extremists whom nothing short of Swaraj will satisfy. He declined to believe that the present political distemper in Bengal is due to the Partition of Bengal, but rather, he thought, it was the result of the treatment meted out to the Indians by the ruling class, and their exclusion from the higher offices of the State. The cure for the existing malady is not coercion and repression, but rather conciliatory measures, gentler means and kindlier methods. Terror of Law may, for a time, silence but will never wholly succeed in quenching the flames of popular discontent. My father fully endorsed the opinion of Prince Hohenlohe in this : that "Just as a man, however carefully brought up, reaches a stage when he insists on shaping his own destiny, so in the history of every nation there comes a moment when the best intentions of government are ignored, the most zealous discharge of its duties by a tutelary bureaucracy is contemned, **because the government and the bureaucracy will not recognize that the nation has attained to its majority.**" But if this is only partially applicable to India, at the present stage of her civilisation, it is beyond doubt that things are fast drifting to it, and in these troublous times careful pilotage is a condition precedent to future peace and prosperity. The policy which was necessary or even wholesome fifty years ago cannot now be adopted or pursued in its entirety. Reasonable changes or modifications must be the answer to altered circumstances. Never was truth told more openly than by Lord Salisbury when he said : "The axioms of the last age are the fallacies of the present; the

got up and marched out in the same fashion as that in which he had entered. Perhaps it was offensive to his dignity to stay in the same room with a couple of Indians, before the actual court work began, or perhaps he did not care to make any further exhibition of his folly and silliness. I ask the reader's forgiveness for this digression.

My father used always to say that Indians are not very hard to please; one kind word, a little courtesy, a little sympathy is all that is needed to gain full control and perfect sway alike over their heart and their mind. My father was far too practical to be given to abstract theories, universal doctrines, watch-words and shibboleths of any kind, and he was firmly persuaded that nothing was more needed, now, than genuine sympathy, kindly feelings and affectionate regards on the one side; implicit confidence, unshaken trust and absolute faith on the other. England, he said, has a noble mission to fulfil—none other than the education and elevation of the people of India—social intellectual and moral elevation—the creation of a sense of corporate and national unity out of divergent and discordant elements, to enable India to form an inseparable and integral part of her Island Kingdom : bound to it by the ties of love and gratitude, rooted to it by the blessings of culture and civilisation, and not held and retained at the point of the bayonet. This indeed, is the true mission of England, and this ought to be the animating, guiding and controlling spirit of her rule in India. Often did he wax eloquent when comparing and contrasting the Anglo-Indians of the days previous to the Mutiny, with those of his own times, deeply deploring the change for the worse that has taken place. While the Anglo-Indians of those earlier days mixed freely with the people, treated them with kindness and consideration, tried their uttermost to enter into their feelings, shared in their festivities and joined in their griefs; the generality of young civilians of the present day stand coldly aloof, regarding the people more as 'hewers of wood and drawers of water' than as rational and thinking beings with a brilliant and glorious past. He was thoroughly convinced that nothing was more necessary than a freer social intercourse between the English and the Indians; since out of it alone can come that warmth of mutual feeling which disarms suspicion, fosters regard, and kindles love. Moreover, as things are, it is hopeless to expect that the rulers and the ruled can ever know and appreciate each other. Conventional courtesy, fictitious adoration and obsequious submission are not calculated to ensure mutual esteem and regard, without which neither the Government nor the people can reap the full harvest of

'Confidence begets confidence,' and these were the men who trusted and encouraged the Indians, received them with open arms, sympathised with their hopes and aspirations, saved many families from impending ruin and starvation, and went out of their way to assist them.

They were not men of the modern Civil Service type, who with their formal 'dear sir' and the equally formal 'how do you do ?'—their superior Olympic air—their cold repulsive mannerisms—their supercilious, contemptuous smile—their rough, blunt ways—once a week condescend to receive either in their portico or their dismal officer room a few of the many thousand Indians committed to their charge. The present writer does not, for one moment, suggest that there are no exceptions to this most unfortunate rule, and he himself knows more than a dozen men high in office who are perfect models of kindness and sympathy and genuine regard for Indians and their feelings; but he must, at the same time, add that these are noble examples of men who have risen above their surroundings. I may be permitted, here, to relate one of my own experiences which is quite pertinent to the point I am making. I had, once, the misfortune of appearing before a young civilian whose conceit, I must frankly confess, was something quite out of the common, and whom I do not hold up as the average type of his fellows in the Service. My pleader and I went to the court-room exactly at 10-30. About a quarter of an hour after, his arrival was announced, and there was an unusual stir and commotion and excitement in the court premises, such as to tempt one to believe that either the Viceroy or the Lieutenant-Governor had paid a sudden and unexpected visit to a forlorn and forgotten building in India. The reader can well imagine our anxiety to mark the various stages of this most interesting comedy—and a veritable comedy it was. Soon after the announcement the great functionary sailed in into the court-room, but the most noticeable feature was his peculiar gait, which at once reminded me of the lazy, languid stroll of the frequenters of **Piccadilly** or the **Burlington Arcade**. There was only three of us there (the magistrate, the pleader and myself).[7] He completely ignored our existence, turned his back towards us, pulled out his cigarette-case, and began to smoke leisurely with an absolute disregard of the two other mortals that were there. For ten minutes or so he remained in that room, then

7. It may be interesting to know that I was not unknown to the magistrate, having been introduced to him shortly before, by an English Judge of the Calcutta High Court.

glaring to be mistaken or missed. Whether it will lead to results—good or bad—it is, indeed, premature to predict; but one thing is certain—this most charming feature of oriental life cannot last long.

Further, the introduction of the competitive system appeared to him largely responsible for the decline and decay of the old Hindu and Mohamedan aristocratic families. While it has brought men of very indifferent birth and position in life to the forefront, and has secured for them high stations in Government employ, it has left the cream and flower of the Indians to wither away unprotected and unprovided for. They find it hopeless successfully to compete in examinations with the **Novi Homines**; with the result that they must end their days either as Sub Inspectors of Police, or, if they are fortunate enough, as Registrars in some remote and outlying districts of Behar or Bengal. My father never attached much importance to examinations; nor did he believe that mere book-learning was a safe guarantee for the qualities needed to make either a good judicial or executive officer. It required, he thought, many generations to breed high qualities of the mind or body, and if the Government seriously gave a trial to the scions of old **Hindu** and **Mohamedan** families it would find in them not merely thoroughly competent to discharge their duties but scrupulously honest, strictly impartial, severely just, and eminently fitted for any duties that might be entrusted to them. He frequently referred, as instances, to the old subordinate judges who, though they wrote judgments in Persian, yet possessed a remarkable insight, and a rare knowledge of law and human life, and whose decisions not even their Lordships of the Privy Council felt inclined to disturb or vary. These men were not **crammers**; who by sheer dint of memory had passed examinations, but were descendants of the old **Hindu** and **Mohamedan** families, and as such commanded and fully justified the respect and confidence reposed in them by the public. The admission of such men, in larger numbers, would at once raise the tone of the public service, and impress upon it a character which the sons of weavers, petty tradesmen and the like, could scarcely hope to impart to it. Often did my father say, Where would **Sir Salar Jung**, **Sir Syed Ahmed** and **Mohsin-ul-Mulk** be if examinations alone were the test of statesmanship or high judicial and executive qualities ?

Moreover, my father never ceased to regret that men of the stamp of **Sir Ashley Eden** and **Sir Antony** (now Lord) **Macdonell**, **Sir Charles Lyall** and **Sir Henry Prinsep**, **Mr. Beveredge** and **Mr. Inglis** are becoming rarer and rarer in the Indian Civil Service.

Western influence upon the Indian Social System appeared to my father of a more durable character. It has completely transformed the domestic life of educated India and is steadily undermining the basis of Eastern family life. The Eastern family, unlike the Western, includes all the descendants of one common ancestor. Bound by the tie of kinship, in most cases they live together under the tender care of the head of the family, who is usually its oldest member and is invested with **Patria Potestas**, short of the power of life or death possessed by the Roman father. He decides disputes, enforces discipline, and his command has the force of law. He is the sole custodian of the family honour and prestige, and he is the one to whom the members of the family look up for help and guidance. A strong tendency towards decentralization has set in, and it is too

---

that the new Indian historical literature is the direct outcome of English influence. **Prof. Shibli** may be regarded as the founder of the historical school in India. He has lighted the torch, and it is he who has handed it on to others—men like **Moulvie Chirag Ali** and **Moulvie Abdur Razzaq**. **Moulvie Chirag Ali** deserves more than a passing notice. He has written two books of great excellence and great merit—'A Critical Exposition of the **Jehad**' and '**Reforms under Muslim Rule**.' In the latter he discusses with much learning and breadth of view the weak points of the **Islamic Government** and advocates certain reforms which he considers imperative for the salvation and preservation of Mohamedans as a community. This work exemplifies, indeed, the spirit of compromise and shows the extent to which it is prepared to go. The burden of the book is to prove to his co-religionists the necessity of moving with the age in which they are living. He urges them to consider whether institutions thirteen hundred years old can be accepted in their entirety without change or modification. He points out the enormous changes through which Mohamedans have passed, and advocates that circumstances having changed, they must needs modify, alter or even do away with institutions which are no longer in harmony with existing conditions and requirements. No sane person will deny the soundness of this proposition, but, for our purposes, we need only note that such views are clear indications of the changes that have come over the tone and temper of the Mohamedan community. But if the study of history has, under English influence, been placed upon a modern basis, we cannot fail to trace English influence in the rich crop of novels that have appeared in the **Urdu** language. True, these novels contain no shrewd criticisms of life, nor do they deal with the various and varying shades of human character. They do not possess cleverness of design, nor mastery of finish; but we should not forget that this art is still in its infancy and has a future before it. These are, indeed, infallible signs of a new age which is dawning upon the Mohamedans. It is an age of silent revolution in which old habits are shaken, old views overthrown, ancient assumptions rudely questioned, and ancient inferences utterly denied. The result is an impatient anxiety to put an end to the slavish devotion of the past which, so far, stifled growth and destroyed that adaptability to changing circumstances which is the condition precedent of progress and success."

the middle calss **Hinduism** to its deepest foundations. It has unsettled the belief of the partially educated classes, without substituting anything in its place. Nor has it failed to leaven Islam. To this influence did he ascribe the growing religious scepticism, agnosticism and even atheism in educated circles. But he considered it as a mere passing phase, to be followed by the return of an orthodoxy of a perhaps more reasonable and permanent character.

---

we have the most harmonious blending of European and Eastern education. If **Sir Syed** was the premier advocate and founder of **Muslim** education on modern lines he was also the first in India to remove the crust of superstition and bigotry with its thousand incidents which overlaid and disfigured the original simplicity of Islam. A new life was poured into **Islam**, and **Sir Syed** must be regarded and reckoned as one of the apostles of our age. The impulse which he has given to modern education and the interpretation which he has put upon Islam and its tenets have borne a rich harvest. The narrow and straight-laced doctrines of the doctors and divines were scattered to the winds, and a new era set in, the watchword of which was reform in all directions; reform in social life, reform in religion and advance in matters intellectual. The upward march is always slow, but even the least reflective of observers would scarcely fail to notice that there is an appreciable advance towards progress. Nor are the Mohamedans insensible, now, of their political position. This, indeed, is only natural. With education come political hopes, ambitions and aspirations. They have rightly refrained, so far, from adopting methods of political agitation with which, of late, we have become only too familiar. But that is due mainly to their belief that conciliatory steps and respectful requests are more profitable and effective than clamorous speeches and seditious advocacy. In the interest of both the Government and our Mohamedan fellow-subjects we hope that this feeling of trust and confidence on the one hand, and help and sympathy on the other, will continue without a break.

Notable, indeed, is the spirit in which modern **Mohamedan** writers have addressed themselves to the task of writing history. We, of course, expect modern treatment of history from **Mr. Ameer Ali** who is abreast of modern culture and has had the advantage of an English education, and whose historical works might be favourably compared with works of recognized European historians. But the Modern spirit, so to speak, is in the air, and is not confined to men who have been to Europe or have received their training at European or English Universities. We have got, indeed, Mohamedan historians who have never set foot on European soil saturated with the same spirit. This fact, to be sure, can only be accounted for by the influence of European or rather English education, which has been steadily gaining ground here, and which has been affecting all classes and conditions of men. In **Prof. Shibli**, who might be called a disciple of **Sir Syed**, we have the triumph of modern historical method. Though ill-acquainted with English, **Prof. Shibli** is in line with modern historical criticism. He has opened a new vein in Indian historical criticism, and his canons of historical criticism would be accepted without demur or hesitation even by the Regius Professor of History at Oxford. It scarcely admits of a doubt

European civilisation and the majestic march of democratic ideas. This being the position of affairs educated Indians, secretly if not openly, resent the social distinctions and social disabilites which divide them from their rulers. They naturally crave, so he thought, for a share in shaping the policy of the Government, and a fair reperesentation in the higher offices of the State. True, this feeling is yet confined to a narrow and limited class of educated men, but decade by decade, education is fast increasing, and is penetrating larger and larger areas. It was here, more than anywhere else, that my father saw a source of danger alike to the people and the Government. Nevertheless, he hoped that as time went by, Government would make greater concessions and allow greater privileges to the people than it is, at present, prepared to concede.

Keenly alive as he was to the incalculable advantages which have flowed from British rule in India,—namely, the enlargement of the intellectual outlook, the impetus to trade and commerce, the general and widespread prosperity of the country and the people, a universal sense of security of person and property, the growth of civic life and its necessary concomitants,, the unmistakable progress towards the recognition of the rights and status of women,—with all these cheering and cheerful results which promise still brighter prospects for the future, he was, at the same time, not insensible to the destructive results of European influence.

Of such results he found the most clear and cogent evidence in two directions : firstly on the religion, and secondly on the social systems of the Indians[6]. Western influence has made a vigorous assault on the religions of India, notably on **Hinduism**. It has shaken

6. I shall here quote from my article on 'The Mohamedan Awakening' published in the *Empire* of the 15th and 22nd November 1906 : "Misconceived ideas of Islam prevented the Mohamedans from applying themselves to the study of English. This prejudice against it continued for some time after the Mutiny. It was reserved for **Sir Syed Ahmed** to bring home to the Mohamedans the utter folly of the position they had taken up. He pointed out to them, in season and out of season, the blazing indiscretion which was wrecking their career as a people. He met with opposition and was cried down as a setter forth of strange things, but he continued to preach and eventually succeeded in bringing round his people to his own mode of thought. The political life of the Mohamedans could only be saved from extinction, so thought **Sir Syed**, by participating in and not discarding Western education and Western culture. To plant his teaching on a permanent and abiding basis he established the **Aligarh** College. Here were the two streams of Eastern and Western culture to meet, and unite and broaden into a mighty channel for the general benefit of his people. The result has completely justified his hopes and wishes, and at **Aligarh**

He did not, however, believe that a wave of discontent or disloyalty was passing over the country, or that there was any genuine or widespread unrest among the people, but he apprehended that if the misunderstanding between Government and people were to continue long unremoved difficulties might arise in the remote if not near future. He took a lively interest in the **Russo-Japanese War**, and in his letter of the 1st of November 1906 he writes to me: "My house is a solitary confinement in holidays, and I regret to say that the first volume of the **Russo-Japanese War** which I have been reading is now over." He did not, like some writers, ascribe this new phase of thought to the victories of **Japan**, but mainly to the growth of education among the people. India has been suddenly drawn into the main current of European thought, and the influence of European civilisation has had a pronounced and decisive influence over her. English is universally studied out here, even to the neglect and exclusion of **Arabic** and **Sanskrit**. People have suddenly risen from their long slumber and see before them the dazzling briliance of

---

اطوار کی اصلاح کرے اگر یہ چاھتا ھو کہ بیٹا معقول اور خوش وضع ھو - ناظرین معاف فرمائینگے یہ ایک میرے سامنے کا واقعہ ھے کہ جس سے ناظرین خیال کرینگے کہ باپ کے افعال آئینۂ دل پر بچون کے ویساھی جاگزین ھوتے ھین جیسا فوٹو کی تصویر کاغذ پر اُترتی ھے - مین اتفاق سے ایک رئیس کی ملاقات کو حاضر ھوا - مین نے دیکھا کہ چند مصاحب جمع ھین اور نفیس حقے اور ایک ارباب نشاط مین سے جو وجیہہ الصورت تھی وھان بیٹھی ھے - مجھہ سے اونسے ایک مقدمہ کے بارے مین باتین ھونے لگین - ایک صاحب نے آکر اُن سے عرض کیا کہ صاحبزادے کے پاس ایک زن بازاری بیٹھی ھوئی ھے وہ نہایت خبط مین آئے کھڑے ھوگئے اور فرمانے لگے کہ لاٹھی لاؤ - غرض لاٹھی آئی مین بھی کھڑا ھوگیا - اور مین نے اُنکا ھاتھہ تھام کر یہ پوچھا کہ جناب اس لاٹھی سے آپ کسے مارنے جاتے ھین اُوس زن بازاری کو یا صاحبزادے کو - اس پر وہ کچھہ متامل ھوئے - تو مین نے اُنکی خدمت مین عرض کیا کہ پہلے جناب اس لاٹھی سے اس زن بازاری کو جو آپکی صحبت مین بیٹھی ھے مار کر نکالئے اوسکے بعد بے کسی زحمت کے وہ زن بازاری جو مجلس مین آپکے صاحبزادیکے ھے خود چلی جائیگی - افسوسناک حالت یہ ھے کہ ھمارے فرقۂ اسلام مین دو چیزین ضروری ھین اوامر اور نواھی انکا حال بقول غالب بھی ھوگیا :

لا تقربوا الصلواۃ ز فہیم بخاطر است ◊ و ز امر یاد ماندہ کلوا و اشربوا مرا

ارباب بصیرت کی خدمت مین صرف اسیقدر التماس ھے کہ جب اندھنی حالت مسلمانون کی ایسی ھوگئي ھے تو کون سی توقع ھے کہ اُس قوم کے بچے اچھی تعلیم پائینگے اور سر بر آوردہ نکلینگے ◊

ness, self respect, self-reliance, respect for womanhood, regard for religion, fellow-feeling and mutual toleration—these are the qualities, he would frequently say, the Indians must possess before they can hope to rise or reasonably call for Self-Government. With the **Swadeshi** movement, namely, the movement which aims at reviving the faded industries and forgotten arts and crafts of India, he was in perfect sympathy, but he had nothing but unmixed contempt for a movement which, under cover of promoting native industries avowedly has for its end and aim the excitement of racial jealousy and racial hatred. He never attached any importance or gave a second thought to the wild excesses recently perpetrated in Bengal, but, at the same time, he believed that throughout the country there existed a general feeling that the claims of the people were not fully considered nor their wishes always consulted.

بچون کی کرے اور ہمیشہ ہدایت معقول لڑکونکی مان کو اس باب مین دے - کیونکہ ہندوستانکی بیبیان عدم تعلیم کی وجہ سے اور نیز پردہ نشینی کے باعث سے دنیا سے واقفیت نہین رکھتین - ایسی پردہ نشین بی بی کسی فعل کے نتیجہ کو کیا سمجھہ سکتی ہے جب بچہ دایہ کی گود سے الگ ہو تو پھر اسکو عورتونکے پاس رہنا کسیطرح جایز نہین اور ہم ہندوستانیونکے گھر مین لونڈیان دائیان مامائین مغلانیان کثرت سے ہین ہمیشہ والدین کو ایسی کوشش کرنی چاہئے کہ اس فرقہ سے لڑکے اور بچے الگ رہین - بعد مکتب بچون کو مہذب لوگونکی صحبت مین رکھنا چاہئے اور ہمیشہ یہ خیال کرنا چاہئے کہ خانہزاد اور غلام بچون کے ساتھہ نہ رہین - اور جو طلبا بچون کے ساتھہ پڑھین جیسا کہ عموماً مسلمان گھرون مین دستور ہے انکی وضع کی بھی نگرانی کرین ہمیشہ ایسے اسکولون مین لڑکونکو دینا چاہئے کہ خوش اطواری اور اخلاق حمیدہ ان کے بڑھین - اور ماسٹرون کا یا مدرسون کا یہ ایک فرض منصبی ہونا چاہئے ◊

حضرات ایک انگریزی قول یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے بچون کے اخلاق درست کیا چاہے تو پہلے اپنے اخلاق درست کرے - افسوس ہے کہ مائیں تو تعلیم یافتہ ہین ہی نہین کہ وہ غریب اس کے نکات کو سمجھین باقی رہے بچون کے باپ وہ ان اقسام کے لوگ ہین دولتمند نوکری پیشہ تجارت پیشہ یا مزدور - دولتمندونکو ہندوستان کے اپنے بچونکی تعلیم کیطرف توجہ نہین - ہر شخص اپنے گریبان مین سر ڈالکر خود اپنے اطوار کو دیکھہ سکتا ہے اور ناظرین اسکو خود خوب خیال فرماسکتے ہین - وہ غریب بچے جنھون نے آنکھہ کھلتے ہی باپ کا سامان عیش و عشرت دیکھا فرمائیے اوسکا جی پڑھنے لکھنے مین کیونکر لگ سکتا ہے اوس نے تو یہہ سمجھہ لیا کہ دنیا مین یہی چیز ہے ورنہ ہمارا باپ کیون کرتا - بچون کا دل مثل صفحۂ کاغذ کے ہے اوسپر جتنے نشان پڑینگے وہ نقش کالحجر ہوجاوینگے پس لازم ہے کہ باپ اپنے

outrages and the discovery of a secret anarchial society as a signal proof of the English sense of justice and equity. He never, however, for one moment, doubted that the country as a whole was loyal to the core, and regarded the mad melodrama enacted in Bengal as the outcome of temporary brain-storm and diseased fancy. He held firmly by constitutional principles, and those he did not consider that our Government is perfect or flawless (that no Government is), he yet had an unbounded faith and confiidence in the English character; and was firmly convinced that any grievances properly represented, or any demand honestly made, would meet with the serious attention of the Government. He thought it would do good to the people who talk glibly about **Swaraj** carefully to study and inwardly to digest **Bagehot's "Physics and Politics"** and take its lessons seriously to heart.

In the following passage of that remarkable book he found a deep lesson for the overweening politicians of our age :—"What are called in European politics the principles of 1789 are fitted only to the new world in whcih society has gone through its early task; when the inherited organisation is already confirmed and fixed; when the soft minds and strong passions of youthful nations are fixed and guided by hard transmitted instincts. Till then not equality before the law is necessary but inequality, for what is most wanted is an elevated *elite* who know the law : not a good Government seeking the happiness of its subjects, but a dignified and overawing Government getting its subjects to obey : not a good law, but a comprehensive law binding all life to one routine. **Later are the ages of freedom; first are the ages of servitude.**" The energy expended and the time wasted on political propaganda might profitably be employed both by **Hindus** and **Mohamedans** on social and intellectual advancement, without which politics were barren, ineffectual and unavailling. He insisted on the purity of the home[5] and regarded character as of greater moment than a University degree. Honesty, strightforward-

---

5. Extracts from my father's article on طریقۂ پرورش اطفال published in دبدبۂ آصفیہ number 9, 1320 A. H. (Hydrabad Deccan)

نپولین جب سر برآوردہ ہوا اور تمام فرانس اوسکے قبضہ مین آیا اور یورپ پر بڑا
دباؤ اوسکا پڑا اور اوسکا تجربہ بہت وسیع ہوا اسکا قول یہ تھا کہ فرانس مین افسوس بچون
کی پرورش کے لئے مائین نہین ہین اس مین کچھہ شک نہین کہ بچونکی پرورش اور
اُنکی نگرانی خصوصاً اُس زمانے مین کہ جبتک وہ پانچ چھہ برس کی عمر کو پہونچین
ماؤن سے بہتر کوئی نہین کرسکتا اسلئے اسکی شدید ضرورت ہے کہ باپ خود نگرانی

IV

Marked with a sanity of judgment and a clarity of vision were his views alike regarding religion and politics. He took a liberal and extended view of religion—a practical view of politics. He was firmly persuaded that English rule was an unqualified blessing for India, and that its withdrawal would at once evoke the undying passions of opposing creeds and all the smouldering ambitions of the warlike races. In other words, India, without the English, would become the theatre of the wildest anarchy and the scene of the most unspeakable horrors. He admired the English sense of duty which shirked no danger and feared no obstacle, and he always told me that it was his rarest privilege to count among his friends some of the great Anglo-Indians who have served the Indian Empire. Nor was this feeling onesided. His English friends had a genuine regard for him, and always showed him the greatest consideration. They appreciated his dis-interested and public-spirited action in giving to the public his magnificent collection of books and the enormous self-sacrifice that it involved. It was his deep-rooted conviction that India, at this stage of her career, stood in the greatest need of social reform, and he regretted the enormous waste of energy on the part of the so-called **'Politicians,'** and the itinerant preachers of **Swaraj** and Boycott, who, he thought, were doing positive harm to the country. He believed that the time was not yet ripe for India to immix herself in politics, and half-a-dozen fluent and facile orators could not give to 'the three hundred millions whom the Imperial Sceptre sways' that political turn of mind which, for its formation, requires centuries of discipline and training, and which can alone create unity of action and unity of purpose. India, with her numerous communities, each looking askance at the other, with an intensity that had its roots founded in deep differentiations of character, faculty and condition, was hardly prepared yet to embark on a political mission, and it was criminal folly to establish secret societies and to have recourse to the dagger of the assassin. Such are not the methods by which he thought India could realise her legitimate ambition or the Indians their legitimate dues. These would serve merely to retard progress by creating a feeling of suspicion and distrust on the part of our rulers. He always admired the patience and forbearance, the self-restraint and self-control which those at the helm of the State display under most trying and irritating circumstances; and he pointed to the action of the present Government in connection with the recent bomb

rajah of Durbhanga. His wish and object, he assures me, was not to make any imputations, which, in the circumstances in which he spoke, would be altogether out of place, but to indicate the points on which friction might possibly occur between **Hindus** and **Mohamedans**, and so, by anticipation, to guard against its occurrence. This explanation will, I am sure, be accepted by **Mohamedans** and others in the conciliatory spirit in which it has been offered to me. Please convey to your many **Mohamedan** friends my best thanks for the marked courtesy and friendliness with which they received me at Patna, and believe me to be, .

Yours sincerely,
A. P. MACDONELL.

My father was wont to say that he had a strain of **Brahmin** blood in him, and throughout his life he showed a pronounced partiality towards the **Hindus** among whom were some of his best and devoted friends. The story runs thus. My grandfather, as infant, was suckled by a **Brahmin** lady, and out of deference to the memory of his foster-mother neither my father nor my grand-father ever took beef; and this family scruple and family prejudice against cow's flesh has continued unchanged.

My father was of an essentially didactic turn of mind, and he would often tell me that he considered nothing a greater sin than to wound the feelings of others, or "to blend our pleasure or our pride with the sorrows of the meanest thing that feels"; and these occasional sermons were constantly wound up either with the charming **Qat'a** of **Imad** or the equally charming lines of **Sawda** or **Rasikh** :—

بر لوح جان نوشته‌ام از گفتهٔ پدر ◊ روز ازل که تربت او باد عنبرین
گفت اے پسر بصحبت افتادہ گر رسی ◊ شوخی مکن بچشم حقارت درو مبین
بر شیر ازان شدند بزرگان دین سوار ◊ کاهسته تر ز مور گذشتند بر زمین
گر در جهان دلی ز تو خرم نمی شود ◊ باری چنان مکن که شود خاطری حزین
یاری بجز خدا نتوان خواستن عماد ◊ یا مستعان عونک ایاک نستعین

کعبہ گیا جو ٹوٹ تو کیا جاے غم ہے شیخ
یہ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائیگا

جو ہے تعمیر در عرش عظیم ◊ سو ہے ٹوٹے ہوئے دل ہی کا مقیم

you to be scornful, whose virtue is a deficiency of temptation, whose success may be a chance, whose rank may be an ancestor's accident, whose prosperity is very likely a satire." Oft did I hear him recite the couplet of **Zauq** ذوق :—

هاں ذوق کسکو چشم حقارت سے دیکھئے
سب هم سے هیں زیاد کوئی هم سے کم نهیں

Nothing excited his emotion or stirred his compassion more than the sight of poverty, and he frequently told me that he could not understand the strange dispensation of Providence under which some were rolling in wealth and others grovelling in absolute penury. But this observation was invariably qualified by the remark that "He knoweth his ways best." To the poor and the suffering he never grudged help if it lay in his power, and I well remember some years ago the visit of a friend of his youth who was in sore distress. The man was too proud to beg, and he brought with him a MS. which he wanted to sell to my father, and the only reason for the sale that he assigned was his immediate want of money. My father looked at the MS. and told him that he had better copies in his possession. (I believe it was a copy of either **Sadi** or **Jami's works**). He then returned the book to him, and with it a hundred-rupee note. He believed in the brotherhood of humanity, and never suffered religion to be a barrier to a genuine friendship or intimate social intercourse. Religion, he thought, was a matter between man and his God, and a thing too sacred and too holy to be dragged into the details of life. On more than one occasion he allayed passions and smoothed difficulties between **Hindus** and **Mohamedans**, and in 1893 he took a prominent part in bringing that hateful cow-killing question—the fruitful source of so many disturbances in India—to a happy and peaceful settlement. It was on that occasion that Sir Antony Macdonell, the then Lieutenant-Governor, addressed to him a letter, a copy of which I give below :—

LIEUTENANT-GOVERNOR'S CAMP, BENGAL.
August 7th, 1893.

DEAR KHAN BAHADUR,

I thank you for your letter of the 3rd instant, and for the valued and loyal promise of your assistance in removing the feelings of irritation which here and there have arisen between **Mohamedans** and **Hindus** in connexion with the slaughter of cows. I think that there has been some misapprehension of the meaning of the Maha-

loving fondness for his followers. Moreover, in **Islam** he found a religion which set before its followers an ideal neither too difficult to attain nor at the same time impossible to realise. In it he saw not merely 'counsels of perfection' but a religion which might scrupulously be followed without renouncing the duties and responsibilities of the world. But with all his attachment to **Islam** he was not one of those who relegated the professors of other religions to eternal damnation. He could not conceive that God, whom we are taught to believe as just, loving, and merciful, would commit the major portion of mankind to the everlasting torments of hell-fire because they happen to hold a different creed or to worship Him in some manner other than the one prescribed **Islam**, and often would he quote in support of his view the noble utterances of **Sana'i**, **Dard**, and **Ghalib** :—

سخن کز بہر دین گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکان کز بہر حق جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

شیخ کعبہ ہو کے پہونچا ہم کنشت دلمین ہو
درد منزل ایک تھی تک راہ ہی کا پھیر تھا

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے
مرے بت خانہ مین تو کعبہ مین گاڑو برہمن کو

His whole view of life was deeply coloured by religion. Resignation to the will of God was his watch-word, and never was his faith shaken, however bitter the trial, however acute the suffering. He never worried about the mystery of pain, of evil, of the future life, of the brevity of existence. For these he did not go to philosophy to seek a solution, but to religion; and there he found all that was necessary to give him inward wealth and joy and sweet content. 'Whatever is, is right' was his philosophy of life, and he took joys and successes, sorrows, misfortunes and bereavements with a cool head and a calm fortitude; in other words, he always preserved a temper "cool in arduous and reasonable in prosperous circumstances."

The guiding principle of his conduct towards others might well be summed up in the language of Thackeray : "Be gentle with those who are less lucky, if not more deserving. Think what right have

ایمان فائزالمرام باین حقیر ملحق سازد -

حررہ خدا بخش عفی عنہ المرقوم تاریخ ۱۲ اپریل سنہ ۱۸۹۳ ع

With rapturous enthusiasm did he always quote the following **Ruba'i** :—

ای مطلع آفتاب ذات احدی ◊ صبح ازلی چراغ شام ابدی
کس نیست بجز تو دستگیرے ما را ◊ یا ختم رسل خذ بیدی خذ بیدی

On the 10th Mohurrum my father never allowed us children to see the **Mohurrum** procession, which he regarded as a mockery and travesty of religion, and for which he never found language sufficiently condemnatory. He thought it wicked to a degree to convert the anniversary of one of the greatest tragedies in the history of **Islam** into a day of carnival and festivity, instead of observing it scrupulously as one of veritable mourning; and perhaps it would surprise the reader to know that up to now I have not seen the **Patna Mohurrum** procession which, I am told, is almost unique in grandeur and magnificence. On the anniversary of that terrible day he occupied himself in the study of the Qur'an and other religious books.

It was one of his deepest regrets that he could never visit the two holi cities of **Mekka** and **Medina**. Here I may mention an instance of my father's extreme religious tolerance. In 1894, when I returned home from England for the summer vacation, I often had discussions with him on religious subjects, and he found fault with my views as being somewhat unorthodox, but he never lost his temper or showed the least sign of displeasure. On the contrary he purchased for me **Sir William Muir's "Life of Mohamed," Koelle's "Life of Mohamed,"** and **Dodd's "Buddha, Christ** and **Mohamed,"** books by no means favourable to the Prophet; but at the same time, he asked me to study the other side of the question as well before making up my mind one way or the other. Among **Muslim** authors whom he suggested that I should study, he laid special stress on the following : **Ibn Hisham**, the **Shifa** of **Kadhi Iyadh, Kitab-ul-Wasila** of **Mulla** (a unique MS. in our library); **Zad-ul-Ma'ad** of **Ibn Qyyam** (another rare MS. in our library); and the collection of Muslim traditions which he said, reveal the inner life of the Prophet, his intense religious conviction, his glorious self-sacrifice, his stoical firmness in defeat, his magnanimity in victory, his simple unostentatious life, the entire absence of pride, ambition, arrogance and vindictiveness from his character, and his passionate devotion and

If this is the case—and undoubtedly it is so—between such close neighbours as the English and the French, we need not marvel to the inability of the Western writers rightly to understand that strange and complex quantity—Oriental character—without which they can neither intelligibly interpret their life nor with any reasonable accuracy expound their history. It was the intensity of religious belief alone, unalloyed by baser considerations which was the real propelling force of the life of the Prophet, and it would be an error to ascribe his actions, as it has been done, to motives other than religious. We often read of certain measures of the Prophet attributed to political foresight and reasons of statesmanship, but neither politics nor statecraft had any meaning or significance in those days of sweet simplicity.

The error lies in introducing preconceived notions into the study of the history of those times, and it is singular that even so careful and circumspect a writer as **Von Kremer** ascribes the conversion of the **Arabs** mainly to their love of money and the boundless prospect of booty which the early militant Islam offered to them, and equally singular is it that so sound and thorough a scholar as **Dr. Goldziher** seriously argues from the similarity between certain Muslim Traditions and Biblical passages that the former were necessarily borrowed from the latter.[1]

Were I to discuss this subject here I would be taken far afield, and I therefore leave it for a more seasonable occasion.

Though my father could not, for one moment, sympathise with religious bigotry and intolerance, he was yet a Muslim through and through. For the Prophet and his family he entertained the most devout reverence, and to the last he never missed the five daily prayers. After the morning prayer he would regularly read the **Qur'an** for half-an-hour, and a magnificent copy of the **Qur'an** was one of the gifts which I received from him on the eve of my departure for England. On the fly-leaf he wrote :—

قران مجید زاد الله شرفه و عظمته به فرزند ارجمند خود صلاح الدین مد عمره
بروز روانگی ولایت بغرض تلاوت فرزند عزیز مذبور بخشیدم - خداوند تعالی به
برکت این مصحف شریف فرزند مد عمره را در امن خود نگاه دارد و بسلامتی

4. "It has been the fashion," says Deutsch, "to ascribe whatever is Islam to Christianity. We fear this theory is not compatible with the results of honest investigation. For of Arabian Christianity, at the time of Mohamed, the less said, perhaps, the better. By the side of it even modern Amharic Christianity of which we possess such astounding accounts, appears pure and exalted."

have themselves failed to attain, realised in their sons, as if in this way they could live their early experience." He advised me, on the eve of my departure for England, to study French and German, and recommended me to write a history of Islam from the standpoint of a Muslim. He regretted the spirit in which the life of the Prophet and the history of Islam were treated by European writers, and he was firmly persuaded that it was almost impossible for Western writers to do full justice to, or to handle, either of these subjects in a dispassionate spirit. The East and the West, he thought, were as widely apart from each other as they could be. Eastern thoughts and Eastern traditions, Eastern ideals and Eastern sentiments, were so utterly different and even opposed to the Western current of thought, that it was perhaps a hopeless task for a European really to enter into or fully realise the feelings and sentiments of the Oriental. Moreover, the strong hold which religion has over people in Eastern countries, is something quite foreign and inexplicable to a European; and its dominating sway over the minutest details of their life is something inconceivable and enigmatical to him. While religion is no more than a social function in the West, in the East it is the very essence of life. In this I am entirely disposed to agree with my father, and I ascribe the failure of European writers in comprehending the character of the Prophet and the phenomenal success of the **Islam**, to a complete misconception of the Eastern character and Eastern sentiments. Very truly does Bagehot say: "National character is a deep thing—a shy thing; you cannot exhibit much of it to people who have a difficulty in understanding your language; you are in strange society, and you will not be understood."[3] "Let an English gentleman," writes Thackeray, "who has dwelt two or four or ten years in **Paris**, say at the end of any given period, how much he knows of **French** society, how many French houses he has entered, and how many French friends he has made. **Intimacy there is none; we see but the outside of the people.** Year by year we live in France, and grow grey and see no more. We play écarté with Monsieur de Trêfle every night; but what do we know of the heart of the man—of the inward ways, thoughts, and customs of Trêfle? We have danced with Countess Flicflac, Tuesdays and Thursdays, ever since the peace; and how far are we advanced in her acquaintance since we first twirled her round a room? We know her velvet gown and her diamonds; we know her smiles and her simpers and her rouge, but the real, rougelss, *intime* Flicflac we know not."

---

3. Bagehot, "Literary Studies," vol. ii, pp. 44-45.

کے لئے طلوع ہے اوسکے لئے غروب بھی ضروری ہے - ہر متولد کیلئے موت ساتھ لگی ہوتی ہے اور ہر انقلاب پذیر چیز کا مادہ انحطاط و فنا قوام ہے - اسکے بعد وہ یہہ لکھتا ہے کہ مذہب اسلام وہ مذہب ہے کہ جسکو ایک موحد فلسفی بے تکلف قبول کر سکتا ہے -

The language of Gibbon had a fascinating hold upon his mind, and Gibbon's sympathetic treatment of Islam and its heroes could not fail to appeal to a Muslim. As a boy I remember learning by heart passages from the "Roman Empire" selected by my father.

We read together **Mill's** Autobiography, **Goethe's** "Truth and Poetry" (Dichtung und Wahrheit) and the autobiography of **Benevenuto Cellini**; and he was never weary of impressing upon me the lesson drawn from the lives of these great masters. He considered biographies as the most instructive of all studies, and used to refer to Goethe's preface to "Truth and poetry" where the great sage of **Weimar** says : "For this seems to be the main object of biography, to exhibit the man in relation to the features of his time, and to show to what extent they have opposed or favoured his progress; what view of mankind and the world he has formed from them, and how far he himself, if an artist, poet or author, may externally reflect them. But for this is required what is scarcely attainable—namely, that the individual should know himself and his age; himself so far as he has remained the same under all circumstances; his age, as that which carries along with it, determines and fashions both the willing and unwilling, so that one may venture to pronounce that any person born ten years earlier or later would have been quite a different being both as regards his own culture and his influence on others." Thus it is that the study of biographies and autobiographies written by great masters yield the richest harvest. They trace the gradual evolution of the minds of great men and serve to exercise a healthy and stimulating influence on others. He found an inexhaustible source of pleasure in the noble lines of Wordsworth :

> "There is one great society alone on earth,
> The noble living and the noble dead"

and in the immortal couplet of the poet **Mutanabbi** :

اعز مکان فی الدنا سرج سابح ◊ و خیر جلیس فی الزمان کتاب

He impressed upon me, in season and out of season, that life would not be worth living were it not for intellectual pursuits, and as Goethe says, "it is the pious wish of all fathers to see what they

جلال الدین رومی در تفسیر آیهٔ کریمه عسیٰ آن تکرهوا شیئاً و هو خیر لکم بسلک نظم کشیده اند مماثلت تام به بعضی از خیالات که بالا گزشت دارد پس نخواستم که درینجا ثبت نا کرده خموش بگذرم :

دان تو حیوانی که نامش اشغر ست ◊ او بزخم چوب زفت ولمترست
تا که چوبش میزنی چربه شود ◊ او ز زخم خویشتن فربه شود
نفس مومن اشغری آمد یقین ◊ کو بزخم چوب شادست و سمین
پوست از دارو بلاکش میشود ◊ چون ادیم طایفی خوش می شود
ایکه تلخ و تیز مالیدی برو ◊ گنده گشتی نا خوش و ناپاک بو
آدمی را نیز چون آن پوست دان ◊ چونکه مدت ها شده زشت و گران
تلخ و تیز و مالش بسیار ده ◊ تا شود پاک و لطیف و با فره

کسی را که از جوهر علم و هنر حلی بسته باشند چرا برین سنگریزه های رنگارنگ فریفته شود - درین باب آنکه بلند پرواز ساخت معنی حکیم میرزا محمد المشتهر به نعمت خان المتخلص بعالي در مثنوی خود مسمی بسخن عالی میفرماید برای تفنن طبع ارباب بینش بقلم می آمد ◊

انچه نامش هر کسی دولت نهاد ◊ جمع حیوان و نبات ست و جماد
هر که فخر و ناز بر اینها کند ◊ گوئیا ترجیح بر خود می دهد
چیست آخر معنی این افتخار ◊ یعنی از خود من ندارم اعتبار
از طفیل گاو خر آدم شدم ◊ آه از سنگ و گیاهی کم شدم
ننگ دار ای جان که پربی غیرتی ست ◊ هر که در انها ست غیرت در تو نیست

An accomplished **Arabic** and **Persian** scholar he was by no means unacquainted with English literature. Among English poets he admired Byron most, but he was not insensible to the lyrical intensity of **Shelley**, the fascinating elegance of **Keats**, the sweet reasonableness of **Wordsworth**, the ineffable charms of **Tennyson,** and the robust manliness, mingled with a dash of scepticism, of **Swinburne** whom he likened to **Qa'ani** — both supreme and matchless in their fine and forcible diction. For **Gibbon** he had an unbounded admiration, and almost the whole of the chapter on the **'Rise of Islam'** he committed to memory. In his address as President of the **Anjuman Islam**, Patna, he said :—

گبن (Gibbon) نے آیات کریمہ کے ترجمہ کو پڑھکر یہہ عبارت اپنی تاریخ مین لکھی ھے جسکا ترجمہ یہ ھے : رسول مکی نے پرستش (اصنام) اشخاص اور سیارہ کو اس معقول دلیل پر ممتنع کر دیا کہ جسکو عروج ھے اسکو زوال بھی ھے - جس شخص

حقی - سید علی همدانی که از اجل صوفیه بود در ضمن این حدیث میفرماید
که کسیکه ازین کار رو پیچد فتنه بر زمین انگیخت و فسادی بزرگ کرد -
چه نکاح از جنود شیاطین باز دارد و باعث بقای وجود انام و تکثر بنی نوع
انسان است - ای عزیز اگر از گناه سر مصئون ماندن داری رو بدینصوب آری
ورنه انجام کار خود بینی ◊

در باب ترک و تجرید

قول سیکا بر وفق اصول فلسفهٔ اسٹئک بس ملتذ است میگوید خوبی ها
که از دولت خیزد تمنا را شاید مگر آنچه از ترک و تجرید زاید مدح فراوان را
شایان باشد - چه معجزات که همین تصرف بر مراد طبیعی ست در حالت
تجرید بیشتر بظهور رسد اسپی این قولش بالا تر ست از قول سابق بلکه از
خدا نا پرست خیلی عجیب قوله براستی بزرگست کسیکه با ضعف فطرت
انسانی استقلال خدائی داشته باشد این گونه بلند پروازیها خیالات شاعری را
سزاوار ست چنان که شعرای قدیم باین قول کارها داشته اند اگر بدیدهٔ دقیقه
رس دریابی این قول باین حکایت ماند که سخن عهد پیشینه در نظم خود جلوه
داده اند و خالی از خطا نیست بلکه بخصایل دین حقه خیلی مشابهت دارد
گویند که هرکیولیز بهر رهائی پرامتهن بر کاسهٔ گلی عبور بحر محیط کرده -
انسان هم باستعانت استقلال عقیدهٔ دینی بحر بیکنار دنیا را که پر از تلاطم
امواج اختلال ست با شکسته زورق جسم خاکی طی کرده خود را بساحل
سلامت می برد - و بالاخر در یسر اعتدال و در عسر استقلال شعارند ممدوح
و در مصائب بضبط بسر بردن همت ست مردانه - آسایش شادباشی ست در
زبور - و زحمت فرخندهٔ پیامی ست در انجیل - رحمت الهی و عواطف جناب
احدیت تعالی شانه که نامتناهی ست منوط باین ست - با این همه اگر بر
صحیفهٔ داود نظر انگنی مرثیه های با سرود را با نغمه های مسرت انگیز مساوی
یابی - کاتب قدرت در تحریر مصایب ایوب بیشتر از آسایش سلیمان کوشیده -
دولت را خوف ها و بی مزگی ها ست در پهلو - و ترک و تجرید را امید و
طمانیت است در بغل - کار سوزن و زر بافت بر زمین ماتمی و تیره رنگ
خوش نما تر ازان افتد که بر پارچه شوخ رنگ کار کم نما کنند - ظاهر ست که
انچه بدیدن خوش نیاید بدل مرغوب نباشد - صفات انسانی مثل عود و مشک
ست که تا نسایند و نسوزند نبویند - همچنین ست که آسایش باعث ازدیاد عیوب
ست و عسرت سبب فروغ نکوئی - بیکن اینجا قلم در کشید - حالا قطعهٔ که حضرت

بشقاوت دارد ◊ و برای بودن محتسب سزاوار تر بود • سنجیده رضعی که مستقل المزاج است با زن خود بیشتر الفت کند • چنانکه در ترجمه بولتیستیز مسطور است که او پیر زن خود را بر حیات جاودانی مرجح میداشت ◊ زنان ذی عصمت در اکثر اوقات غرور و شوخیها بکار برند مگر ایشان بر عقب خود می نازند یا بنگاهداشت عصمت - مطیع و معقاد شوهر بودن بهترین صفت زنانست - اگر زوجه زوج خود را عقیل پندارد بستن صورت انقیاد آسانست و اگر بدظن داند کار بر اطاعت نه انجامد ◊ زن جوانان به شاهد و شیوخ به مصاحب و پیران به دایه ماند ◊ پس وجه معقول که دلالت بر زن خواستن کند آن باشد ◊

شخصیکه بدانائی و فهم اشتهار و اختصاص داشت در جواب یکی که سوالش متعلق به تزوج بود گفته ◊ قوله : شابی که زن نخواسته رتبه شیخوخت نیافته ◊ بارها به تجربه رسیده که بد مزاج شوی زن نیک سیرت دارد مگر نظر توجه همچنین شوهر که کمتر بر زنان خود اندازند پیش شان قدری و قیمتی گرانی دارد ◊ با همچنین زنان بر تجمل خود افتخار دارند • و بر سکوت ورزی بیشتر کوشند ◊ زنی که زوج درشت خوی بخلاف رای اقارب خود خواسته باشد بار بیشتر می آمیزد چه برتری دیگر ندارد که بد ان علاج سبکسری خود توان کرد ◊

لمولفه

اشهب کلک بیکن از میدان قرطاس عطف عنان نمود - و شبدیز خامه ام بر ساحت بیاض جلوه ریز جوانان معنی بحلهای عباسی بر رخش الفاظ در وسعت صفحه رونق بخش کاغذ و مداد - اگر جلوهٔ ایشان پسند طبع خوش طبعان افتد زهی وخهی ورنه :

گلفتی بود که آمد شد و رفت

دانستنیست که بفحوای خلق الانسان من ماء دافق یخرج من بین الصلب و الطرائب بوسیله خلقت آدم و تخمیر هوا آبادانی عالم و آشکارا کردن صور گونا گون که هنوز در کتم عدم محجوب است ، بود منظور صانع جز و کل است - و بان که کار بسهولت بر آید بمنشاء خلقنا کم ازواجاً هر فرد بجفت خویش تشریف خلقت پوشید - پس ابا نمودن از تزوج سلسلهٔ اتحاد را بر هم می کند - ازینجاست که پیغمبر ما صلعم میفرماید النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس

میتوان داشت از حدیقه اش که بوستانیست همیشه بهار اقتباس نموده درج میکنم خالی از مذاق نیست :

هر که از حب مال و جاه پرست ◊ رفت و بر مسند ابد نه نشست

بر تزوج و تجرد

کسی که عیال و اطفال دارد از ایشان یرغمالی پیش دولت میگذارد چه اینها مهمات عظیم را که بد باشد یا نیک سنگ راه هستند - الحق بهترین کارهائی اعیان که برای عوام کثیر النفع باشد از آنان صدور یافت که در تجرد زیست کردند یا اولاد نداشتند ◊ شکی نیست که همچنین کسان بیشتر تعلق به بنی نوع خویش دارند ◊ کسان ذی ولد خیلی فکر زمان آینده کنند ◊ چه ایشان دران عهد از اطفال خویش بهترین ودیعت گذارند ◊ آن یکی هست که با اینکه تنها زندگانی کند خیالاتش محدود بذات خودش باشد ◊ مگر چیزی را که وقوعش بزور مستقل امکان ندارد بخود متعلق نداند و آن یکی از افراط طمع و عدم وقوف بر لا ولدیت خود افتخار کند و جگر گوشگاں را سبب کمی دولت انگارد تا که در نظر مردم بیشتر دولتمند نماید ◊ مگر کلام این نهج آویزه گوشش شده باشد که فلان متمول است ◊ و دیگری که هست از افراط اولاد خرچ پوی دارد بدتر است ازان دیگری که زن و فرزند را صرف رقومات اخراجات پندارد ◊ با آزادگی بسر بردن متعارف ترین وجه من الوجوه تجرد است ◊ خصوصاً کسانی را که طالع شان علو خاصی دارد و مزاج شان بمقداری ذکی الحس افتد که پیچ کمر بند را هم سلسلهٔ پا شمارند ◊

آن که زن ندارد مولای مترحم خادم مستعد دوست مخلص بیشتر باشد ◊ مگر رعیت معتبر کمتر ◊ چه سبکبار است و زود قرار بر فرار نهد ◊ و پیوسته گریز پایان را حالت همین بوده است ◊ رهبانان را نباید که زن خواهند ◊ چه زمین دیگران از چشمهٔ فیض وجودگی نمی یابد وقتیکه سیرابی حوض خانهٔ خود عین پیش نظر است - تجرد و تجوز حکام مساویست ◊ اگر ایشان طبیعت بد دارند خدام شان از ازواج شان بدتر کارها کنند ◊ بیشتر افسران فوج را یافته ام که حین زجر و ملامت مرد سپاهی را عیال و اطفالش یاد میدهند ◊ و گمانم می برد که تنفراز تزوج که درمیان ترکان شیوع یافته کینه لشکری ایشانرا زیاده تر بیغیرت میسازد ◊ فی الواقع عیال و اطفال آدمی را ادیب هستند در باز داشتن از خصایل بد ◊ بدانکه او را نه زن است و نه فرزند خرچ کمتر دارد ◊ و فیاض بیشتر باشد ◊ مگر رحم طابیعش بکار نیاید ◊ خیلی میل

لمؤلفه

اینک تحریر بیکن بپایان رسید : چونکه او خود هم در سیاست مدن دست رسی کامل داشت تحریرش هم برای انتظام سلطنت و سر انجام کارهای مملکت بیشتر مفید است عموماً و تحریر هذا خصوصاً تعلق باصول حکمرانی دارد ◊ و قتیکه کار بجاه طلبان آویزد چندانکه ضرر و نفع حب جاه درینجا ثبت شده تعلق به سلطنت دارد : و انچه با مملکت دل مقصم است بقلم نیامده ◊ واضح و لایح است که اگر خواهش بهر حصول جاه بصفوا ماند در نشاندن از پا جملگی صفات انسانی را بصفراء زنجاریه که از قسم صفرای ردیه است مشابهت دارد زور بر انگیختن بر محسن کشی : کمر چست کردن بر مرگ پدر : حبس برادر : قتل فرزند - قیام نمودن پیش جاه طلبان آسان تر از حرف زدن باشد مگر ارتکاب چنین قبایح باعث برار کار شان گردد - از دیدن باستان نامها هویدا گشته که انجام جاه طلبی نیکو نیست - اگر چنین نبودی عاقبت کار بر سکندر و قیصر و نپولین تنگ نشدی - و دانستنی است که اینها با حلم جلیل الشان عالی همت والا منش بودند ای کاش حب جاه نداشتند اگر بر افزایش ملک و مال حریص نمی بودند با بیلن جای وفات سکندر نبردی بروتس دست خود از خون قیصر نیالودی و جزیرۂ سنت هلنا مدفن نپولین نشدی همینکه هوای جاه در سر متحرک گشت چشم عقل بر دوخته شد و ارتکاب ناکردنیها بنظر آسان آمدندی - قطعه شیخ نظامی گنجوی که یکی از ارکان اربعه شاعریست مناسبت تام باینمقام دارد بزبان خامه بعرض میرسد :

جهان چیست بگذر ز نیرنگ او ◊ رهائی بچنگ آر از چنگ او
یکایک ورقهای پارین درخت ◊ بزیر اوفتد چون وزد باد سخت
مقیمی نه بینی درین باغ کس ◊ تماشا کند هر یکی یک نفس
فلک در بلندی زمین در مغاک ◊ یکی طشت پر خون یکی پر ز خاک
نوشته درین زهر آلوده طشت ◊ ز خون سیاوش یکی سر گذشت
دمی گر بضاعت برون آورد ◊ همه خاک در زیر خون آورد
دو در دارد این باغ آراسته ◊ درو بند زین هر دو برخاسته
در آ از در باغ بنگر تمام ◊ ز دیگر در باغ بیرون خرام
همین است رسم این گذرگاه را ◊ که بندد باندیشه این راه را
یکی را در آرد بهنگامه تیز ◊ دگر را ز هنگامه گوید که خیز

اجتناب از اطناب کام نموده بر این یک شعر حکیم سنائی که در برابر دفتری

ضرر کمتر رسانند ◊ هوای افزایش رتبت در شریف خطرناک تر است ازانکه در رزیل - و در مردم خوش خلق و نیکنام ازانکه در درشت خو - و در شخص که در علو مرتبه ثباتي و قیامی و در کارها تجربه ها حاصل کرده باشد ازانکه در نوخیز ◊ گویند که بعضي از خواص خود را نسبت بدیگران مورد عنایت خسروانه گردانیدن نشان ضعف عقل بادشاه است - مگر دانستنیست که برای دفع ضرر اعیان جاه طلب تدبیری بهتر ازین نباشد : چه رقتیکه رضامندی ، تا رضامندی را ذریعه جز ندیم مقرب نیست تا ممکن که اختیار کسی از حد اعتدال تجاوز کند ◊ روشي دیگر برای ضبط هوا ، هوس جاه طلبان اینست که موازنه آنها با دیگران که متخلق باخلاق مذبوره باشند کرده شود مگر دریاصورت که درمیان هر دو واسطه باشند دیگران نیز ناگزیراند ◊ چه بغیر این بار گران کشتی نظم سلطنت خیلی ته و بالا گردد ◊ بالجمله شاهانرا باید که مردم رذیل را بپرورند که رخسار جاه طلبان را طپانچه باشد ◊ داشتن اینها در محل امید و بیم در صورت بودن شان پر خوف و هراس آسان بود - و اگر قوی دل و دلیر طبیعت افتند تدبیر خود را قبل از زوال خویش بکار برند و سلطنت را بخطر اندازند - اگر مهمات مملکت بر این تقاضا کند که نخل فروغ ایشان از بیخ بر کنده شود و بیخطر ایاصورت نه بندد طریق آن جز این نیست که گاهی انسان را مبذول عواطف ساخته باوج عزت برند و گاهی معاتب کرده در حضیض مذلت در آورند - تا ندانند که امروز چه زاید و فردا چه پدید آید : و همواره در ورطهٔ حیرت مانند ◊ دعوی پیش قدمی در امور سترگ قسمیست از حب جاه که مضرت کمتر دارد نسبت بان دیگری که در جمله کارها باشد - چه ازاں یکی بی انتظامی خیزد و کار را ماند - کسی که جاه طلبش در امضاء مهمات عظیم باشد کمتر خطر ناک است نسبت بکسی که توجهه او باملاک و تعلقات است - و آنکه در زمرهٔ ارکان دولت فروغ جوید کاری بزرگ در پیش دارد - و برای رفاه عام این مصلحت است - و آنکه در مجمع بیکاران سر بر آوردن خواهد سبب انحطاط مردم عهد خود گردد - وقار سه چیز دارد اول موقع نفع رسانی دوم قرب بادشاه و اعیان سوم کاسهٔ خود پر کردن از زر - آنکه طالب این مرتبه است و نیتش نیکو ترین این هر سه باشد مرد دیانت دار همانست - و پادشاهی که نیت مردم در یابد البته آن پادشاه است با دانش فراوان : پادشاهان را چنین وزیری بر گرفتن باید که در اطوار شان نمایش نه نماید و انجام امورات متعلق خویش بر ترقی منصب مرجح دارد - و هم ایشانرا لازم است که کسی که بر بجا آوری کار نازد ازان امتیاز کنند که منشاء و غایت مهمات سلطنت بیفتد -

لقیت رفیع القدر فی ذروة العلما
عشت عظیم الشان فی رتبة المجد
خدا بخش

حب جاه - بزبان پارسي

مترجمه از تحریر انگریزی لارڈ بیکن صاحب

حب جاه صفرا را ماند - و آن خلطست که اگر باز داشته نشود آدمی را پر از بشاشت و موصوف بچابکی و بجد و جهد میکند و اگر باز داشته شد مخرج طبیعی نیافت و کیفیت سمی درو پدید آمد - همچنان آنانکه حب جاه دارند اگر سبیل بحصول مرتبت یابند پیوسته در مدارج ترقیها کنند از ایشان خوف و خطر متصور نباشد - و اگر شبدیز آهوی انسانرا لگامی دهند آثار نارضامندی از سیمای شان پیدا شود : و اشخاص و اسباب را آنها بنظر بد بینند و از تنزل در امور بیشتر مسرور باشند - و اینست بد ترین خصایل در خدام شاهان و مملکت ◊ شاهان را باید که اگر جاه طلبان را بکاری تعین نمایند نظم کار بر نهجي دارند که ایشان در حصول مراتبت قدم بیشتر گذارند و پس پا نمانند : چون این نظم بی زحمت صورت نه بندد بهتر است که این قسم طبایع را دخل ندهند - چه عدم ترقی اینها در خدمات باعث تنزل خدمات خواهد شد • و چون عموماً ازین قسم مردم جاه طلب را مدخل دادن در امورات سلطنت مصلحت نیست بگویم که در کدام مواقع ضروری بکار آیند - افسران فوج هرچند حب جاه داشته باشند بخدمت افسری فوج شایانند : چه در برابر خدمات شان از دیگر صفات قطع نظر باید کرد : لشکری جاه ناطلب سواریست بی مهمیز - در امورات حسد انگیز و خطرناک جاه طلبان محافظ شاهان باشند - چه کسی دریں امر شریک نشود مگر شخصی که مثل فاخت بر دوخته چشم باشد که چپ و راست نه بیند و بالا تر همی پرد • آنانکه حب جاه دارند بهر بر انداختن کسی که در مملکت سر بر افراخته باشد هم بکار آیند - چنانکه تایبریس که قیصر سوم است تا اینکه سجنیس را از پا در آورد ماکرو را برابرش بر آورد ◊ چون معین کردن مردم جاه طلب در بعضی کارها چنانکه گفته شد ناگزیر است بگویم که چه طور بندی بر پای شان گذارند که ایشان

works. It involved immense labour, and my father was justly proud of his performance. Owing to a variety of causes, the foremost of them being his departure to **Hyderabad Deccan**, he was unable to complete it.

I propose, here, to offer to the reader some specimens of my father's Persian composition. First I select the letters which passed between Professor Browne and my father on the occasion of the former sending to the Library Volume I of the Literary History of Persia, and secondly a specimen of my father's Persian translation of Lord Bacon's Essays, which shows at once his command both over English and Persian :

لنا ندماء ما نمل حديثهم ◊ اميئون مامونون غيباً و مشهدا

حسب اشارهٔ عاليجناب معارف ماب مكارم انتساب خان بهادر مولوي خدا بخش خان صاحب مير مجلس عدالت عاليهٔ حيدر آباد دكن ادام الله بقاءه الشريف و اعلي الله مقامه المنيف از طرف مؤلف بطريق ارمغان و يادگار فرستاده شد •

۳ شعبان سنه ۱۳۲۰

همي شرم دارم كه پاي ملخ را ◊ سوي بارگاه سليمان فرستم

همی ترسم از ريش خند رياحين ◊ كه خار مغيلان به بستان فرستم

EDWARD G. BROWNE,

November, 6th, 1902. *Pembroke College, Cambridge.*

المنة لله كه امروز سحر گاه

مكتوب تو آورد صبا سلمه الله

باد كرسي پايهٔ از مسند عالی تو ◊ عرشيانرا آستانت مجلس تعليم گاه

نازم برخود كه جناب شما اين از نظر دور افتاده را باين الطاف و شفقت ياد فرمودند بر خود باليدم و چه نازشها نبود كه بر علو قسمت خود نكردم ارمغانيكه فرستادند تحفه ايست بقول سعدي :

نه قنديكه مردم بصورت خورند ◊ كه ارباب معني بكاغذ برند

هديهٔ جناب شما چنانست كه از عهدهٔ شكرش اين هيچميرز كم مع زبان كي بيرون آيد از اينكه سطور چند كه از دست خاص خود بر صفحهٔ اول كتاب تاريخ ادب فارسي زبان كه دران داد سخنوری داده اند بقلم معجز رقم نوشته اند كتاب را زينت و كتابخانه را رونق بخشيدند شكريهٔ اين عنايت بيغايت نه از طرف اين هيچمدانست بلكه از جميع افراد انجمن انتظاميهٔ كتابخانه پيشكش خدمت است قبول فرمايند •

friendship was marked with true love and devotion to each other, and was tested by every possible variation of good and evil fortune. Animated by one common desire—the social, moral and intellectual amelioration of their co-religionists—they worked together with perfect harmony and earnest zeal, and achieved substantial results. **Kazi Reza** and **Moulvi Mohamed Hassan** were constant visitors at our house, and twice a week, at least, did I see thəm. I can recall the zeal, the earnestness, the enthusiasm with which they discussed questions affecting the interest of the Mohamedans. Not to speak of a number of Muslim students, whom they educated at their own expense, they successfully combated that unreasoning and unreasonable Orthodoxy which regarded with distrust and suspicion the spread of English education. It was they who first lighted the lamp of learning in Behar, and though it still burns but dimly there, yet in process of time, we doubt not, it will shine with its wonted brilliance.

In spite of a very large and extensive practice my father never neglected his stutdies. Immediately on returning from court he dined, and after resting for an hour or so he would retire to his Library, which, in earlier days, was in our dwelling-house. There he would generally be either reading or writing notes on books, or conversing with visitors on subjects religious and historical. On no account would he see clients after sunset, or attend to professional work. Surrounded by his books he was for those few hours, absolutely happy and cheerful. In that Eden of bliss there was no room for the cold, calculating cares of life, or the disquieting anxieties of the lengthening chain of existence. His love of letters and learning enabled him to find in the pursuit of knowledge a relief from anxiety and a solace under disappointments. **Hafiz** and **Mowlana Rum** were his inseparable companions, and he read them every day with almost religious regularity. He was a better **Persian** than **Arabic** scholar, though his knowledge of **Arabic** was by no means contemptible. He was perfectly at home with the whole range of Persian literature, and stupendous and encyclopaedic was his memory. He could recite Arabic and Persian poetry for hours, and what is so rare in India, he could write **Persian** with almost the ease and elegance of a native. There are passages in his **Mahbub-ul-Albab** which would be accepted by competent critics as the high-water mark of Persian prose. **Mahbub-ul**-Albab is a descriptive catalogue of the **Arabic** and **Persian** MSS. in his Library. It extends over 500 pages, and gives the lines of the authors with an exhaustive critical analysis of their

My father, though thoroughly aristocratic in his ways and habits, always deplored and deprecated the tendency of his countrymen to invent a pedigree or claim fanciful descent. He regarded such a tendency as the surest sign of national decadence and demoralization, and the last refuge of the unworthy and the incompetent. In this connection he often used to quote the famous lines of **Amir-ibn Tufail**, one of the noblest of the **Quraish** :—

و انی و ان کنت ابن سید عامر ◊ و فارسها المشہور فی کل موکب

فما سودتنی عامر عن وراثة ◊ ابی اللہ ان اسمو بام و لا اب

و لکننی احمی حماها و اتقی ◊ اذا ها و ارمی من رماها بمنکب

Kazi Reza Hussain, **Moulvi Mohamed Hassan**, and my father, constitute a noble trio. They were true friends, and their

---

از اولاد مولانا قطب شیخ محمد عیوض صاحب و از اولاد مولانا محمود صاحب شیخ قبول محمد بوجود آمد - شیخ قبول محمد صاحب یک دختر باسم بی بی حبیبه و یک پسر نام فتح محمد و دختر که بود منسوب شیخ محمد عیوض شد - ازان دختر تولد شد باسم بی بی حلیمه والدہ ماجدۂ کمترین و شیخ فتح محمد را پسری بنام شیخ مخدوم بخش که ایشان منسوب به همشیرۂ میر الہی بخش صاحب ساکن رتن پورہ شدند - ازان شیخ مولا بخش صاحب برادر عموی موجود اند که شادی شان از دختر شیخ قطب بخش موضع شاہ نواز پور شد و شیخ محمد عیوض را همشیرۂ حقیقی بی بی باصرہ بود که بموضع حسن پورہ منسوب شدند- از نبیرگان شان سید بہادر علی و سید عنایت حسین و تجمل حسین صاحب و شیخ بخشش حسین صاحب و دیگر صاحبان ساکنان جگ مران و حسن پورہ هستند - از ملا بہتو صاحب شیخ ولی‌الله پسر بوجود آمدند و شادی شان بموضع کوہٹا از دختر شیخ شمس‌الدین صاحب که یکی از اولاد قاضی عبدالرحمان قدوہ بودند گردید - و شادی کمترین از دختر شیخ ولی الله صاحب مرحوم مغفور است و از بی بی باصرہ چہار دختر است یکی بی بی پترا زوجۂ شیخ پیر بخش ساکن مبارکپور مادر مولوی علی احمد صاحب و حسین بخش - و مسماۃ خیرن زوجۂ سید پیر علی ساکن جگ موان فقط و دیگری بی بی امنان عرف بی بی کرما زوجۂ سید فتح علی عرف میر گہانسی ساکن موضع جگ حیران پرگنه بار - از بطن شان سید بہادر علی مرحوم و سید عنایت حسین - سیومی بی بی نعیما زوجۂ مولوی غلام اشرف ساکن حسن پورہ از بطن شان منشی بخشش حسین پسر و چہار دختران یکی مسماۃ بی بی بہیکن زوجۂ شیخ علی جان ساکن موضع شیخپورہ دیگری بی بی نترو زوجۂ مولوی علی احمد صاحب سیومی بی بی صبیرن زوجۂ سید عنایت حسین و چہارمی دختر بی بی باصرہ مسماۃ سکینه بودند لاولد فوت کردند •

namely to found a public library, was an accomplished fact. My grandfather's favourite couplet was :—

زندہ ست کسی کہ در تبارش ◊ ماند خلفے بیادگارش

and time has amply justified its application to his case. My father not only maintained the family reputation but secured for it an honourable place in the literary history of India.

III

So far I have said nothing regarding our family history. A few words will suffice. Unlike most of our countrymen, we do not trace our descent either from the Prophet of Arabia or from some great hero of Islam, or from some spoliating despot of a by-gone age. Nor do we need such meretricious trappings. The Province of **Behar** (I may be permitted to say without vanity) can scarcely point to another Mohamedan family which can count three generations of learned men. I mean men who enjoy not merely local but Indian, if not European, fame. Traditition traces our descent from **Kazi Hibatullah**, one of the compilers of the **Fatawa-i-Alamgiri**, but I am not prepared to treat this seriously. There is, so for as I can see, no sufficient date for the establishment of any such claim, and I must therefore reject it as unproven, if not as a pure fiction.[2]

---

2. In my grandfather's *Bayadh*, written in a fine *Shikasta Amiz Nastaliq*, I find an account of our family. MS. Bankipore Library. Besides the passage in the Bayadh I have no other authority, so far, which connects our family with Kazi Hibatullah, one of the compilers of the Fatawa-i-Alamgiri, and curiously enough the passage under discussion does not throw any light as to who Kazi Hibatullah, our ancestor, was. This much is clear, that our family originally came from Delhi, settled down at Chapra, and eventually removed to Bankipore. It is also clear that from the earliest times the members of our family have been, more or less, noted for learning, and as such were men of position and infiuence. My father never set much value on unauthenticated traditions, and believed more in personal distinction and individual merit than in proud pedigrees or fanciful descent. The passage in the Bayadh runs thus:—

نسب نامۂ بندۂ محمد بخش خان این ست کہ بندہ ولد جناب علی بخش مرحوم
ابن شیخ رمضان علی ابن شیخ محمد باقر ابن قاضی شیخ هبت الله مرحوم مغفور صدیقی
نسباً و دهلی وطناً - از دهلی آمدہ اولاً بمقام ارکهی ضلع سارن مقیم شدند - شادی دختر شان
بی بی جنگلی از ملا بهتو صاحب کہ از اولاد مولانا مجدالدین ساکن دربهنگہ ضلع ترهت
بودند شد - و شادی جد مرحوم از دختر برادر خرد موسومہ بی بی عاصمہ نمودند و شادی
جناب علی بخش مرحوم از بی بی حلیمہ بنت شیخ محمد عیوض صاحب ساکن قصبہ مانجهی
ضلع سارن - و حال نسب شان اینست کہ مولانا قطب و مولانا محمود فاروقی دو برادر بودند -

unhappy days, however, were to end, and they did end with his enrolment at the Patna Bar in 1868. There was a sudden change of fortune, and his progress in the profession was rapid and assured. Within a couple of years he was perfectly well-established, and commanded almost the largest civil practice in Patna. Nor was this unexpected; he inherited to the fullest extent not only his father's passion for books but also his talents.

He obtained a certificate of honour for his work on the School Committe in 1877, and when local self-governing bodies were created by Lord Ripon he was appointed the first Vice-Chairman of the Patna Municipality and of the Patna District Board. Almost all the qualities of a successful advocate he possessed, and possessed in a remarkable degree. He had keen intelligence, ready wit, a remarkable memory, a wonderful grasp of facts, and a rare power of advocacy. While ever avoiding friction witht he court he nevertheless always stood up for his rights.

On the civil side he was reckoned almost without a peer, but he always had a horror of criminal practice, and never seriously took to it. In 1880 he was appointed Government Pleader of Patna, and in 1881, for public sevices, he was made a Khan Bahadur. In 1891 he founded the Oriental Public Library, of which we shall here more in the sequel, and in 1895 he was appointed Chief Justice of the Nizam's High Court for a term of three years. In 1898, on his return from Hyderabad he reverted to the Bar, but a stroke of paralysis, which he had that year, so completely shattered his nerves that he never felt himself again. He recovered, but his health began to decline, and he grew weaker and weaker. His demise would perhaps have come much earlier than it actually did had it not been for the anxious care and tender solicitude of my brother **Shahabuddin** and his wife. They were always with him and took the greatest care of his health. In 1903 the title of C. I. E. was conferred on him, and the Government of India was pleased to appoint him Secretary of the Library on a salary of Rs. 200, and to make him a grant of Rs. 8,000 in liquidation of his debts.

For the last fifteen months his health was fast giving way. He was growing feebler and feebler, and he had to cease from attending court; but he could not be idle, and during this period he spent most of his time in the Library, reading books and writing articles.

As early as 1874, as Mr. Macdonell's letter shows, my father's reputation was made. But seventeen years had yet to elapse before my grand-father's wish, expressed on his death-bed to his son,

II

My father was born at Chapra on the 2nd of August, 1842. Soon after his birth the family removed to Bankipore, where my father was brought up under the direct supervision of my grandfather, a distinguished pleader, a man of letters, and a passionate lover of books. In 1854 Mr. Travers, the then District Judge of Patna induced my grandfather to send his son to the Patna High School where he studied till 1859. Owing to the disturbances and commotions consequent upon the Mutiny, the Patna High School was that year abolished, and my father had to wend his way to Calcutta, which was not then, as it is now, the City of Palaces, the centre of fashion and the headquarters of commerce.

In those days there was no direct railway communication between Calcutta and Patna, and the journey was, as might be expected, at once costly and perilous. With wallet and staff, the young student nevertheless undertook the pilgrimage in quest of learning. At Calcutta he was placed under the charge of **Nawab Amir Ali Khan** who treated him with the utmost kindness and consideration. In 1861 he passed the Entrance Examination of the Calcutta University, but his stay in Calcutta had to be cut short as the climate never agreed with him, and he returned to **Bankipore**. On his return he joined the Law Class with a view to qualifying as a pleader. Between 1861--1868, when my father was admitted to the Patna Bar, he passed through great hardships and sore trials. My grandfather's health began to fail, and as time went by, he found it more and more difficult to attend to professional work—the only support and maintenance of the family. The whole burden fell on my father, and it was with the greatest difficulty that he managed to keep the family together. In spite of accumulating woes and miseries he attended Law Classes and at the same time earned a small income. It was during this period that he applied for the post of Naib under a Munsiff, but, as fate would have it, his application was refused. He, however, obtained the post of **Peshkar** to the District Judge, but he and Mr. Latour, the Judge, could not agree, and he had to throw up his post. The next appointment that he held was that of a Deputy Inspector of Schools, but this was also for only a period of fifteen months. Misfortunes and disappointments, instead of depressing his spirits, only stirred him into fresh activity, and he determined to fight the battle of life. It was always with emotion that he referred lo the sad experiences of those times—the mental anguish, the bitter privations, the terrible sufferings through which he had passed. These

exhibited an active courage, a resolute endurance, a cheerful self-restraint, and an exulting self-sacrifice. He ignored the claims of his family for the higher and nobler claims of his community, and I can suggest no better and more fitting epitaph for his grave than the following words of a great French philosopher: "I loved my family more than myself, my country more than my family, and humanity more than my country" (I quote from memory). His whole life was but a commentary on these words. It was neither weight of purse nor length of pedigree which brought him to the forefront, but his own inherent qualities and intrinsic merits, his single-minded devotion to learning, and his overmastering passion for books.

The most charming feature of his life was his central trust in God. He never allowed himself to be anxious for the morrow, or to suffer the well-known text of the Qur'an و على الله فليتوكل المومنون, to fade from his mind. To the last he believed that in purity of heart rather than in outward cleansing, and in spirit rather than in the letter, lay the real strength of religious beliefs.

"When the end comes," wrote John Stuart Mill, to a friend in pensive vein[1], "the whole life will appear but as a day, and the only question of any moment to us then will be : Has that day been wasted ? Wasted it has not been by those who have been, for however short a time, a source of happiness and moral good even to the narrowest circle. But there is only one plain rule of life eternally binding, and independent of all variations of creed, embracing equally the greatest moralities and the smallest; it is this : "Try thyself unweariedly till thou findest the highest thing thou art capable of doing, faculties and circumstances being both duly considered, and then do it." Be this our standard now, and let the reader pronounce his own judgment. In the Oriental Public Library at Bankipore, where under one roof are collected, as though in a shrine, the literary remains of the great savants of Islam, he has built for himself a monument which will last so long at least as the destiny of India is linked with that of Great Britain, if, perchance, no longer. There, in course of time, as the mists of ignorance lift, will rise a school of Oriental learning; and thence will radiate beams of culture which will illumine the whole of the Indian Peninsula. The claims of the founder of the Oriental Library on the gratitude of the Muslims, nay, of the entire literary world, nothing but jealousy can overlook or disparage. I now proceed to details.

1. Lord Morley, "Miscellanies," 4th series, p. 151.

subjects to be dealt with by others more competent than myself to weigh, to test, to focus, to adjust; but the outer world, after all, never secures more than a partial glimpse of a man's life. It can never, unassisted, hope to know the man in his true inwardness—his varied relations with his friends, relatives and dependants. Nor is that world expected, to have an idea of the subtle influences which a man of commanding intellect and powerful will exercises over his immediate and more private entourage, the secret springs of his actions and deeds, his tone and temper, his religious beliefs, his unexpressed political views, a thousand little kindnesses secretly done, and good offices privately performed. But these are just the things which reveal the true nature of the man and the nobility of his soul. Moreover, the public sees only the ultimate result of a life's labour. It knows not the slow and painful steps through which that result was achieved, the innumerable obstacles that lay in the path of success, the strange reverses of fortune, and the strength of will and purpose, dauntless courage and unflinching pertinacity needed finally to conquer and triumph. In other words the public sees only the last act in a series of failures, otherwise known as success; but it is the intermediary stages which are alike interesting and instructive, and a lesson and an example to others. A life of the donor of the Bankipore Library, written even by me, would scarcely fail to bring out those qualities of the mind and the heart which made him the idol of his friends and one of the most interesting figures of his time. Fraud and imposture can never long continue to impose upon the credulity of mankind. It is the sterling qualities of the mind and the heart alone which win for a man a place in the annals of his community, or the history of his nation. "Call no man happy until he is dead" is as true of my father as of any other mortal. His life's voyage, like that of others, was not, and as things are, could not be all prosperous. He had his moments of deep despondency and blank despair. He had his share of sorrows and griefs, bitter disappointments, and sad vicissitudes. In the following pages I shall recount the story of that life which, in early manhood, was overcast with heavy unmoving banks of cloud impervious to any ray of sunlight, but which was destined to end in peace, serenity and honour. Among the heralds and pioneers of Muslim learning in India, history, I doubt not, will assign him a place next to **Sir Syed Ahmad** and **Mohsin-ul-Mulk**. Like **Sir Syed** he devoted himself to the cause of the Mohamedans, and like him, too, he spent his fortune for their benefit and advancement. Throughout life he

My Father : His Life and Reminiscences

By SALAHUDDIN KHUDA BUKHSH

باين رواق زبرجد نوشته اند بزر
که جز نکوئی اهل کرم نخواهد ماند

"The most precious and intimate recollection of each man's memory is his series of recollected portraits and biographies of persons he has individually known. A peculiar sacredness attaches to these recollections of persons when they themselves are dead . . . . Every living man or woman can reckon up those select of the dead who are most memorable to him or to her ; and sometimes there may be a duty, or at least an impulse, that one should speak to others of the dead whom *he* remembers, and of whom *they* know little or nothing."—PROF. MASSON.

I

In writing this short sketch of my father's life I have been actuated neither by vanity nor self-glorification, but simply by that sense of duty which I owe to him and to those numerous friends of his who have been good enough to ask me to give them a brief account of his earthly pilgrimage. It is always a delicate and difficult task to write the life of a contemporary; much more so is it for a son to attempt the biography of his father. The tenderest ties of filial duty and devotion necessarily render him unfit for such a task. We can scarcely hope to find in him the severe impartiality of a historian, or the equally unbiassed mentality of a judge. I must, therefore, at once, inform my readers that, though I lay claim neither to the impartiality of a historian, nor to the impersonal attitude of a judge, still, in these pages, I have endeavoured to give a true and faithful account of the career which has so recently yet all too soon ended. I have abstained alike from extravagant laudation and captious criticism. I have merely placed the facts before the reader, and have left him to draw his own conclusions. My father's public services, his rank and position in the profession to which he belonged, his literary works, and the history of the Oriental Public Library at Bankipore, are too well known to require my interposition or to call for my assistance; and I might easily have left these

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

No. 1

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
Patna